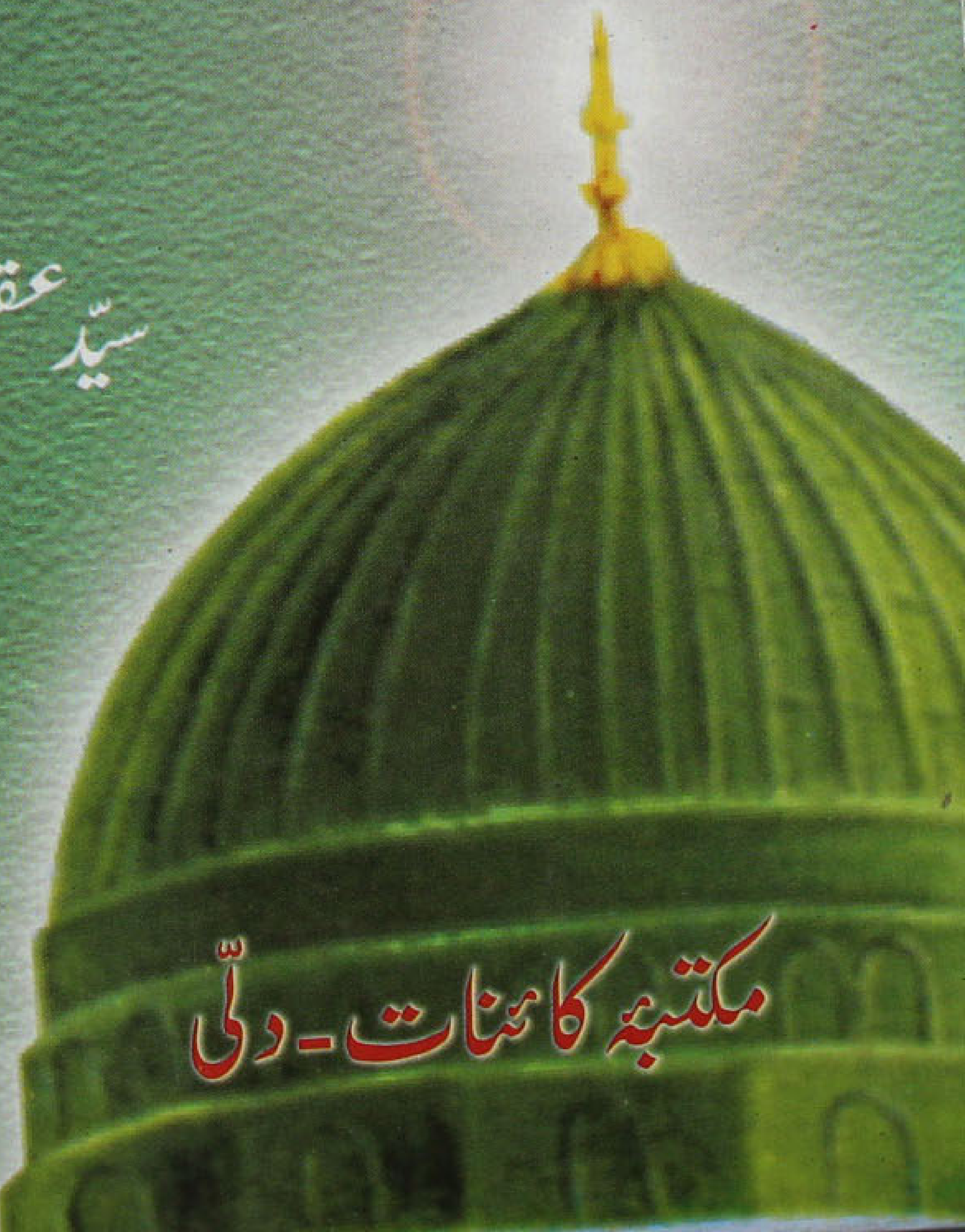
چراغِ راہ

شرح دعائے افتتاح

جلد اوّل

سیّد عقیل الغروی



مکتبہ کائنات۔ دلّی

چراغِ راہ

شرح دعائے افتتاح

علامہ سید عقیل الغروی مدّ ظلّہ

مکتبۂ کائنات - دلّی

بنام نور کائنات

© مکتبہ کائنات۔ دلّی

نام کتاب : چراغِ راہ (شرح دعائے افتتاح)

تالیف : حجۃ الاسلام علامہ سید عقیل الغروی

سرورق : سید سعود (دلّی)

تصویر : سعید آغا (بوسٹن۔ امریکہ)

ناظمِ اشاعت : ڈاکٹر ایم۔ آر۔ قاسمی (علیگ)

کمپوزنگ : فیضان احمد ندوی (الہ کمپیوٹر سینٹر۔ دلّی)

تاریخ : ۳ر شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ (ستمبر ۲۰۰۴ء)

طباعت : ایرانین آرٹ پرنٹرس گلی قاسم جان دہلی

قیمت : دو سو روپے (Rs. 200)

یہ کتاب جناب سید رضوان کاظمی اور جناب سید امیر عباس زیدی صاحبان کے گرانقدر مالی تعاون سے شایع ہورہی ہے مکتبۂ کائنات دونوں حضرات کا تہہ دل سے شکرگزار ہے!
اس کتاب سے ہونے والی آمدنی سفینہ جرنیل ہاسپٹل اینڈ ریسرچ سینٹر پر صرف کی جائے گی!

ناشر

مکتبۂ کائنات : 41-40، امام باڑہ لین، رشید مارکیٹ ایکسٹنشن، دلّی۔ ۵۱

فون / فیکس: 22057745

شاخ دفتر : S-9/2، سینڈ روڈ، جوگابائی ایکسٹنشن، جامعہ نگر، دلّی۔ 25

فون: 26980120

مراکز اشاعت

Iternational Islamic Link,
Babul Murad 858, Harrow Road, Sudbury Wembley
London-HAO2PX, England U.K.
Ph: 0044-208908l525, Fax: 0044-2089080055

دفتر حوزہ علمیہ جامعۃ المتقین طوار امین، بلاک ۳۰، قم مقدسہ، ایران
فون: 0098-251293448

☆☆

عرضِ ناشر

اللہ ہی کے سہارے جس کا فیض عام اور عنایتیں خاص ہیں!

مکتبۂ کائنات

کا

تصنیفی

تالیفی

اور اشاعتی منصوبہ

نظریاتی اعتبار سے

سخنِ حق

اور حقِ سخن

کا پابند ہے!

ادارہ

فہرست

حرفِ تعریف یا الف ولامِ کتاب

رشحۂ قلم حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید ذوالقدر رضوی مدظلہ العالی

اللہ ہی کے سہارے، جس کا فیض عام اور عنایتیں خاص ہیں!

ادب الدعاء انسانی سرمایۂ ادب کا وہ ادب العالیہ ہے جو دینی شعور اور مذہبی ادراکات کے بہترین متن اور بیان پر مشتمل ہے۔ اردو زبان میں اس کی ترجمانی اور تشریح وتفسیر کا کام ابھی ابتدائی مراحل میں بھی داخل نہیں ہوا ہے۔ جس کے اسباب پر یہاں بحث کرنے کا موقع نہیں ہے۔ تاہم اتنا کہے بغیر آگے نہیں بڑھا جاسکتا کہ اردو زبان جس معاشرے میں پروان چڑھی ہے اس میں دینیاتی مباحث کی سطح کچھ ایسی ہی رہی ہے کہ بلند تر سطح کے عرفانی مباحث پروان نہیں چڑھ سکے۔ عام طور پر لوگوں میں دعا کی حقیقت کا شعور تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک سے زیادہ نہیں ہے، جبکہ حقیقت دعا کچھ اور ہی ہے۔

مقامِ شکر ہے کہ برادرِ عزیز علامۂ وحید سید عقیل الغروی سلمہ اللہ تعالیٰ کے قلم سے ''تجلیات'' شرح دعائے سمات کے بعد، جس کا اختصار ایجاز کے اعتراض سے نہیں بچ سکتا، اب یہ قدرے مفصل شرحِ دعائے افتتاح سامنے آرہی ہے، اس تصنیف کی نوعیت تجلیات سے بہت مختلف ہے۔

کہنے کو تو یہ ایک دعا کی شرح ہے۔ لیکن دعا کے فقروں کی ترجمانی کے ضمن میں جتنے عناوینِ بحث اور جس قدر مطالب کو شارح نے سمیٹ لیا ہے اس کے دیکھنے سے شارح اور کتاب دونوں کی جامعیت اور کمال پر استعجاب اور مسرت کے ساتھ ہم ربِّ اکبر کا شکر ادا کرتے ہیں کہ بحمد اللہ اردو میں بھی کوئی ایسی کتاب سامنے آگئی جس میں عرفانی مباحث کی سطح اس بلندی پر نظر آتی ہے کہ شاید و باید! یہ کتاب اصول وفلسفۂ دین اور تاریخ دین سے متعلق اُمّہاتِ مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ بیشتر مباحث اور مسائل میں فلسفہ، کلام اور عرفان تینوں زاویہ ہائے نظر سے گفتگو کی گئی

کی زبان میں صفاتِ ثبوتیہ کو صفاتِ جمالیہ اور صفات سلبیہ کو صفات جلالیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور عرفانی شاعری کی زبان تو اللہ کی پناہ!

غالبؔ کے اسی شعر سے اندازہ کر لیجیے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ہاتفؔ کے یہ اشعار بھی آپ کے کانوں میں پڑے ہوں گے:

ہاتفؔ اربابِ معرفت کہ گہی
مست خوانندشان و گہہ ہشیار
از دف و چنگ و مطرب و ساقی
ازمی و جام و ساقی و زُنّار
قصد ایشاں نہفتہ اسراریست
گہ بہ ایما کنند گاہ اظہار

مشہور شاعرِ حکمت وعرفان شیخ محمود شبستری نے ''گلشن راز'' میں بصورت سوال وجواب عرفا کے تعبیرات کی وضاحت ان ابیات میں فرمائی ہے:

چہ خواہد مردِ معنی زاں عبارت
کہ دارد سوے چشم و لب اشارت
چہ جوید از رُخ و زلف و خط و خال
کسی کاندر مقامات است واحوال

ہرآن چیزی کہ در عالم نہان است
چو عکسی زآفتاب آن جہان است
جہاں چوں خط و خال و زلف و ابروست
کہ ہر چیزی بہ جائے خویش نیکوست
تجلی گہ جمال و گہ جلال است
رخ و زلف آں معانی را مثال است
صفاتِ حق تعالیٰ لطف و قہراست
رخ و زلفِ بتاں را زان دو بہر است
چو محسوس آمد ایں الفاظ مسموع
نخست از بہر مسموع است موضوع
ندارد عالِم معنی نہایت
کجا بیند مر اورا چشمِ غایت
معانی ہرگز اندر حرف ناید
کہ بحر بی کراں در ظرف ناید
ہرآن معنی کہ شد از ذوق پیدا
کجا تعبیر لفظی باید اورا
چوں اہلِ دل کند تفسیر معنی
بہ مانندی کند تعبیرِ معنی

☆☆☆

عرفاء کی زبانِ اظہار و بیان کے بارے میں شیخ شبستری کا بیان اپنی جگہ پر، اردو کے سعدی ہمارے مولانا الطاف حسین حالؔی نے بھی اپنے انداز میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ آخر عرفاء کو ایسی تعبیریں اختیار کرنے کی کہ مثلاً ''وحدتِ ذات مطلقہ'' کو ''خال''- اجسام سے تعلقِ ارواح کے ظہور کو ''خط''- فیاضِ مطلق کو ''ساقی'' اولیا اور عرفاء کو ''رند'' عالمِ صفات کو ''زلف'' وغیرہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ حالؔی نے کہا ہے

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی!

بہر حال انسانی فہم وادراک کی نارسائی اور پھر اقرار و بیان کی عاجزی اور فی الجملہ تعبیرات کی کوتاہیاں بہت سوں کے لیے ذات وصفات کے بارے میں گوناں گوں تشکیکات کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔ سوچنے والے طرح طرح کے مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں اور مہلکوں میں مبتلا۔ اردو کے ایک فکرمند شاعر جمیل مظہری کے یہ شعر مجھے اکثر یاد آتے ہیں۔ ١٠٢

صفات بخشے مکان بخشے جگہ جگہ اک حرم بنایا
ہماری صورت گری نے آخر خدا کو بھی اک صنم بنایا
حرم کو بھی بتکدہ سمجھنا ہے دوسری منزل ارتقا کی
وہ پہلا زینہ شعور کا تھا کہ بت کدے کو حرم بنایا

یہی وہ شاعر ہے جس نے ایک موقع پر یہ بھی کہا ہے کہ:

پرکھ چکا ہے تجھے بارہا شعور مرا
مذاق اڑا نہ بہت اے حجابِ نور مرا

تاہم یہ ذات وصفات کی بحث ہے بہت نازک، بے حد لطیف ساتھ ہی بے حد شیریں:

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

معرفتِ ذات وصفات کے باب میں انسانی تعبیروں کی نارسائی مسلم ہے۔ اسی لیے سب سے بہتر صورت یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ آیات قرآنی پر، خطیب قرآں حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات پر اور ائمۂ دین، اولیائے معصومین علیہم السلام کے فرمودات پر تکیہ کیا جائے۔ اسی کا اہم حصہ یہ دعائیں بھی ہیں۔ معصومین علیہم السلام سے منقول دعاؤں کے کلمات ذات وصفات کے بارے میں بہترین اور کامل ترین تعبیریں مہیا کرتے ہیں۔ جن کی لفظی و معنوی تلاوت سے ہر طالب کو جلوۂ شاہدِ مطلوب میسر آسکتا ہے۔ اس باب میں ایک اور موثر ترین اور موثق ترین وسیلہ خود اسمائے باری تعالیٰ عز اسمہ وجل شانہ کے معانی میں غور وخوض بھی ہے۔ کہ یہ اسماء بہترین وسیلۂ معرفت بھی ہیں اور ذریعۂ تقریب بھی! بہت ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد اس معنی کی طرف بھی ناظر ہو کہ:

''ان للہ تبارک و تعالیٰ تسعة و تسعین اسما... من

احصاها دخل الجنة"

"اللہ تبارک وتعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جس نے ان کا احصا کرلیا وہ جنت میں داخل ہوگیا"۔

کیا بعید ہے کہ یہاں "جنت" (الجنۃ) کا اطلاق بر سبیل استعارہ "جنتِ ذات و بہشتِ صفات" ہی پر کیا گیا ہو۔

"جنتِ ذات"! کہ ﴿فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی﴾ جس کا دعوت نامۂ ربانی قرآن مجید کے اہم ترین پیغامات اور مقاصد میں شامل ہے!

☆☆☆☆☆

(۵)

جلالِ توحید (۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَا مُضَادَّ لَهُ فِي مُلْكِهِ وَ لَا مُنَازِعَ لَهُ فِي أَمْرِهِ!

ساری تعریف اسی معبود کے لیے ہے نہ جس کی پادشاہی میں کوئی اس کی مخالفت کرنے والا ہے اور نہ اس کے نظام میں کوئی اس سے جھگڑنے والا ہے!

اس جملے میں آنے والے ''مُضادّ'' اور ''مُنازِع'' کے الفاظ اگرچہ اردو میں استعمال نہیں ہوتے پھر بھی ان کے مادّوں سے مشتق الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ ضِد، تضاد، نزاع اور مُنازعت (بمعنی جھگڑا، تکرار، قضیہ، مقدمہ وغیرہ) ہماری زبان میں موجود ہیں۔ اِن مثالوں کے بعد آپ کو مُضاد اور منازع بہت اجنبی نہیں لگیں گے۔ مضادّ، ضدّ (مضاعف) سے ثلاثی مزید کے باب مفاعلہ (فاعل یُفاعل، ضادّ یضادُّ) سے اسم فاعل ہے۔ جو ظاہری شکل میں فاعل اور مفعول دونوں معلوم ہوتا ہے، مضادّ (مضادِد) فاعل ہے۔ مضادّ (مضادَد) مفعول ہے۔

مُنازِع - بھی اسی باب مفاعلہ سے ہے، البتہ اس کا مادّہ (ن ز ع) صحیح و سالم ہے (مضاعف نہیں ہے)۔

اِس لفظی ادھیڑبن سے نکل کر منطوق اور مفہوم پر غور کیجیے۔

یہ فقرہ ''توحیدِ تنزیہی'' کے اعتراف و بیان میں ہے۔ توحید تنزیہی کے بھی مختلف جہات ,ور مراتب ہیں۔ ذات میں تنزیہہ، صفات میں تنزیہہ، افعال میں تنزیہہ۔

زیادہ سلیس اور سادہ زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ توحید تنزیہی کے مباحث ''صفاتِ سلبیہ'' کے بیان سے تعلق رکھتے ہیں۔ صفاتِ سلبیہ جنہیں علمِ عرفانِ نظری یا علمِ تصوفِ اسلامی میں صفاتِ جلالیہ کہتے ہیں۔ میری نظر میں تو اِن تمام مَبَاحث کا بہترین اور مختصرترین عرفانی بیان مَولیٰ الموحّدین امیر المؤمنین علیہ السلام سے منقول دعائے صباح کا یہ چھوٹا سا فقرہ ہے:

''یَامَنْ تَنَزَّهَ عَنْ مُجَانَسَةِ مَخْلُوْقَاتِهِ''

غالب نے اپنے فارسی منظوم ترجمے میں اس فقرے کا ترجمہ ایک مصرع میں کیا ہے

ع گشت از ہم جنسیِ عالم بَری

پورا شعر یہ ہے

ای کہ ذاتش را بذاتش رہبری
گشت از ہم جنسیِ عالم بَری

جو دعائے صباح کے اس پورے فقرے کا ترجمہ ہے:

"یَامَنْ دَلَّ عَلٰی ذَاتِہٖ بِذَاتِہٖ وَتَنَزَّہَ عَنْ مُجَانَسَۃِ مَخْلُوْقَاتِہٖ"

جو لوگ عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا مذاق رکھتے ہیں انہیں شعرِ غالب کی مغلوبیت پر انگشت بدنداں ہونے کا پورا حق ہے۔ کہاں وہ عربی کی عبارت اور اس کا ظاہری اور باطنی، لفظی اور معنوی جمال و جلال اور کہاں یہ فارسی ترجمہ تاہم، ترجمانی کی کوشش کا ثواب اپنی جگہ ضرور محفوظ ہے اور وہی سب کا گوہرِ مقصود ہے۔ ہم کون سا بڑا حق ادا کر دیں گے اس کے ترجمے کا۔ مولا کے ارشادات کا مفہوم اپنی سادہ زبان میں یہ ہے کہ وہ اپنے مخلوقات میں پائی جانے والی کسی بھی خصوصیت سے متصف نہیں۔ اور مولا کے ارشادات ہی کی روشنی میں اِس عاجز نے بارہا منبروں سے بابِ توحید میں عرض کیا ہے اور لکھا بھی ہے کہ "وہ اپنے مخلوقات کی کسی بھی خصوصیت کا محتاج نہیں ہے جبکہ اس کے مخلوقات اس کی ایک ایک صفت کے محتاج ہیں"، اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنے مخلوقات کی صفتوں یا خصوصیتوں کا محتاج نہیں ہے بلکہ اُن سے مُنَزَّہ، پاک اور بلند ہے اور اپنی ایک ایک صفت اپنے مخلوقات کو حسبِ ظرف وحسبِ طلب عطا فرماتا رہتا ہے، وہ اُس کی عظمت ہے اور یہ اُس کا عُلو!

دعائے افتتاح کا زیرِ غور فقرہ "تنزیہہ ذات" کے بیانات میں سے ہے۔

اس بیان کی اہمیت اور حقیقت اس وقت تک اچھی طرح سامنے نہیں آسکتی جب تک کہ اس پر غور کرنے والے کی نظر میں صفاتِ سلبیہ سے متعلق کلامی مباحث کے ساتھ ساتھ عالمی ادب کے وہ شاہکار فن پارے نہ ہوں جن پر ملحدوں اور مشرکوں کے اربابِ نقد و نظر کو بڑا ناز ہے۔ جیسے بطورِ خاص "یونانی رزمیے"۔

ان رزمیوں کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں جو رزم و پیکار ہے وہ نہ

زمینی حقائق پر مبنی ہے، نہ فی الواقع و فی نفس الامر ایسی کوئی جنگ و پیکار ہوئی ہے، جسے ان لوگوں نے نظم کیا ہو، بلکہ یہ سب کے سب یا ان میں سے اکثر جنگیں محض شعراء کے ''عرصۂ خیال'' میں برپا ہوئیں اور وہ بھی ''خداؤں کی چھلیں'' (Moral pranks of divine spirits) ہیں جنہوں نے رزم و پیکار اور باقاعدہ جھگڑوں کی شکل اختیار کی ہے۔

جو کچھ ان رزمیوں میں لکھا گیا ہے اور جو باتیں اِن رزمیوں کی بُنیاد بنی ہیں، وہ سب کچھ اخلاقی نقطۂ نظر سے اتنا رکیک اور پست ہے کہ اسے بطورِ مثال بھی یہاں پیش کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ آپ اگر یہ غور کریں کہ ادب و شعر میں یہ ''خداؤں کی چھلیں'' یا ''ملکوتیوں کے جھگڑوں'' کا مضمون آیا کہاں سے؟ تو ظاہر ہے کہ آپ دُنیا کے قدیم ترین مُشرکانہ عقائد سے لے کر جدید ترین مُلحدانہ نظریات یا صنمیات (وثنیات) اور وَہمیات کے بہت بڑے انبار کا جائزہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جس میں یونانی، رومی، مصری بابلی اور ہندی سبھی دیومالائی مذاہب شامل ہوں گے۔ اور اس کے اسباب میں کچھ فکری مشکلیں سامنے آئیں گی تو کچھ یا بیشتر علمی مشکلیں! اور یہ عبرت انگیز حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ کبھی کسی فرد یا معاشرے یا تہذیب کے لیے ''حقیقتِ توحید'' کا مُنکشف نہ ہو پانا شرک والحاد کی بنیاد بنا ہے، تو بیشتر افراد، معاشروں اور تہذیبوں کے لیے ''حقیقتِ توحید'' کے تقاضوں پر عمل کی ''بے حوصلگی''۔

حضرت ربُّ الارباب کا ہم جتنا بھی شکر ادا کریں، ادائے شکر ناممکن ہوگا کہ اُس نے قرآن مجید کے نزول اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت نیز توحید کی سانچے میں ڈھلی ہوئی خود آپؐ کی اور آپؐ کے اہلِ بیت کی پاکیزہ سیرتوں کے ذریعہ عالمِ بشریت پر اپنی حجتیں تمام فرمادیں۔ اب ''حقیقتِ توحید'' کی فکری اور عملی کوئی مشکل عالمِ بشریت خصوصاً امتِ مسلمہ کے لیے باقی نہیں رہ گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

(٦)

جلالِ توحید (۲)

ہے اور مختصر ترین عبارتوں میں وسیع الذیل مطالب کو سمونے کی کوشش تو مصنف کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ تاریخ کے مباحث جس اختصار، احتیاط اور حقائق پر اقتصار کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں وہ بھی اردو زبان میں بے سابقہ اور بہت قابلِ غور ہے۔ اس کتاب کی زبان اردو میں فلسفیانہ نثر کی بہترین مثال ہے۔ یقیناً جو لوگ بالیدہ ادبی ذوق سے سرشار ہیں وہ اس کتاب کی تخلیقی اور فلسفیانہ نثر سے کما حقہ محظوظ ہوسکیں گے۔

اس کتاب کے بارے میں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس اسلوب میں یہ سامنے آرہی ہے حقیقۃً یہی مصنف کا مخصوص اسلوبِ تدریس ہے۔ جن طلبہ نے ان کی مجلس درس سے کچھ بھی استفادہ کیا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ اُن کے تقاریرِ درس میں بات الفاظ اور معانی کی تحقیق و تحلیل سے شروع ہوتی ہے اور بات ہی بات میں ادبی اور منطقی حوالوں سے گزرتی ہوئی انتہائی دقیق فکری، فلسفیانہ اور عرفانی مباحث تک پہنچ جاتی ہے۔

اس پیش کش میں بہت سے مقامات پر لفظی اور نحوی و صرفی مباحث کو حذف کردیا گیا ہے اگرچہ پھر بھی کہیں کہیں پر یہ بحثیں باقی بھی رہ گئی ہیں۔ اسی طرح صفحات کی محدودیت کے پیش نظر کچھ اور مباحث بھی شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، ضرورت محسوس ہوئی تو آئندہ ایڈیشن میں شامل کرلیے جائیں گے۔

مکتبۂ کائنات جناب ڈاکٹر سید رضوان کاظمی اور جناب سید امیر عباس زیدی صاحبان کا ممنون ہے جنہوں نے اِس کتاب کی اشاعت کا بارگراں اٹھا کر ثوابِ عظیم حاصل کرنے کی سعیِ مشکور فرمائی ہے، ہم ان کے لیے ازدیادِ توفیق کی دعا کرتے ہیں اور ان کے بزرگوں کے لیے جوارِ رحمت میں بلند سے بلند تر مقامات کے خواہاں ہیں!

دعاگو

سید ذوالقدر رضوی عفی عنہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَا شَرِيْكَ لَهُ فِي خَلْقِهِ وَلَا شَبِيْهَ لَهُ فِي عَظَمَتِهِ!

تمام حمد، ساری تعریف اُسی معبود کے لیے ہے جس کی کارگاہِ خلقت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور نہ اس کی عظمت میں کوئی اس کی نظیر ہے!

☆☆☆

لفظ و عبارت کے لحاظ سے اِس جملے میں کوئی لفظ قابل تحقیق و تفتیش نہیں ہے۔ تمام لفظیں سامنے کی ہیں۔ اس لیے اس کے مفہوم میں غور کرتے ہیں۔

اس فقرے میں بھی توحید تنزیہی کا بیان ہے۔ یعنی صفاتِ سلبیہ میں سے خصوصیت کے ساتھ اُس کے کسی کے شریک نہ ہونے کی صفت کو پھر ایک خاص پہلو سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ''لم یکن لہ شریک في الملکِ'' گزر چکا ہے۔ یہاں ''لاشریک لہ فی خلقہٖ'' ہے۔ وہاں مُلک یعنی اقتدار میں شریک کی نفی تھی، یہاں تخلیق کے عمل میں شریک کی نفی ہے۔ یہ صراحتیں دراصل ہر ہر جہت سے، ہر ہر سطح پر، تمام مراتبِ وجود اور تمام شئونِ حیات میں شرک کی مکمل نفی اور وحدتِ مطلقہ یا توحیدِ حقہ کے اثبات اور بیان کا حکیمانہ اور مربیانہ اہتمام ہے!

معلوم ہے کہ بعض مذاہب ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو ''خالقِ کائنات'' کو فی الاصل تو ایک ہی مانتے ہیں لیکن زندگی کے مختلف شعبوں یا وجود کے مختلف مراتب کے لیے علیٰحدہ علیٰحدہ خداؤں کے قائل ہیں جس کی مثال ہندو مذہب میں بھی ملتی ہے۔

قدیم مذاہب کو تو جانے دیجیے۔ اُن کے انحرافات کی رد میں علمِ کلام اور

مُناظرے کی کتابوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اِس عہدِ ترقی میں، علمِ جراحی اور عملِ جراحی (Surgery) کی پیش رفت، عملِ تلقیح اور اس کے بھی مختلف طریقوں کی دریافت اور ظاہری کامیابیوں نے نئے شکوک وشبہات پیدا کردیے ہیں، ہماری نظران پر بھی ہے۔

قرآن مجید میں سورۂ مبارکہ لقمان کی ۳۴ ویں آیت میں چند امور خاص پروردگار کی ذات سے متعلق قرار دیے گئے ہیں۔ اس مقام میں دراصل علمِ الٰہی کی تفصیل جزئیات پر اس کے احاطہ اور اس کی بے کرانی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے چند مصادیق بیان کیے گئے ہیں:

''اِنَّ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ السَّاعَۃِ وَ یُنَزِّلُ الۡغَیۡثَ وَ یَعۡلَمُ مَا فِی الۡاَرۡحَامِ وَمَا تَدۡرِيۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَکۡسِبُ غَدًا وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ''

''یقیناً قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ وہی مینہ برساتا ہے، اور وہی جانتا ہے جو ماؤں کے رحموں میں ہے، اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا حاصل کرے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ اسے کہاں موت آئے گی بے شک اللہ پورا پورا علم اور مکمل خبر رکھنے والا ہے''۔

اب جدید سائنس وایجادات کی مدد سے عموماً لوگ موسموں کا حال، ماؤں کے رحموں میں جنین کی صورتِ حال، اپنے آئندہ کے اقتصادی، سیاسی، طبّی مستقبل کے بہت سے امور، بعض حالات میں کسی مریض کی زندگی اور موت کے مسائل وغیرہ کے بارے میں تقریباً صد فی صد علم واطلاع حاصل کرلیتے ہیں۔ اور اس آیت

کی معنویت پر سوال کرتے ہیں کہ اب تو علمِ الٰہی پر انسانی تصرف یا قدرت سامنے آ گئی ؟؟! پھر اس قرآنی بیان کی صداقت اور معنویت کیا ہے؟

مجھے اس طرح کے سوالات پر تعجب ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ایسے سوالات تبھی پیدا ہوتے ہیں جب ''عقل سادہ کار'' _ ''فتنہ کار'' بن جاتی ہے! ارے کہاں ربُّ الارباب کا علم جو قطعاً بلا واسطہٗ آلات و وسائل ہے اور پھر بھی قطعاً وحتماً بلا شائبہٗ خطا ہے۔ اور کہاں یہ انسانی معلومات کہ جو اُسی کے عطا کردہ عقل وشعور کے ذریعہ، آلات و وسائل کے واسطہ سے حاصل ہوتے ہیں اور ان میں بھی خطا اور نقص کے کتنے ہی شائبے رہتے ہیں!

کچھ ایسی ہی صورت تلقیح جیسے تجربات کی کامیابی سے لوگوں میں مشرکانہ یا ملحدانہ خیالات کی ہے۔

حالانکہ اگر قانونِ علت و معلول کو اس کی پوری تفصیل کے ساتھ اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ علّت کے اقسام اور اس کی علّیت (Causation) کے اطوار کو نظر میں رکھا جائے تو اس طرح کا کوئی وہم و گمان قلبِ مؤمن یا ذہن حکیم میں کوئی جگہ نہیں بنا سکتا!

علّت کے اقسام میں علّت مُعِدّہ، علّت فاعلی، علّت غائی، علّت ناقصہ اور علّت تامہ وغیرہ کے فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سائنس داں، سائنسی تجربات، آلات اور وسائل، یہ سب وسائل ہی وسائل ہیں، ان میں سے کوئی بھی شئی ''تخلیقِ جنین'' یا تخلیق ثمار کے لیے ''علت تامہ'' کی حیثیت نہیں رکھتی __ علت تامہ اسی معبود برحق کی مشیت کارساز ہے اور

بس!

انسان چاہے کچھ بھی کر ڈالے آخری نتیجہ اور وہ وجودی اور حیَوی شکل و صورت جو بجائے خود اِس دنیا میں، عالم کون ومکان میں مشاءِ آثار ہوتی ہے وہ اسی 'احسن الخالقین' اور اسی 'باری و مصور' کے ''اذن فعلی'' اور لبِ کن فکاں، کی جنبش پر منحصر ہے۔ **فتبارک الله احسن الخالقین۔**

یوں تو قرآن مجید میں 'ش ر ک' کے مادّے سے بہت سے کلمات آئے ہیں۔لیکن لفظِ 'شریک' غالباً صرف تین ہی مقامات پر آیا ہے۔

سورۂ مبارکہ انعام میں لاشریک لہ مطلقاً آیا ہے (آیت ۱۶۲) سورۂ مبارکہ بنی اسرئیل (سورۂ اسراء) میں **وَ قُلِ الحَمْدُ للهِ الذی لَمْ یَتَّخِذْ وَلَداً وَلَمْ یَکُنْ لَهُ شَرِیکٌ فِی الْمُلْکِ** (آیت ۱۱۱) اور سورۂ فرقان (آیت ۲) میں بھی تقریباً یہی الفاظ آئے ہیں۔قرآن میں تینوں جگہوں پر فی الجملہ ''ملک'' و نظام وتدبیر میں شریک کی نفی کی گئی ہے، یہاں پر معصوم نے اِجمال قرآنی کو تفصیل سے بدل کر ملک میں نفی شریک کی صراحت فرمائی، کہ مبادا کوئی اپنی چھوٹی چھوٹی ایجاد وصنعت، تخلیق و تجربہ کی بنیاد پر خود کو خالق تصور نہ کر بیٹھے۔ ہاں ہم سب کو خود اسی نے تخلیقی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، اور اس عالم اسباب کو اسی نے ہمارے قبضہ واختیار میں دے دیا ہے۔اس عالم اسباب میں اسباب بہم ہوتے ہیں، لیکن ان اسباب سے کوئی تازہ ثمر وجود اُسی کے آخری اِشارے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ چاہے وہ حقیقی و خارجی وجودات ہوں، چاہے اعتباری امتیازات ہوں، یعنی یہ ارباب دین واہل مذہب کی شاعری نہیں حقیقت ہے۔جس کی ترجمانی شاعرِ حق

ترجمان مرزا اسلامت علی دبیرؔ نے اِن رباعیوں میں فرمائی ہے:

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے
قد سرو کو گل کو رنگ و بو دیتا ہے
بیکار تشخص ہے، تصنع بے سود
عزت وہی عزت ہے جو تو دیتا ہے
یارب خلاق ماہ و ماہی تو ہے
بخشندہ تاج و تختِ شاہی تو ہے
بے منت و بے سوال و بے استحقاق
دیتا ہے جو سب کو یا الٰہی تو ہے

☆☆☆☆☆

(۷)

کمالِ توحید

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْفَاشِي فِي الْخَلْقِ اَمْرُہُ وَحَمْدُہُ الظَّاھِرِ بِالْکَرَمِ مَجْدُہُ

الْبَاسِطِ بِالجَوْدِ یَدَہُ

اَلَّذِي لاَ تَنْقُصُ خَزَائِنُہُ

وَلاَ تَزِیْدُہُ کَثْرَۃُ الْعَطَاءِ اِلَّا جُوْداً وَکَرَماً

اِنَّہُ ھُوَ العَزِیْزُ الوَھَّابُ

تمام حمد اُسی معبود کے لیے ہے جس کا حکم اور جس کی حمد تمام خلق میں آشکار ہے!

جس کی بزرگی اس کے کرم سے ہویدا ہے

جس نے فیاضی کے لیے اپنے ہاتھ کھول رکھے ہیں۔

جس کے خزانوں میں کمی نہیں ہوتی۔

اور داد و دہش کی زیادتی سے اس کے یہاں کوئی اضافہ نہیں ہوتا سوائے فیاضی اور کرم گستری کے۔

وہی ہے بس وہی ہے قدرت مند داتا!

مضمون اور معنی کے لحاظ سے یہ فقرہ بیحد حیرت انگیز، بے انتہا غور طلب اور چشم باطن کُشا ہے! اربابِ ذوق کے لیے ایک کیفیت بخش اور اہلِ تحقیق اربابِ توحید کے لیے ایک حال عطا کرنے والا اور ایک "مقام" پر متمکن کر دینے والا فقرہ ہے۔ نہج البلاغہ میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا ایک خطبہ بھی ایسے ہی فقرے سے شروع ہوتا ہے۔

"اَلحَمدُ للّٰہِ الفاشِي فِي الخَلقِ حمدُہُ و الغَالِبِ جُندُہُ..."

(نہج البلاغہ نسخہ صبحی صالح خ ۱۹۱ص ۲۸۳)

اصحابِ معرفت عالمِ خلق اور عالمِ اَمر کی اصطلاحوں سے عالمِ مُلک اور

عالمِ مَلکُوت مراد لیتے ہیں۔ عالمِ مُلک یہی زمان و مکان کا عالم ہے اور عالمِ ملکوت زمان و مکان کے حدود، خصائص یا قیود سے آزاد! ایک سطحی فکر و نظر رکھنے والا ان عالموں میں ایک بعد اور فصل کا تصور کھتا ہے۔ جبکہ یہی بعد یا فصل کا تصور 'لا مکان' کو 'مکان' بنا دیتا ہے۔ دُعا کے اس فقرے میں واشگاف انداز میں کہا جا رہا ہے کہ تمام حمد، تمام تعریف، تمام خوبی، تمام شکر و سپاس اور کل مدحت و ثنا اُسی معبودِ برحق کے لیے ہے جس کا 'امر' خَلق ہی میں ظاہر ہے! یعنی اسی عالمِ ملک میں اُس کا ملکوت جھلک رہا ہے، کوئی دیکھنے والا ہو تو دیکھے کہ اسی مکان کے پردے میں لا مکاں اور اسی زمان کے پردے میں لا زماں چمک دمک رہا ہے، بلکہ اِس مکان کو اُسی لا مکاں سے رونق حاصل ہے، مسلسل نور بارانی ہو رہی ہے!''بیدہٖ ملکُوتُ کلّ شیٔ'' کا اعلان کرنے والا جب جہاں اور جس طرح چاہے اپنے نورِ ملکوت کو مشعلِ طور بنا دے! اس کی قدرت کے اظہار میں کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہیں!

خلق و امر کی ''وحدت'' کا حسین ترین اور کامل ترین اظہار تو خود ''انسان'' کی ذات میں ''جسم و روح'' کی وحدت اور یکجائی کی شکل میں ہو رہا ہے۔ لیکن یہ اتنا مانوس مظہر ہے کہ اس کی قُدرت پر نظر ٹھہرتی نہیں، اسی لیے معبود برحق، انبیاء اور اَولیائے معصومین علیہم السلام کے ذریعہ سے اپنے آیات و معجزات کا اظہار فرماتا ہے، کبھی ابراہیمؑ کے لیے دہکتے ہوئے انگارے اور بھڑکتے ہوئے شعلے گل و گلزار بن جاتے ہیں تو کبھی موسیٰؑ کے لیے کسی درخت سے آواز آنے لگتی ہے تو کبھی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے درخت حرکت کرنے لگتا ہے، ہاتھوں پر سنگریزے کلمہ پڑھنے لگتے ہیں، آسمان پر چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے، کبھی کسی علیؑ ولی کی خاطر سورج کو پلٹا دیا جاتا ہے تو کبھی کسی زین العابدین وسید الساجدین کے لیے حَجرِ اسود گویا ہو کر ''امر الٰہی'' کی گواہی دینے لگتا ہے، یہ سارے معجزات عالمِ مُلک میں شانِ ملکوت کا اظہار اور ''توحیدِ عرفانی'' کے دلائل و آثار ہیں!

ہاں! ''توحیدِ عرفانی'' مراتبِ توحیدِ حق وصَمَد کا ایک انتہائی اَرفَع مرتبہ ہے اس میں شک کرنے کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے، جبکہ اس حقیقت کی تصدیق کرنے والے، اُس تک پہنچنے والی طریقت کی نشاندہی کرنے والے، اُسے دیکھنے والے، اُس کی رؤیت کے لطف اوراس کے دیدار کی لذت اٹھانے والے برملا اس کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ وہ روایت کس قدر مستحکم ہے کہ پوچھنے والے نے حضرتِ امیر المؤمنین، مولیٰ الموحدین، ولیِ مطلق اور وصیِ برحق امام علی مرتضٰی علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ اور آپ نے جواب میں فرمایا میں ایسے کسی رب کی پرستش نہیں کرتا جسے دیکھا نہ ہو! یہ روایت کتاب التوحید مؤلفہ علامہ صدوق میں موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ جس کا ''امر'' اس قدر ہویدا ہے اُس کی حمد کیوں کر نہ آشکار ہوگی! اِس عالَمِ خلق کی ایک ایک شے سے اُس کی خوبی، اُس کی حمد کا اظہار وبیان بھی ہو رہا ہے، یعنی ؎

کُچھ گُل فقط نہ کرتے ہیں رَبِّ عُلا کی حمد

ہر خار کو بھی نوکِ زباں ہے خدا کی حمد [1]

''توحیدِ عرفانی'' کا اگر احادیث نبویہ میں سرچشمہ تلاش کرنا ہو تو منجملہ اور احادیث کے یہ حدیث نبویؐ بھی نہایت تابناک اسرار کی حامل نظر آئے گی:

علامہ صدوقؒ نے معانی الاخبار میں نقل فرمایا ہے:

''... قال رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم:

"التوحيد ظاهِرهُ في باطِنه و باطِنهُ في ظاهِرِه،

---

[1] اصل بیت میر انیس علیہ الرحمہ کی ہے:

کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربِّ علا کی حمد

ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی حمد

ظَاهِرُهُ مَوْصُوفٌ لَا يُرٰى،
وَبَاطِنُهُ مَوْجُوْدٌ لَا يَخْفٰى،
يُطْلَبُ بِكُلِّ مَكَانٍ، وَلَمْ يَخْلُ مِنْهُ مَكَانٌ طَرْفَةَ عَيْنٍ،
حَاضِرٌ غيرُ مَحْدُوْدٍ،
وَغَائِبٌ غيرُ مَفْقُوْدٍ!"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"توحید کی شان یہ ہے کہ اس کا ظاہر اس کے باطن میں!
اس کا ظاہر وصف کیا جاتا ہے دیکھا نہیں جاتا!
اس کا باطن موجود ہے، مخفی نہیں
اُسے ہر جگہ پایا جاتا ہے، کوئی جگہ چشمِ زدن کے لیے بھی اس سے خالی نہیں،
وہ حاضر ہے محدود نہیں" [1]

یہی وہ زاویۂ نگاہ، مقامِ مُشاہدہ، شانِ حمد اور اندازِ تشُہد ہے جہاں پر عوام کی بات تو الگ رہی، خواص علماء بلکہ خود اس گروہ کے افراد واعلام کے درمیان بھی جو خاصۂ اہل اللہ، اور اہلِ توحید ہی کہلاتا ہے، اختلافِ بیان وتعبیر بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے!

ایک طرف محی الدین اکبر ابنِ عربی ہیں کہ نظریۂ "وحدت الوجود" کے سرخیل ہیں تو ایک طرف علاء الدین سمنانی ہیں جو نظریۂ وحدتِ شہود کے سرگزار ہیں، یہ مقام ان تمام نظریات پر مفصل بحث کا مقتضی نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمارے لیے قرآن وارشادِ پیغمبرؐ ہی اس باب میں کافی ومکتفی ہے۔

---

[1] گویا انیس ودبیر کی وہ رباعیاں اسی حدیثِ نبوی کو شاعرانہ دلاویزی کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ جن کے آخری مصرعے یہ ہیں:

ع جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے
انیس

حرفِ تقدیم

از رشحاتِ قلم حضرت استاذ الاساتذہ آیتِ عشق و عرفان
مولانا المولوی السید محمد شاکر النقوی الامروہوی
استاذ الٰہیات جامعۂ مشارع الشرائع
معروف بہ جامعۂ ناظمیہ
حوزۂ علمیہ لکھنؤ، ہند

الظَّاهِرِ بِالْكَرَمِ مَجْدُهُ

جس کی بزرگی اس کے کرم سے ہویدا ہے

الباسِطِ بِالْجُودِ يَدَهُ

جس نے فیاضی کے لیے اپنے ہاتھ کھول رکھے ہیں۔

الَّذِي لا تَنْقُصُ خَزَائِنُهُ

جس کے خزانوں میں کمی نہیں ہوتی۔

وَلا تَزِيدُهُ كَثْرَةُ الْعَطَاءِ إِلَّا جُوداً وَكَرَماً

اور داد و دہش کی زیادتی سے اس کے یہاں کوئی اضافہ نہیں ہوتا سوائے فیاضی اور کرم گستری کے۔

إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْوَهَّابُ!

وہی ہے بس وہی ہے قدرت مند داتا!

☆☆☆

اِن تمام فقروں میں ربِّ کریم کی قدرتِ بے پایاں اور عطائے بے کراں کی ثناخوانی ہے۔ جو دُعائیہ نقطۂ نظر سے حُسنِ طلب کی بہترین صورت ہے۔ بقول شاعرِ عرب۔

إِذَا أَثْنَى عَلَيْكَ الْمَرْأُ يَوْماً
كَفَاهُ مِنْ تَعَرُّضِهِ الثَّنَاءُ

مفہوم یہ ہے کہ اگر انسان کبھی تیری ثنا کرے تو وہی ثنا اس کی طرف سے عرضِ مدعا کے لیے کافی ہے! یہ شعر علامہ بہائی نے کشکول میں اپنے والد فقیہِ عصر و مرجعِ وقت شیخ حسین عاملی کے حوالے سے انہیں کے ایک قلمی نوشتے سے ایک لطیف تقریب و تعبیر کے ساتھ نقل کیا ہے، ان کی پوری عبارت اس طرح سے ہے:

"قَالَ جَامِعُهُ: من خط والدي طاب ثراه؛ سُئِلَ عطاء عن معنىٰ قول النبي صلى الله عليه و آله وسلم: خيرُ الدعاء

دعائی و دعاء الانبیاء من قبلی وهو: لا اِلٰهَ الّا الله وحده لاشریک له له الملک وله الحمد یُحیي و یمیت وهو حي لایموت، بیده الخیر وهو علی کل شیئ قدیر"

ولیس هٰذا دعاء اِنما هو تقدیس و تحمید، فقال هٰذا کما قال امیه بن الصلت فی ابن جدعان:

اِذَا أثنـــیٰ عَـلَیکَ الــمَـرأُ یَـوماً
کَـفَــاهُ مِـنْ تَـعَـرُّضِــهِ الثـنــآءُ

افیعلم ابن جدعان مایراد منه بالثناء علیه، ولا یعلم الله ما یراد منه بالثناء علیه.

(بہائی، کشکول نسخہ خراسان ج۱ص۲۲۹)

''اس کشکول کا مولف کہتا ہے: میرے والد طاب ثراہ کی تحریر میں ہے کہ عطاء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِس قول کے معنی پوچھے گئے کہ ''بہترین دعا میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی یہ دعا ہے: لا الٰه الّا ...الخ۔

جبکہ یہ دعا نہیں ہے، یہ تو تقدیس و تمجید ہے تو عطا نے کہا یہ اسی طرح ہے جیسے:

''امیہ بن ابی الصلت (عربی کے مشہور کلاسیکی شاعر) نے ابن جدعان کے بارے میں کہا کہ اگر انسان تیری ثنا کرے تو اُس کی ثنا اس کی طرف سے عرضِ مدعا کے لیے کافی ہے، تو کیا ابن جدعان جانتا ہے کہ اُس کی تعریف کے ذریعہ اُس سے کیا مُراد و مدعا وابستہ ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نہیں جانتا کہ اُس کی ثنا کے ذریعہ اُس سے کیا امید لگائی گئی ہے؟''

اس نکتہ سے قطعِ نظر، ''الظاهر بالکرم مجده'' کے فقرے میں رب کریم کی جس بات کی، جس طرح سے، جس نقطۂ نگاہ سے بزرگی بیان کی گئی ہے اس میں اور بھی حکیمانہ نکات مضمر ہیں۔ اور اسی طرح ''الباسط بالجود یده'' کے فقرے میں بے

انتہا بلاغت کے ساتھ ربّ کریم کی قدرتِ مُستَمِرّ ہ، قدرتِ جاریہ، فیضان جاری و ساری کا بیان ہے، وہ قرآن مجید کی ان آیات کی طرف ذہن کو ملتفت کردیتا ہے جس میں یہود کے تعطیل وتفویض کے مُلحدانہ شُبہہ کا کریمانہ جواب دیا گیا ہے:

﴿وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ وَ لُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ یُنْفِقُ كَیْفَ یَشَآءُ وَ لَیَزِیْدَنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ مَّاۤ اُنْزِلَ طُغْیَانًا وَّ كُفْرًا﴾

"اور یہود نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، جو انہوں نے کہا اُس سے انہیں کے ہاتھ بندھے، اور ان پر لعنت برسی، اللہ کے ہاتھ تو کھلے ہوئے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور جو آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل ہوا ہے وہ اُن میں سے بہتوں کے لیے سرکشی اور کفر میں اضافہ ہی کرے گا!"

اس آیتِ مجیدہ میں اور دعائے افتتاح کے زیرِ غور فقرے میں بڑا گہرا معنوی ربط ہے جو بہت حد تک الفاظ سے بھی ظاہر ہے۔ لیکن اس کے تمام مضمرات سے بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ آیت قرآنی اور ارشاداتِ نبوی و وَلَوی، احادیث وادعیہ کے اسرار و رموز جاننے کے لیے بھی اُسی ربّ کریم سے استمداد ضروری ہے۔ اُسی سے فہمِ اسرار و معانی چاہیے۔ وہی ہے بس وہی قدرت منداور داتا!

☆☆☆☆☆

(۸)

حُسنِ سوال

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ قَلِیْلاً مِنْ کَثِیْرٍ مَعَ حَاجَۃٍ بِیْ اِلَیْہِ عَظِیْمَۃٍ وَ غِنَاکَ عَنْہُ قَدِیْمٌ وَ ھُوَ عِنْدِیْ کَثِیْرٌ وَ ھُوَ عَلَیْکَ سَھْلٌ یَسِیْرٌ.

اے معبود! میں سوال کر رہا ہوں تجھ سے! بہت زیادہ میں سے بہت کم کا، جبکہ مجھے اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے اور تو اس سے ہمیشہ سے بے نیاز ہے اور وہی کم میرے لیے بہت زیادہ ہے جبکہ (اس کا عطا کرنا) تیرے لیے بہت آسان اور معمولی کام ہے!!

اس فقرے میں کوئی لفظ غریب یا مشکل نہیں ہے۔ ترجمے کی روشنی میں اردو کے عام قاری بھی دعا کے اصل الفاظ کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

حسن ترکیب کے لحاظ سے دوسرے فقروں کی طرح اس فقرہ میں بھی انفرادیت اور دل آویزی، بلاغت اور دلنشینی بحدّ کمال پائی جاتی ہے۔ الفاظ تو الفاظ ہیں اس فقرے میں خصوصیت کے ساتھ ''تنوین'' نے جو صوتی اور معنوی دونوں سطحوں پر سحر کاری یا اعجاز نمائی کی ہے اُسے کچھ اہلِ ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مضمون کے لحاظ سے یہ فقرہ ___ فقرِ مخلوقات اور استغنائے ذاتِ احدی وصمدی کو جس تفصیل بداماں ایجاز کے ساتھ پیش کر رہا ہے اس کی ستائش کے لیے ہمارے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔

خالقِ متعال کی ذات غنی ہے اور ہمیشہ سے غنی ہے، نہ کبھی کسی بھی طرح کی احتیاج اُسے لاحق تھی نہ ہو سکتی ہے۔ اس کی ذات، اس کی صفتِ استغنا اور اس کے خزانوں کے مقابلے میں تمام مخلوقات کی احتیاج بشمول اِنسان کچھ بھی نہیں ہے۔ اُس کی ایک ذرا سی بارشِ کرم سے تمام عالم جل تھل ہو جاتا ہے اور دامنِ طلب میں اس کی عطا کو سنبھال کر رکھنے کی گنجائش نہیں رہتی! اُس پر بھی یہ انسان اپنی ضرورتوں

کو اہم گردانتا ہے اور حضرت رَبُّ الارباب کی عطاؤں کو کم تر شمار کرتا ہے۔ اور وہ رب الارباب جس کے لیے بڑی سے بڑے عطا بھی انتہائی سہل اور معمولی ہے، اپنے بندوں کے ظرف و استعداد کو دیکھ کر ہی عطا فرماتا ہے، جب کہ عموماً انسان اپنی ضرورت نہیں بلکہ اپنی حرص و ہوس کے پیمانے سے طلب کرتا ہے اور جب کبھی اس کی طلب حسبِ ہوائے نفس پوری نہیں ہوتی تو اپنے رب سے گلہ کرتا ہے، بلکہ اپنے جیسے دوسرے بندوں سے اُس کا گلہ کرنے لگتا ہے، اس دعا کے بعض دوسرے فقروں میں دعا سے متعلق اِن مسائل پر اور بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

لیکن اس سے قبل کہ دوسرے فقروں پر نظر ڈالی جائے، سوال و عطا کے تعلق سے، برسبیلِ ثنا، یہ ذکر انتہائی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ وہ معبودِ برحق اور خالقِ جواد و کریم تو وہ ہے جس کے فیضانِ عطا میں کوئی کمی ہے ہی نہیں، اس کے بحرِ کرم میں مد ہی مد ہے جزر کا نام و نشان ہی نہیں، دامنِ طلب میں گنجائش ہوتی ہے تو اُس کی بارشِ کرم یوں بھی ہوتی ہے کہ خود فرماتا ہے:

﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضىٰ﴾ (سورۂ ضحیٰ ۹۳ آیت ۵)

''اور جلد ہی پروردگار تمہیں اتنا عطا کرے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے''

بلکہ رب اکبر کا تو اعلان ہے کہ ہماری عطا سب کے لیے عام ہے کسی پر بند نہیں ہے!

﴿كُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَ هٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ وَ مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾ (سورۂ اسراء ۱۷/۲۰)

اور جہاں تک اس کے احبا، اولیاء، عشاق، مُطیعین اور مخصوص بندوں کا تعلق ہے وہاں تو ﴿اِنَّا اَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ﴾ کا سرچشمۂ عطا جوش زن ہے ہی!

سورۂ ھــود میں صلحائے امت کے حق میں عطائے اخروی کی شان بھی

قابلِ غور ہے:

”وَاَمَّا الَّـذِیْنَ سُعِدُوا فَفِی الْجَنَّۃِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ

وَالاَرْضُ اِلَّا مَاشَاءَ رَبُّکَ عَطَاءً اغَیْرَ مَجْذُوْذٍ“

”اور جولوگ نیک ہیں وہ تو جنت میں ہیں جب تک کہ یہ آسمان وزمین

قائم ہیں، مگر یہ کہ پروردگار جو چاہے یہ عطائے رب ہے جو ختم ہونے والی نہیں!“

اسی طرح سورۂ مبارکہ صٓ کی ایک آیت بھی بے انتہا فکر انگیز، حوصلہ ساز

اور ہمت نواز مضمون اور مژدۂ عطا کی حامل ہے:

﴿ھٰذَا عَطَآءُ نَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِکْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾

”یہ ہے ہماری عطا اب چاہے تم لوگوں کو بے دریغ فیضیاب کردو یا

بے حساب اپنے پاس رکھو!“ ۱۲۶

☆☆☆☆☆

(۹)

قصیدۂ کرم و حلم و حُسنِ استغفار

اَللّٰهُمَّ اِنَّ عَفْوَكَ عَنْ ذَنْبِي وَتَجَاوُزَكَ عَنْ خَطِيئَتِي وَصَفْحَكَ عَنْ ظُلْمِي وَسِتْرَكَ عَلٰى قَبِيحِ عَمَلِي وَحِلْمَكَ عَنْ كَثِيرِ جُرْمِي عِنْدَمَا كَانَ مِنْ خَطَاءِ ي وَعَمْدِي اَطْمَعَنِي فِي اَنْ اَسْأَلَكَ مَالَا اَسْتَوْجِبُهُ مِنْكَ الَّذِي رَزَقْتَنِي مِنْ رَحْمَتِكَ وَاَرَيْتَنِي مِنْ قُدْرَتِكَ وَعَرَّفْتَنِي مِنْ اِجَابَتِكَ فَصِرْتُ اَدْعُوكَ آمِنًا وَاَسْأَلُكَ مُسْتَأْنِسًا لَا خَائِفًا وَلَا وَجِلًا مُدِلًّا عَلَيْكَ فِيمَا قَصَدْتُ فِيهِ اِلَيْكَ فَاِنْ اَبْطَأَ عَنِّي عَتَبْتُ بِجَهْلِي عَلَيْكَ وَلَعَلَّ الَّذِي اَبْطَأَ عَنِّي هُوَ خَيْرٌ لِي لِعِلْمِكَ بِعَاقِبَةِ الْاُمُورِ فَلَمْ اَرَ مَوْلًى كَرِيمًا اَصْبَرَ عَلٰى عَبْدٍ لَئِيمٍ مِنْكَ عَلَيَّ يَا رَبِّ اِنَّكَ تَدْعُونِي فَاُوَلِّي عَنْكَ وَتَتَحَبَّبُ اِلَيَّ فَاَتَبَغَّضُ اِلَيْكَ وَتَتَوَدَّدُ اِلَيَّ فَلَا اَقْبَلُ مِنْكَ كَاَنَّ لِيَ التَّطَوُّلَ عَلَيْكَ فَلَمْ يَمْنَعْكَ ذٰلِكَ مِنَ الرَّحْمَةِ لِي وَالْاِحْسَانِ اِلَيَّ وَالتَّفَضُّلِ عَلَيَّ بِجُودِكَ وَكَرَمِكَ فَارْحَمْ عَبْدَكَ الْجَاهِلَ وَجُدْ عَلَيْهِ بِفَضْلِ اِحْسَانِكَ اِنَّكَ جَوَادٌ كَرِيمٌ.

اے معبود! تیرا میرے گناہ کو معاف کر دینا، تیرا میری خطا سے درگزر کرجانا، تیرا میری زیادتی سے چشم پوشی کرلینا، تیرا میرے کرتوت کو چھپا دینا، اور میرے بیشمار جرائم پر بردباری اختیار کرنا جبکہ یہ جرائم میری صریح غلطی سے اور دیدہ و دانستہ سرزد ہوئے، مجھے لالچ دلا رہا ہے کہ میں تجھ سے وہ سوال کروں جس میں تیری طرف سے مستحق نہیں ہوں اور جو تو نے اپنی رحمت سے مجھے عطا فرمایا اور اپنی قدرت سے مجھے دکھایا اور اپنی قبولیت سے مجھے آگاہ کیا۔ تو میں (اپنے اس قدر

گناہوں کے باوجود، مستحق سزا ہونے کے باوجو) تجھے چین سے پکار رہا ہوں اور تیرا آشنا بن کر تجھ سے سوال کر رہا ہوں! نہ ڈر رہا ہوں نہ جھجک رہا ہوں، بلکہ تیرے سامنے اپنے مقصد براری کے لیے ضد کر رہا ہوں مراد ملنے میں دیر ہوتی ہے تو اپنی جہالت سے تجھ سے ناراض ہوتا ہوں، جبکہ جو مراد مجھے نہیں ملی ہے وہ میرے لیے بہتر ہے کیونکہ تجھے تمام باتوں کے انجام کی آگہی ہے! میں نے تو تیرے جیسا کرم فرما آقا کوئی نہیں دیکھا۔ اے پالنے والے! تو مجھے بلاتا ہے اور میں تیری طرف سے روگردانی کرتا ہوں، تو مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں، تو مجھ پر مہربانیاں فرماتا ہے اور میں قبول نہیں کرتا، جیسے میرا تجھ پر کوئی احسان ہو، تب بھی تیری فیاضی اور کرم گستری تجھ کو مجھ پر رحمت کرنے، احسان فرمانے اور مہربانیوں سے روکتی نہیں بس اپنے اس جاہل بندے پر احسان فرما اور اپنے احسان سے اس پر فیاضی کر یقیناً تو ہی فیاض اور کرم گستر ہے! جو میرے جیسے ذلیل بندے کو برداشت کرے!

(اگرچہ اس فقرے میں کئی الفاظ تشریح طلب ہیں لیکن ہم ان لفظی ادھیڑ بن سے بچتے ہوئے مضمون سے بحث کرتے ہیں۔)

اِس دعا کا نسبتہً یہ طویل فقرہ ہے۔ جو اُس کے عفو و کرم اور حسنِ عطا کی ثنا وصفت کے مضمون پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ گزشتہ فقروں کے ذیل میں کہیں پر عرض کیا گیا ہے کہ ثنا خود ہی طلب سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ پھر جب حسنِ ثنا اور حسنِ طلب دونوں بحدِ کمال پائے جائیں تو اس عرضِ حال کی تاثیر کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے! دُنیا بھر کا ادب، تمام عارفوں، عابدوں، زاہدوں اور صوفیوں کی دعائیں، مناجاتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دُعا

دعا کیا ہے؟ دنیا کی ہر قوم جانتی ہے اور مانگتی ہے اور مذہب اس کا مبلغ ہے اور اس پر کاربند ہے کیونکہ دعا مذہب کا اساسی و بنیادی عنصر ہے۔ البتہ وہ چند گنے چنے افراد جن کو دُنیا ہی کی خبر نہ ہو دعا سے ناواقف ہو سکتے ہیں ورنہ دعا کا نام تو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو دعا سے ناخوش ہیں یا دعا پر یقین نہیں رکھتے۔

زیرِ نظر کوشش انہیں روٹھے ہوئے لوگوں کو گلے لگانے کے لیے تبلیغی منصوبوں کا ایک حصہ ہے۔ مقصد فقط یہ ہے کہ دعا کی عظیم برکتوں اور حتمی فائدوں سے کوئی محروم نہ رہ جائے کیونکہ دعا نہ صرف انسانیت بلکہ خود انسان کے لیے ایک ضروری سہارا ہے۔ کبھی اس دعوے کا شمار بھی ان بے شمار دعووں میں تھا جن کا ثبوت بس دلیل کا رہین منت رہا کرتا تھا اور اَب انکشافات کے طفیل نا قابل یقین دعوے بھی عام معلومات کی فہرست میں گنے جانے لگے، آج موجودات عالم کا اجمالی اثاثہ بھی تفصیلات سے روشناس کیا جانے لگا، ایک وقت تھا جب وجود اور موجود کی بحث بہت اہم اور فہم وادراک سے بالاتر سمجھی جاتی تھی، واجب الوجود کا یقین ایک کٹھن بات تھی، فلاسفہ کے درمیان معرکے تھے، کسی کا خیال تھا کہ موجود ہی خود وجود ہے، کسی کا کہنا تھا کہ موجود سے ہٹ کر خود وجود کی اپنی ایک حیثیت علیحدہ ہے، اس حیثیت کی ایک شان ہے جو بالکل جداگانہ ہے، کوئی موجود اس سے رشتہ قائم رکھے بغیر موجود ہی نہیں کہا جا سکتا، آج یہ سارے دعوے قیاس واستقراء کی قید وبند سے

پڑھ ڈالیے ربِ کریم کی رحمتِ بے پایاں کی ایسی سچی تصویر کہیں نہیں مل سکے گی۔ خود ساختہ عرفا و صوفیا اور بے معرفت عُبّاد و زُہّاد کی باتیں تو ظرف کی ''سطحیت'' کی بنا پر ذرا ذرا سی شانِ کرم دیکھ کر ''شطحیات'' میں بدل جاتی ہیں۔ اور ربِّ کریم کی حمد و ثنا کے بجائے اپنی شانِ گدائی کی پُر تعلّی قصیدہ خوانی شروع ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معبود برحق کے معصوم بندے ہی اگر اُس کے صفات کا بیان نہ فرمائیں تو کسی بھی انسان میں طاقت نہیں کہ اپنے لفظوں میں اُس کی رحمت و رأفتِ بے کراں اور لطفِ بے پایاں کا بیان کر سکے اور بیان تو کجا اس کی شانِ ربوبیت کا ذرہ بھر ادراک بھی کہاں ممکن ہے؟!

یہی سبب ہے کہ انسان اُس کی پیہم نوازشوں اور لگاتار چشم پوشیوں کا احساس نہ کر کے، اپنی دیدہ و دانستہ، بے تحاشا اور بے لگام غلطیوں، گناہوں اور ناشکریوں کا بھی کچھ لحاظ نہ کرتے ہوئے، اپنی مقصد براریوں کے لیے اس کے سامنے ضد کرتا ہے اور صرف ضد ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی طرف سے منہ مانگی مُراد نہ پا کر اُس سے ناراض بھی ہوتا ہے! ۱۳۰

اِس فقرۂ دعا کے جملے جہالت میں ڈوبے ہوئے اَدبِ الٰہی سے بے خبر اور ''تہذیبِ توحید و بندگی'' سے ناآشنا نفوس کے لیے زبردست تنبیہ کا مضمون اور تادیب و تزکیہ و تہذیبِ نفس کا بڑا سروسامان رکھتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ یہ جملے:

اِنَّکَ تَدْعُوْنِي فَاُوَلِّي عَنکَ
وَ تَتَحَبَّبُ اِلَیَّ فَاَتَبَغَّضُ اِلَیکَ

وَ تَتَوَدُّ اِلَیَّ فَلَا اَقْبَلُ مِنْکَ

کَاَنَّ لِیَ التَطَوُّلَ عَلَیْکَ

''تو مجھے بلاتا ہے اور میں تجھ سے روگردانی کرتا ہوں

تو مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں تجھ سے نفرت کا برتاؤ کرتا ہوں

تو مجھ پر مہربانیاں فرماتا ہے اور میں اسے قبول نہیں کرتا

جیسے میرا ہی تجھ پر کوئی احسان ہو''

کفرانِ نعمت کی بُری سرشت رکھنے والے کے لیے تنبیہ وسرزنش کے تیرو نشتر جیسے موثر جملے ہیں۔ایک سلیم الطبع انسان جو اِس طرح کے معاملات اور کوائف کا اپنی ذاتی زندگی میں کوئی عملی اور نفسیاتی تجربہ نہیں رکھتا وہ ایسے جملوں کو سُن کر یا پڑھ کر یا زبان سے ادا کرتے ہوئے لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔لیکن اکثریت تو اِس دارِ غفلت میں غفلت شعاروں ہی کی ہے!

اِن جملوں کی تھوڑی سی معنویت کو انسان اُس لطفِ خداوندی کے حوالے سے سمجھ سکتا ہے جو ربِّ کریم نے ماں باپ بھائیوں اور اولوالارحام یا قرابت داروں کی آپس کی محبت ومودت (تَحَبُّب اور تَوَدُّد) اور باہمی تعاون، حسنِ سلوک صلۂ رحم اور تطوّل کی شکل میں انسان کے شاملِ حال فرمایا ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ، اَولاد سے محض بر بنائے محبتِ مادری وشفقتِ پدری کوئی محبت کا سلوک کرتے ہیں اور اولاد اپنی جہالت یا غفلت کی بنا پر اس کی صحیح قدردانی نہیں کرتی، بلکہ ماں باپ سے ردوگردانی اختیار کر لیتی ہے یا ماں باپ کے سراسر مخلصانہ عمل کو ''غرض مندانہ'' سمجھ لیتی ہے۔ یا ایک بھائی محض

بر بنائے اخلاصِ برادرانہ تحبّب وتودُّدِ صادقانہ، کوئی حسن سلوک کرتا ہے اور دوسرا بھائی اس سے بجائے اقبالِ خاطر کے بغض یا نفرت کا برتاؤ اختیار کرتا ہے۔ بسا اوقات یوں ہی خانوادوں اور خاندانوں کے شیرازے بکھر کر رہ جاتے ہیں۔اسی لیے قرآنِ مجید نے فرمایا ہے:

﴿هَلۡ جَزَاءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ﴾

احسان کی جزا احسان ہی ہے!!

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ عرفانی، وجدانی اور سُلوکی نقطۂ نظر کا حامل تھا۔اس فقرۂ دعا کا پہلا ہی جملہ اور غور کیجیے تو ایک اور زاویۂ فکر بھی سامنے لاتا ہے

اَللّٰهُمَّ اِنَّ عَفۡوَکَ عَنۡ ذَنۡبِي

اے معبود تیرا میرے گناہوں کو معاف کر دینا!''

کلامی ذوق رکھنے والے ذہن اسی جملے سے حقیقتِ توبہ، اور امکانِ مغفرت وشفاعت کے مباحث کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔مغفرتِ ذنوب اور توبہ کا موضوع دو جانبہ ہے۔ایک طرف بندے کے لیے امکان وآدابِ توبہ کے مسائل ہیں اور دوسرے طرف ربّ کریم اور حاکم وسلطانِ عادل کی جانب سے مراتبِ عفوو درگزر کے مباحث۔

بعض علماء نے اس موضوع پر مستقل رسالے تصنیف کیے ہیں۔مختلف کلامی فرقوں کے نظریات اس باب میں بھی بہت زیادہ متصادم ہیں کہ پروردگارِ عالم کا اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟اسی طرح کے بعض مسائل کی موجودگی کبھی کبھی ''علم کلام'' کی دینی ارزش یا بے ارزشی کو بھی زیرِ سوال

لے آتی ہے۔ جبکہ قرآنِ مجید، ارشاداتِ نبویؐ، کلام ائمۂ دینؑ اور ادعیہ ماثورہ کے علاوہ عقل و وجدانِ بشری بطورِ مستقل بھی اِس عقدے کا بہت ہی روشن حل سامنے رکھتی ہے۔

میں اس مقام پر عفو و مغفرت، شفاعت اور توبہ کے باب میں تمام کلامی فرقوں کے آراء و نظریات بیان کرنے کے بجائے وہ خُلاصۂ بحث جو قرینِ تحقیق ہے کچھ اپنی اور کچھ حضرت محققِ طوسیؒ کی زبانی عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

بلاشبہ حضرت محقق طوسیؒ کے یہ جملے اِس بحث میں ہر منحرِف کج فکر و کج مج بیان کے قطعِ کلام کے لیے کافی ہیں:

''دَوامُ العِقَابِ مُخْتَصٌّ بِالكافِرِ وَ العُفوُ واقِعٌ لِأَنَّهُ حَقُّهُ تعالىٰ فَجازَ اِسْقاطُهُ وَلا ضَررَ فِي تَرْكِهِ مَعَ ضَرَرِ النَّازِلِ بِهِ فَحَسُنَ اِسْقاطُهُ وَلاَنَّهُ اِحْسانٌ وَ لِلسَّمعِ''۔

١٣٣

''عذابِ دائم صرف کافر کے لیے ہے، اس کے علاوہ (معبودِ برحق پر ایمان رکھنے والوں کی خطاؤں کی) ربِّ کریم کی جانب سے معافی ثابت ہے۔ اُس لیے کہ عذاب وعقاب اس کا حق ہے اور اپنے اِس حق سے درگزر کرنا قطعاً جائز ہے۔ جبکہ ترکِ عقاب میں کوئی ضرر بھی نہیں ہے بلکہ عقاب و عذاب نازل کرنے میں ضرور مخلوقات کو ضرر لاحق ہوتا ہے۔ اس بنا پر مولیٰ سبحانہ وتعالیٰ کا اپنے حقِ عتاب و عقاب سے درگزر کرنا حُسن ہی کا پہلو رکھتا ہے اور اس لیے بھی کہ یہ بندوں کے ساتھ نیکی ہے۔ اس کے علاوہ دلیلِ سَمعی یعنی مژدۂ قرآن و حدیث سے بھی عَفو ثابت ہے۔''

حضرت محقق کا یہ جملہ کہ ''والعفو واقعٌ''، ممکن ہے ثبوتِ امکانِ عفو ہی کے معنی میں ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ربِّ کریم کی جانب سے تو بندوں کے حق میں عفو و درگزر کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ اور جب عملاً عفو و درگزر کا سلسلہ اس دنیا میں جاری ہے تو پھر روزِ جزاء اس کے اِمکان میں کیوں کر شبہ وارِد ہو سکتا ہے؟!

انسان ذرا اپنی سیرت پر غور کرے! اس سے ربِّ کریم کے حقوق کی ادائیگی تو دُور کی بات ہے، جبکہ کھلی ہوئی نافرمانیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ انسان کتنے گناہ کرتا ہے؟ اس سے کتنی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں؟ کتنی بھول چوک ہوتی ہے اور کتنی کوتاہیاں جان بوجھ کر ہوتی ہیں، لیکن وہ ربِّ کریم ہے کہ سب کچھ نظر انداز فرماتا جاتا ہے، نہ رزق بند کرتا ہے، نہ مسخ کرتا ہے نہ وقت سے پہلے موت دیتا ہے، نہ اپنی طرف اسبابِ زندگی کو سلب کرتا ہے، نہ اپنے بندوں کو اُن کے رازوں کو فاش کر کے رسوا کرتا ہے، یہ اُس کی کتابِ رحمت قرآن اِس حقیقت پر سب سے بڑی گواہی پیش کرنے کے لیے موجود ہے کہ انسانوں کے لاکھوں، کروڑوں گناہوں میں سے پروردگار نے صرف اور صرف ''چھ'' گناہوں پر اپنی طرف سے حدود یعنی مخصوص اور معین سزاؤں کا اعلان کیا ہے اور وہ بھی بربنائے تقاضائے لُطف و رحمت ہی ہے۔ اسی ضمن میں ربِّ اکبر کا یہ اعلان بھی گوشِ سماعت میں پڑا رہے کہ:

﴿عَذَابِیٓ اُصِیۡبُ بِهٖ مَنۡ اَشَآءُ وَرَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ﴾

''میرا عذاب جسے میں چاہوں گا اُسی پر ہو گا اور میری رحمت کا دروازہ ہر شے پر کشادہ ہے۔''

(چونکہ موضوع پر مفصل بحث راقم اپنی کتاب ''قرآن یا کتابِ رحمت''

۱۳۴

میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر چکا ہے اس لیے یہاں اسی قدر اشارے پر کتفا کی جاتی ہے۔)

اس بیان سے حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے بندوں کے لیے امکانِ عفو یا امکانِ توبہ کا ثبوت تو سامنے آہی گیا ہے۔ اَب جہاں تک آدابِ توبہ اور مراتبِ عفو کا سوال ہے تو یہ بجائے خود بے حد تفصیل طلب ہے۔

قرآنِ مجید میں کہیں "تَوْبَة" کا لفظ آیا ہے، کہیں "اِنَابَة" کا تو کہیں "اَوْبَة" کا۔ بعض اربابِ لغت انہیں توبہ کے تین اقسام قرار دیتے ہیں اور تفسیر یہ بیان کی ہے کہ جو خوفِ عقاب کی بنا پر توبہ کرے وہ صاحبِ توبہ ہے، جو طمعِ ثواب میں توبہ کرے وہ صاحبِ انابت ہے اور جو نہ خوفِ عقاب میں توبہ کرے نہ طمعِ ثواب میں بلکہ محض طاعتِ پروردگار میں توبہ کرے وہ صاحبِ اَوبہ ہے۔

اسی ضمن میں عَفو اور مغفرت (یا غفران) کے الفاظ میں جو فرق ہے اُس کی بھی تھوڑی سی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے اسی لیے میں بعض مراتبِ عفو بھی سمجھ میں آجاتے ہیں۔

زبانِ الہام وقرآن عربی کے دقیقہ سنجوں نے وضاحت کی ہے کہ "عفو" کے معنی یہ ہے کہ جِسے معاف کر دیا جائے پھر اُس کی مَلامت و مذمت نہ کی جائے! لیکن مغفرت یا "غفران" یہ ہے کہ عقاب بھی ساقط ہو جائے اور ثواب بھی عطا کیا جائے۔ اور مغفرت وغفران کی نسبت سوائے پروردگار کے اور کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ بعض حضرات نے یہ بھی صراحت فرمائی کہ "عفو" فقط دارِ دنیا سے مخصوص ہے جبکہ غفران دارِ آخرت سے!

اَب قرآن مجید کی وہ آیت بھی تلاوت کر لی جائے جو اِس موضوع پر اہم ترین اور عظیم ترین آیت ہے یوں قرآن مجید میں عفو و غفران کے موضوع پر اغلباً کوئی صفحہ خالی نہ ہوگا جس پر کوئی نہ کوئی آیت یا اشارت موجود نہ ہو۔ یہ سورۂ مبارکہ انفال کی ۳۳ ویں آیت ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾

''اور اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا جب تک (اے پیغمبر) آپ ان کے درمیان ہیں اور اللہ ان پر (اس وقت بھی) عذاب کرنے والا نہیں ہے جب تک یہ اُس سے مغفرت کے طلبگار رہوں!''

خدا نہ کرے کسی فرد یا کسی مِلّت سے ربِّ کریم سے مغفرت طلبی اور پناہ جوئی کی توفیق ہی سلب ہو جائے!!

☆☆☆☆☆

(۱۰)

سپاسِ مالک و مُنعِم ثنائے قدرت بخش!

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ مَالِکِ الْمُلْکِ مُجْرِي الْفُلْکِ مُسَخِّرِ الرِّیَاحِ

فَالِقِ الاِصْبَاحِ دَیَّانِ الدِّیْنِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ"

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے

جو تمام ملکِ ہستی کا بادشاہ ہے

(بے کراں اور پُر طلاطم گہرے سمندروں میں) کشتیوں کا چلانے والا

ہے۔

ہواؤں کو زنجیر پہنانے والا

صبح کو نمودار کرنے والا

روزِ جزا بھرپور جزائیں دینے والا

تمام جہانوں کا پالنے والا ہے

☆☆☆

حمد و ثنائے الٰہی کے اس فقرے میں قرآن مجید کی کم از کم پانچ آیتوں کا مضمون سمویا ہوا ہے۔ جس سے پانچ علیٰحدہ علیٰحدہ ابوابِ علم و معرفت کھلتے ہیں۔ پہلے ان آیات کی تلاوت کر لیجیے جن کے مضامین اور جن میں استعمال کیے گئے الفاظ وتراکیب دعا کے اس فقرے میں اخذ کیے گئے ہیں۔

(۱) سورۂ مبارکہ آل عمران کی ۲۶ویں آیت ہے:

﴿قُلِ اللّٰھم مَالِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِیَدِکَ الْخَیر

اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴿﴾

''کہو کہ خدایا تو ہی مُلکِ ہستی کا بادشاہ ہے جِسے چاہتا ہے اِقتدار عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اقتدار لے لیتا ہے۔ جِسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جِسے چاہتا ہے ذلت۔ تیرے ہاتھ میں ساری بھلائی ہے۔ یقیناً تو ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والا ہے''

خیال رہے کہ یہ آیت لفظِ ''قُل'' سے شروع ہو رہی ہے اس لیے اس دعا میں ''مالک الملک'' کہہ کر اس کی حمد و ثنا بجالا کر اِس امرِ الٰہی کی تعمیل بھی ہو جاتی ہے۔

اس آیت کے سیاقِ الفاظ سے ایک بڑا نکتہ یہ بھی مُستفاد ہوتا ہے کہ بے شک اصل صاحبِ اقتدار تو وہی پروردگار ہے لیکن وہ جِسے چاہے اقتدار عطا بھی کر سکتا ہے! اس عطائے اقتدار میں اقتدارِ ظاہری، اقتدارِ باطنی، اقتدارِ معنوی، اقتدارِ مادّی ہر طرح کا اقتدار شامل ہے۔ چنانچہ اولیاء اللہ کے اقتدارِ روحانی اور تصرفاتِ معنوی کے لیے بھی یہ آیت مستحکم اساسِ فکر فراہم کرتی ہے۔

اس آیت میں اقتدار و عزت دیے جانے کے ساتھ ساتھ اقتدار کے واپس لینے اور ذلت دینے کی بات بھی کہی گئی ہے۔ لیکن اسی سیاقِ مضمون میں یہ بھی ہے کہ ''تیرے ہاتھ میں ساری بھلائی ہے''۔ اس سے یہ معنی بھی مستفاد ہوتے ہیں کہ اگر ربّ کریم کسی سے اقتدار لے لیتا ہے یا اگر واقعی اُس کی طرف سے کسی کو ذلت اُٹھانی پڑتی ہے تو اس میں بھی درحقیقت بھلائی کا پہلو ہوتا ہے۔ بے شک وہ ہر شے پر ہر طرح کی پوری قدرت رکھتا ہے ___ بظاہر ذلت دے کر بھی بہ باطن

آزاد ہوکر تمثیلی سطح پر حل ہو چکے، آج موبائل کے طوفانی استعمال نے عوام کو بھی اس بات کے سمجھنے کی پوری سہولت فراہم کر دی کہ اس عالم میں کچھ مسلمات ایسے بھی ہیں جو حواس خمسہ ظاہر کی گرفت سے بالکل باہر ہیں، کہیں سے کہیں تک نظر نہیں آتے، کسی حس ظاہری کو ذرا محسوس نہیں ہو پاتے، مگر پھر بھی عقل اُن کے آفاقی وجود کو اصولاً واجب جانتی ہے اور ان سے رشتہ قائم رکھنا اپنی کاروباری زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری سمجھتی ہے۔ یہ سارے مسلمات گویا ہماری مادّی عقل کے اَن دیکھے واجب الوجود ہیں جن سے روابط پیدا کرنا ہمارے اکثر مشکلات کا واحد حل مانا جا چکا ہے۔ بر سبیلِ تمثیل یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سارے موبائل تمام ٹیلی ویژن سٹ، کمپیوٹر تکنیک، انٹرنیٹ سسٹم اور مصنوعی سیاروں یا ماہواروں سے زمین کی بہت سی اشیا اور بہت سے امور کو کنٹرول کرنے کے اصول، زندہ ثبوت ہیں کہ ہمارا یہ پورا مادّی نظام چند معین کردہ علاماتی اشاروں سے ہماری حسبِ ضرورت و ارادۂ انسانی مربوط ہو کر ہماری مشکلات کا حل بن جاتا ہے، اس ارتباط کا دائرۂ عمل کتنا وسیع اور پھیلا ہوا ہے اس کی.... وسعت مادّی پیمانوں کے حدود سے باہر روشنی کی رفتار کے سہارے نوری سالوں اور برسوں کے پیمانوں سے ناپی جاتی ہے۔ ہماری اِس نو دریافت ریڈیائی دینا کے اِن اندیکھے مسلمات کا وجود بلاشُبہ ایک روحانی نظام کی حیرت ناک پیچیدگیوں کی بھرپور تائید کرتا ہے، چنانچہ دعا اس روحانی نظام کا ایک موبائل سسٹم ہے جو ہمارے انسانی مشکلات کا واحد حل ہے۔

دعا کے فلسفہ کی پر پیچ وادیوں میں الجھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے کے

فائدہ پہنچا سکتا ہے! اور پہنچاتا ہے!!

(۲) سورۂ مبارکہ ابراہیم کی آیت ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ﴾

(سورۂ ابراہیم / آیت ۳۲)

''اور اُس نے تمہارے لیے کشتیوں کو مسخر کر دیا ہے کہ اُس کے حکم سے سمندروں میں رواں دواں رہیں۔''

یہ جُملہ مخلوقات خصوصاً انسان پر ربِّ اکبر کے متعدد الطاف وعنایات کو شمار کراتے ہوئے ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں مظاہرِ قدرت وحکمت اور مناظر فطرت کی طرف اس زاویۂ فکر سے توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ اگر خالقِ متعال کی حکمت کارفرما نہ ہوتو بھلا انسان کو جو سہولتیں اس گہوارۂ فطرت، یا آغوشِ رحمت میں میسر ہیں وہ کیوں کر حاصل ہو سکیں گی؟

سطحِ سمندر پر کشتیوں کا چلنا ہمارے لیے کتنا مانوس، کس قدر پر کشش، کتنا مسرت بخش اور کس قدر لطف انگیز ہے! لیکن غور کیجیے کہ سیال پانی کی جو فطرت ہے، سمندروں اور دریاؤں میں پانی کے بہاؤ اور ٹھہراؤ کے جو فطری اصول ہیں، مرکزِ زمین سے لے کر محیطِ فلک الافلاک تک جو قوّتوں اور کششوں کا تانا بانا ہے، پانی کی لہروں اور ہواؤں کی موجوں میں جو تال میل ہے، اگر یہ کچھ نہ ہوتو بھلا کشتیوں کو پانی میں ڈوبنے سے کون بچا سکتا ہے؟ اور کون ان قوتوں اور کششوں کو ایجاد کر کے انہیں یہ کمالِ توازن اور یہ نظم ونسق عطا کر سکتا ہے؟ سوائے اسی معبودِ برحق اور خالقِ متعال کے جس نے اِسے پہلی بار بنایا ہے اور جو اس پورے نظا کو درہم برہم

کر کے دوبارہ بھی بنا سکتا ہے اور وہ یقیناً ایسا کرے گا۔

سورۂ ابراہیم کی مُحولہ بالا آیت میں کشتی کے مسخر کرنے کی بات کہی گئی ہے اور سورۂ مبارکۂ جاثیہ (سورہ ۴۵) کی ایک آیت میں سمندروں کو مسخر کرنے کا مضمون بیان ہوا ہے۔

﴿اللہ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ البَحرَ لِتَجرِیَ الفُلکُ فِیهِ بِاَمرِهِ﴾

(جاثیہ آیت ۱۲)

''اللہ ہی نے تمہارے لیے سمندروں کو مسخر کیا ہے تا کہ اس میں کشتیاں چل سکیں''۔

آیت کا اس کے بعد کا حصہ بھی قابلِ غور ہے:

﴿وَلِتَبتَغُوا مِن فَضلِهِ وَ لَعَلَّکُم تَشکُرُونَ﴾

''تا کہ تم اُس کے فیضانِ کرم کو پا سکو اور اس کے شکر گزار بنو!''

(۳) سمندروں اور کشتیوں کی تسخیر کے ساتھ ہی دُعا میں تسخیرِ ہوا کا بھی ذکر ہے اور یہ بھی قرآنِ مجید کی ایک سے زائد آیتوں میں مذکور ہے۔ سورۂ صٓ کی ۳۸ ویں آیت ہے:

''فَسَخَّرنَا لَهُ الرِّیحَ تَجرِی بِاَمرِهِ حَیثُ اَصَابَ''

یہ جناب سلیمان علیہ السلام کے تذکرے کے ضمن میں ہے کہ: ''ہم نے ہواؤں کو ان کے لیے مسخر کر دیا کہ انہیں کے حکم سے وہ جہاں چاہیں چلیں۔''

(۴) سورۂ مبارکۂ انعام کی ایک آیت (آیت ۹۶) میں ہے:

﴿فَالِقُ الاِصبَاحِ وَجَعَلَ الَّیلَ سَکَناً وَ الشَّمسَ وَ القَمَرَ

حُسبَاناً﴾

''وہی صبح کو پیدا کرنے والا ہے اور اسی نے رات کو ظرفِ سکون اور سورج اور چاند کو پیمائش کا اوزار بنایا ہے۔''

قرآنِ مجید میں ''فَالِقُ الاِصْبَاحِ'' کی ترکیب اسی ایک مقام پر آئی ہے۔ دعائے افتتاح میں یہ صفتِ باری دوبار دہرائی گئی ہے۔ ایک اِس فقرے میں ایک اِس کے ذرا بعد کے فقرے میں۔

''فالق الاصباح'' کے لفظی معنی تو یہی ہیں کہ ''صبح کا نور شگافتہ کرنے والا''۔ ''شگافتہ کرنے'' کا لفظ یہاں پر نہ صُبح سے تعلق رکھتا ہے نہ روشنی ونور سے، بلکہ جیسے اردو میں ''پو پھٹنا'' یا ''پو پھوٹنا'' بولتے ہیں، اسی طرح عربی میں ''فَلَق'' کا لفظ اس کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ رات کی تاریکی شگافتہ ہوتی ہے تو صبح کا اجالا پھیلتا ہے۔ ۱۴۲

لیکن اگر ''پو پھٹنے'' کا ذکر بطورِ استعارہ کیا جائے تو پھر کسی بھی تاریکی یا ظلمت کے پردے کے چاک ہونے اور نُور کے ظاہر ہونے کے لیے بول سکتے ہیں۔

بعثتِ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو اُجالا پھیلا وہ بھی اُسی ''فالق الاصباح'' کا لطفِ عظیم تھا اور اب حضرت قائم آلِ محمدؑ کے ظہور سے جو روشنی پھیلے گی وہ بھی اُسی ''فالقِ اصباح'' کا احسانِ عظیم ہوگا۔ عجب نہیں کہ دعائے افتتاح میں جو یہ صفت باری دوبار آئی ہے اس کی تاویل یہی ہو!

حافظؔ نے اپنی عرفانی شاعری میں بھی اِس ترکیب سے کیا حسین استفادہ کیا ہے۔

سواد روئے تو تفسیرِ جاعلُ الظلمات
بیاضِ روے تو تبیانِ فالقُ الاصباح

اسی طرح ایک اور شعر میں انتہائی وارفتگی کی کیفیت کے ساتھ یہ زمزمہ زبان پر لائے ہیں:

کدام طاعتِ شایستہ آید از منِ مَست
کہ رنگِ صُبح ندانم زِ فالقُ الِاصباح

''دیّان الدِین'' کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ خوب اچھی جزا یا نہایت معقول، منصفانہ اور سچی جزا دینے والا ہے، اور یہ بھی کہ وہ دل کھول کر نہایت فیاضی کے ساتھ کسی نادیدہ سے عمل کی بھی بہت زیادہ جزا دینے والا ہے۔ اور یہ بھی کہ وہی حقیقۃً ''دین'' کو دین بنانے والا ہے۔ وہی قوت وقدرت وحکمتِ آئین سازی کا سرچشمہ ہے۔ کسی بھی قانون کو اعتبار بخشنے کی حیثیت بس اُسی کو حاصل ہے اور وہی اُس کے نفاذ کی قوت بھی رکھتا ہے۔ اور اسی حیثیت سے اس نے ارشاد فرمایا ہے:

''اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الاِسْلَام''

یا یہ ارشاد کہ:

﴿شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوحاً وَالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِہٖ اِبْرٰھِیْمَ وَ مُوْسٰی وَ عِیْسٰی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَ لَا

تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (سورہ شوریٰ ۴۲/آیت ۱۳)

''اس نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کی اس نے نوح کو وصیت کی تھی، اور جس کی تمہیں وحی کی ہے اور جس کی وصیت ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ سے کی تھی کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔''

یارب اکبر کا یہ ارشادِ گرامی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾

''آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا!''

☆☆☆☆☆

(۱۱)

ثنائے حلم وسپاسِ رحمت

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰى عِلْمِهِ بَعْدَ حِلْمِهِ

وَالْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰى عَفْوِهِ بَعْدَ قُدْرَتِهِ

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى طُوْلِ اَنَاتِهِ فِي غَضَبِهِ

وَهُوَ قَادِرٌ عَلٰى مَايُرِيْدُ!

"تمام حمد ہے اسی معبود کی کہ وہ (اپنے بندوں کی نافرمانیاں) جانتے ہوئے بھی بردبار ہے۔

تمام حمد ہے اسی معبود کی جو (انتقام وسرزنش کی) قدرت رکھتے ہوئے معاف کرتا ہے!

تمام حمد ہے اسی معبود کے لیے جو بہت دیر میں غضب فرماتا ہے جبکہ وہ جو چاہے کرسکتا ہے!"

حمد وثنائے الٰہی کے اس فقرے میں اردو والوں کے لیے صرف ایک لفظ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے وہ ہے لفظِ "اناتِہٖ" ورنہ حِلم، علم، عفو، قدرت، طول، غضب وغیرہ تمام الفاظ نہ صرف یہ کہ مانوس ہیں بلکہ اردو کے محاورات اور روز مرہ میں شامل ہیں۔ لیکن ذرا سی چھان بین کیجیے تو معلوم ہو جائے گا کہ لفظ "اناۃ" کے مادّے سے بھی اردو زبان میں ایک لفظ مستعمل رہا ہے۔ "تَاَنّي" صاحبِ لغاتِ کشوری مولوی سید تصدق حسین رضوی اور صاحبِ فرہنگِ عامرہ محمد عبد اللہ خاں خویشگی نے اِس لفظ کو اپنے اپنے لغت میں جگہ دی ہے۔ اور حیرت کی بات ہے صاحبِ مہذب اللغات نے اِسے اپنے ضخیم لغت میں جگہ نہ دی۔

بہر حال تأنی یعنی تاخیر یا تاخیر سے کام لینا، اور اَناۃ یعنی بردباری، حِلم، غصہ اور غضب کے اظہار میں تحمُّل اور تاخیر سے کام لینا، اِن دونوں الفاظ کا مادّہ اَنیٰ یَنِی ہے جس سے تَـاَنّٰی یَتَئَنی اور استأنیٰ یَسْتانِی وغیرہ ابواب عربی میں مستعمل ہیں۔

مضمون و مفہوم کے لحاظ سے دعائے افتتاح کے یہ فقرے ربّ کریم کے حلیم، صبور، عَفُوٌّ، رؤف اور منّان جیسے اسما و صفات کے برکات و تجلیات کی طرف مُلتفِت کرتے ہیں۔

اس کے ضمن میں مختلف اور متعدد زاویوں سے گفتگو ممکن ہے لیکن ہم صرف ایک نکتہ کو پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

اکثر و بیشتر یہ سوال سامنے آتا رہتا ہے کہ ربِّ اکبر آخر ظالموں کی رسی دراز کیوں فرماتا ہے؟ گنہگاروں کو فرصتِ گناہ اور مہلتِ زندگی ہی کیوں میسر ہوتی ہے؟

یہ سوال کبھی مباحثِ خیر و شر کے ضمن میں سامنے آتا ہے تو کبھی مسائلِ جبر و اختیار کے ذیل میں اور کبھی بغیر کسی خاص فلسفیانہ یا کلامی عنوان کے محض جذباتی انداز میں ذہنوں کو جھنجھوڑتا ہے۔ علما اور متکلمین نے اِس پر مختلف زاویوں سے تقریریں کی ہیں۔ لیکن ہم صرف قرآن مجید کی آیتوں پر اس بحث کا دار و مدار رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ حلم ایک ممدوح صفت ہے، اور علمِ اخلاق و نفسیات کی روشنی

میں دیکھا جائے تو یہ شجاعت کے اقسام یا مراتب یا مظاہر میں شمار ہوتی ہے۔ مافوقِ طبیعت و مافوقِ تجزِ دحقیقت کے تعلق سے بھی حلم علم وقدرت کے مظاہرِ جمالی میں سے ہے۔

انسان پہلے سے مُطلع ہوئے بغیر کسی بُرائی یا مضرّت سے دوچار ہونے پر تحمل سے کام لیتا ہے تو اسے حِلم کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر علم واطلاع رکھتے ہوئے مضرّت کو برداشت کرتا ہے تو اسے کبھی حلم قرار دیتے ہیں اور کبھی اسے قطعاً کوئی ممدوح صفت قرار نہیں دیتے بلکہ اس کے برعکس قابلِ مذمت خصوصیت قرار دیتے ہیں۔

ربّ اکبر کے صِفات کے تعلق سے ظاہر ہے کہ علم واطلاع کے نہ ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور علم ہوتے ہوئے، اپنے بندوں کی نافرمانیوں کو جانتے ہوئے بردبار رہنے کو مطلقاً ممدوح اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ اُس کی اس طرح کی بُردباری سے خود اُسے کوئی بھی نقصان پہنچنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اور اس کی بردباری سے دوسروں کو بھی ہمیشہ فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے۔ اور اس کے مخلص یا مومن بندوں کے حق میں، کہ جن سے خطاؤں کا صدور یقیناً نادانی، سہو یا پھر کسی طرح کے اضطرار کی کیفیت ہی میں ہوتا ہے، یہ حِلم و بُردباری بہر حال ممدوح و مستحسن ہے۔ لیکن جہاں تک کافروں، مشرکوں اور کھلے ہوئے ظالموں، فاسقوں کا سوال ہے، ان کے معاملے میں رب کریم کا تامُّل و تانّی اختیار فرمانا بندوں کی ناقص عقلوں میں نہیں آتا۔ اور اتنی آسانی سے یہ بات عقل میں آ بھی نہیں

١٤٨

سکتی۔ بقول شیفتہ ع

واجب کی حکمت آئیگی ممکن کی عقل میں کیا؟

اس لیے اس سوال کا جواب اور اس حکمت کا انکشاف ربِّ اکبر نے خود ہی فرما دیا ہے:

﴿وَلا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ط اِنَّمَا نُمْلِیْ لِیَزْدَادُوْا اِثْماً وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ﴾

(سورۂ آلِ عمران آیت ۱۷۷)

''کفر اختیار کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم انہیں ڈھیل دے رہے ہیں اس میں ان کے لیے کوئی بھلائی ہے بلکہ ہم صرف اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ جتنا گناہ کرسکیں کرلیں، ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے!''

یہ وہی آیت ہے جسے معصومۂ کربلا عقیلۂ بنی ہاشم ام المصائب زینب بنتِ امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے دربارِ شام کے سامنے تلاوت فرمایا تھا۔

اسی طرح سورۂ قلم میں ارشاد ہوا:

﴿وَاُمْلِیْ لَهُمْ اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ﴾

''اور ہم انہیں ڈھیل دے رہے ہیں، یقیناً ہمارا منصوبہ مضبوط ہے۔''

سورۂ بقرہ کی اس آیت سے بھی اس موضوع پر بہت روشنی پڑتی ہے:

﴿اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ﴾

''خدا خود اُن کی ہنسی اڑا رہا ہے کہ اُنہیں سرکشی میں ڈھیل دیے ہوئے ہے

بجائے خود دعا سے ہاتھ اٹھا لینے والے حضرات ہماری نظر میں ان جھکّی قسم کے افراد سے کم نہیں ہیں جو موبائل پر بات شروع کرنے سے پہلے اس کا سسٹم سمجھنے کے چکر میں موبائل کا استعمال ہی ٹھکرا دیں یا اتفاقاً کسی تکنیکی خرابی کی وجہ سے سسٹم کو برا بھلا کہنے لگیں یا خود کارڈ رکھنا بھول جائیں یا غلط الٹے سیدھے نمبر ملانا شروع کردیں اور موبائل سسٹم کو غلط دھوکا فریب جیسی لفظوں سے نوازنا شروع کردیں، ایسے تنگ مزاج تحقیق پسند ہٹی طبیعت والے افراد کو ان کی شکایات، ان کے شکوک دور کرتے ہوئے اکثر دعاؤں کے نہ قبول ہونے یا تاخیر سے قبول ہونے کے اسباب بتاتے ہوئے دعاؤں سے مانوس کرنا اور دعا مانگنے پر راضی کرلینا آسان کام نہیں۔ دعا کا فلسفہ اس کی تنقیح کتنے علوم سے وابستہ ہے اس سطح پر کسی کم علم کے ہاتھوں دعا کی وضاحت ممکن نہیں، خود دعا کی چاشنی سے نابلد دعا کے لیے زبان ہی نہیں کھول سکتا۔

زیرِ نظر یہ بیش بہا بلکہ بے بہا کارنامہ بلکہ شاہکار خود اپنی جلالت وعظمت کی بلندیوں پر جس قدر روشنی ڈال رہا ہے خود بخود ٹھہری ولازمی طور پر مصنف علاّم کی علوم مرتبت کا بھی عکاس ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ اگر کتاب سے جناب مصنف علاّم کا اسم گرامی حذف کر کے کتاب کسی باذوق اور قدرداں کو تھمادی جائے تو وہ جب تک جناب مصنف علاّم کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا چین سے بیٹھ نہیں سکتا، کیوں نہ ہو یہ موضوع ہی ایسا ہے کہ جس کے لیے آیت اللّٰہی فکر حجۃ الاسلامی طریق استدلال محققانہ اسلوب ادا کے بغیر ایک قدم آگے بڑھانا مشکل ہے، لائق مبارکباد ہیں

اور یہ اندھے ہو کر بہک رہے ہیں!''

یہ اور اسی قبیل کی دوسری آیتوں کے پیغامات پر غور کر کے اس طرح کے سوالات یا شبہات کا قلعہ قمع کیا جا سکتا ہے۔ اور کافرین کے بارے میں تدبیر و حکمتِ الٰہی کا، نیز مؤمنین و مخلصین کے حق میں اس کی رحمت و رأفت کا تھوڑا سا ادراک کیا جا سکتا ہے۔

فالحمد لله علی حِلمِه بعدَ عِلمه...!!!

☆☆☆☆☆

(۱۲)

سپاسِ خالق و رزّاقِ ماورائے نظر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ خَالِقِ الْخَلْقِ بَاسِطِ الرِّزْقِ فَالِقِ الْاِصْبَاحِ ذِي الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ وَالْفَضْلِ وَالْاِنْعَامِ اَلَّذِي بَعُدَ فَلَا يُرٰى وَقَرُبَ فَشَهِدَ النَّجْوٰى تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى.

''تمام حمد ہے اسی معبود کے لیے جوتمام خلقت کا پید کرنے والا ہے، روزی رساں ہے، سویرے کا نور کاڑھنے والا ہے، بزرگ ہے اور بزرگی عطا کرنے والا ہے، پرفیض ہے اور نعمتیں بانٹنے والا ہے، جس نے ایسی دوری اختیار کی ہے کہ نظر نہیں آتا اور جو ایسا نزدیک ہے کہ سرگوشیاں بھی سنتا ہے، بابرکت ہے اور بلند ہے۔''

☆☆☆

قرآن مجید میں جس کا بنیادی موضوع ہی ''توحید'' ہے اور حیات و کائنات سے متعلق تمام مضامین اسی ایک موضوع سے نکلتے چلے گئے ہیں، ایک مقام پر کہا گیا ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ﴾ (لقمان ۲۷)

''روئے زمین پر جتنے درخت ہیں سب قلم بن جائیں اور سارے سمندر روشنائی بن جائیں، اس میں سات سمندر اور بھی مل جائیں، تب بھی اللہ کی باتیں (اُس کے اسماء وصفات، اُن کے برکات وتجلیات) ختم ہونے والی نہیں...!''

اسی مضمون کو ہمارے خدائے سخن میر تقی میر علیہ الرحمہ نے اپنی اردو میں

اس طرح ادا کیا ہے۔

اشجار خامہ ہوویں جو آبِ سیہ بحار

لکھنا نہ تو بھی ہو سکے اُس کی صفات کا!

حمد و ثنائے الٰہی کے تسلسل میں دعائے افتتاح کا یہ دسواں فقرہ ہے۔ جس میں اس کی خالقیت، رزّاقیت، نورانیّت، اُس کے جلال و بے نیازی کے ساتھ اِکرام و نوازش، اُس کے جود و سخا، اُس کی بے انتہا بلندی اور اُس کی بے پایاں قربت کی عاجزانہ تحسین اور شکر گزاری ہے!

بلا شبہ وہی تمام ہست و بود کا خالق ہے۔ مَخلوقات میں سے کوئی بھی شے خود بخود خلق نہیں ہوئی ہے۔ نہ کوئی اس کے علاوہ یا اُس کے ساتھ مل کر خلق کرنے والا ہے۔ جس کے پاس بھی کوئی تخلیقی ہنر ہے کوئی فرزندِ آدمؑ ہو کہ دل بندِ مریم، سب کو اسی پروردگار کی عطا ہے۔ حضرت مسیح کی گواہی ہے:

﴿اِنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ● وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ...﴾

''میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا ہوں پھر اس میں دَم کرتا ہوں تو وہ پرندہ بن جاتا ہے اللہ ہی کے اذن سے! اور میں اندھے اور کوڑھی کو شفا دیتا ہوں اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں اللہ ہی کے اذن سے!!''

اُس کے اذن کے بغیر کوئی نہ ماں کسی بچے کو جنم دے سکتی ہے نہ کوئی زمین

کوئی پرِ کاہ روئیدہ کر سکتی ہے نہ کوئی بادل ایک قطرۂ آب ارزانی کر سکتا ہے... نہ کوئی دل کوئی جذبہ پیدا کر سکتا ہے نہ کوئی ذہن کسی فکر کو پروان چڑھا سکتا ہے نہ کوئی قلم کوئی حرف لکھ سکتا ہے نہ کوئی لبِ اظہار کوئی آواز اٹھا سکتا ہے!

یہ سب کچھ جو دنیا میں ہو رہا ہے اُسی کی عطا کردہ تخلیقی صلاحیتوں سے ہو رہا ہے اور اس تقریر سے کوئی یہ بھی نہ سمجھ بیٹھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اُسی کی ''مرضی'' کے مطابق ہو رہا ہے۔ کوئی نظامِ جبر قائم ہے! ہرگز نہیں یہ نظامِ اختیار و ''اذن'' ہے، یہ نظام رحمت و رأفت ہے۔ اُسی کی عطا کردہ صلاحیتوں کو اس کے بندے اُسی کی مرضی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں لیکن وہ کریم نہ اُن سے اُن کا وجود سلب کرتا ہے نہ اُن پر اُن کا رزق تنگ کرتا ہے!

وہ ایسا ''باسط الرزق'' ہے کہ دوست دشمن، مقرُّ منکر، مؤمن کافر سب کو اُن سب کی ضرورتوں کے مُطابق رزق عطا کرتا ہے۔ کوئی اس کا کلمہ پڑھے چاہے نہ پڑھے شُکر گزار ہو یا کفرانِ نعمت کرے!

ہاں وہ ''فالقُ الِاصباح'' بھی ہے۔ ہر طرح کی تاریکیوں کو دُور فرماتا رہتا ہے۔ نُور بکھیرتا رہتا ہے۔ کوئی ہدایت نہ پائے اپنی آنکھیں ہی بند کیے رہے اور بند ہی کیے رہے یہ اور بات ہے۔

اس سے قبل بھی ''فالق الاصباح'' کی تعبیر گزر چکی ہے۔ سیاقِ عبارت سے وہاں پر اس کا مفہوم نورِ ایجاد و خلق و تکوین کے اِفاضہ سے متعلق معلوم ہوتا ہے یعنی وجودی (Ontological) یا کونیاتی (Cosmological) ہے۔ مُناسب

154

یہ ہے کہ دونوں مفاہیم شاملِ مراد سمجھے جائیں۔ لیکن اس مقام پر خلق و بسطِ رزق کے سیاق میں یہ نورِ ہدایت آشکار کرنے کے مفہوم کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ یعنی جہل کی تاریکی شگافتہ کر کے نورِ علم پیدا کرنے والا۔ یہ مفہوم اس لیے قرینِ مُراد معلوم ہوتا ہے کہ علم و ہدایت بھی ''رزق'' ہے! علم غذائے روح ہے اور ''رزق'' کا مفہوم صرف غذائے مادّی تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام ضروریاتِ زندگی کو شامل ہے اور اس اعتبار سے بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اُس فالق الِا صباح کا ایک لُطفِ خاص تھا۔ انشاء اللہ ظہورِ خاتم الوصیین حضرت مہدی منتظر علیہ السلام بھی اُسی ''فالق الاصباح'' ہی کے لطف و کرم سے ہوگا۔ کہ وہی بے نیاز صاحبِ جلال اپنے بندوں کی نیاز مندیوں سے واقفیت رکھتا ہے اور انہیں رفع کرتا ہے اور یقیناً وہی اپنے کرم اور نوازش سے اضطراب و حیرت اور ظلم و جور کو دور فرمائے گا اور اپنا فضل و انعام فرمائے گا۔

''**ذوالجلال و الاکرام**'' کہنے کے بعد ''**الَّذِی بَعُدَ فَلا یُریٰ اور قَرُبَ فَشَهِدَ النَّجویٰ**'' کہنا اس کے جلال واکرام کے مظاہر کا تذکرہ کرنے کے مترادف ہے۔

اس کا جلال ہی تو اُس کا سب سے بڑا حجاب ہے! عرفانی چشم و گوش اور دل کا ہوش رکھنے والے اس کے جلال کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں لیکن کلامی زاویۂ فکر و نظر رکھنے والوں کے لیے مسئلہ رُویت بڑا ہی پیچیدہ اور دشوار مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے ''الذی بعد فلا یُریٰ'' کا فقرہ ذہن کو اس مشہور کلامی بحث کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

رُویتِ حضرت باری تعالیٰ عز اسمہ وجل شأنہ کا مسئلہ قرآنِ مجید کی ایک آیت کے پیغام کو درست سمجھنے یا نہ سمجھ پانے سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ سورۂ مبارکہ قیامت کی ایک آیت ہے جس پر بحث ونظر کی ایک قیامت برپا ہے۔ آیت کو اس کے پورے سیاق وسباق کے ساتھ تلاوت کیجیے اور لب ولہجۂ قرآن کو سمجھیے تو مشکل یہیں پر حل ہو سکتی ہے لیکن اسے کیا کیجیے کہ آیات و پیغاماتِ الٰہی کو سمجھنے کے لیے اُس کے صحیح طریق کار اور صحیح مآخذ سے استفادہ نہیں کیا جاتا تو مشکلات حل ہونے کی بجائے بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔

ارشادِ قرآنی یہ ہے کہ:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ

اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ

تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ﴾

''کچھ چہرے اُس دن کھلے ہوئے ہوں گے

اور وہ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے

اور کچھ چہرے مرجھائے ہوئے ہوں گے

اس اندیشے میں کہ اُن کے پرخچے کر دیے جائیں گے''

آیتوں کا منطوق ومفہوم دونوں بہت صاف ہے گہنہ گار عذاب کے اندیشے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے اور نیکو کار اپنے رب سے امیدِ جزا ونعمت لگائے

ہوئے ہوں گے۔ کسی کی طرف دیکھنا اُس کی ذات سے امید لگانے کے لیے بولتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں بھی کسی کی طرف ''دیکھنے'' کا لفظ استعمال ہو وہاں حقیقی معنی میں اُسے دیکھنا مراد و مقصود ہو۔ پھر جبکہ جسم و جسمانیات سے اُس کا مُنزَّہ ہونا ثابت اور غیر اختلافی ہے۔ مکان و مکانیات، زمان و زمانیات، سَمت و محاذات اور چشمِ ظاہر سے حسبِ ظاہر دیکھنے کے تمام شرائط ہی مُنْتَفِی ہیں تو پھر ''دیدار'' کے امکان یا وقوع پر اصرار کا محل ہی کیا رہ جاتا ہے۔ اور جہاں تک چشمِ باطن سے حسبِ حقیقت رویت کی واقعیت کا ماجرا ہے تو وہ اُس قیامت پر کہاں موقوف ہے!

ع اُس نے کب کِس سے کسی بھی طرح کا پردہ کیا؟

یوں سوچیے تو جتنے شرائطِ رویت علمِ مَنَاظِر میں مقرر ہیں وہ سب تو آج بھی اور ہر لحظہ و ہر آن اور ہر گوشۂ امکان میں، متحقق ہیں کیوں کہ حضرتِ حق سبحانہ و تعالیٰ نے خود ہی فرمایا ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾

''وہ تو تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو''

اور یہ کہ

﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْ فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾

تم جدھر بھی رخ کرو اللہ تمہارے روبرو ہے!

اور یہ کہ

﴿وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ﴾

''اور ہم اس سے (انسان سے) رگِ گردن سے زیادہ قریب ہیں۔''

لیکن اِس کے باوجود وہ چشمِ ظاہر سے حسبِ ظاہر نظر نہیں آتا، اور حقیقت حال یہی سامنے آتی ہے کہ ''الذی بعدَ فلایُریٰ''۔

اس حقیقتِ حال پر میر انیس نے کیا عمدہ رباعی ارشاد فرمائی ہے ۔

تِلی کی طرح نظر سے مستور ہے تُو
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگِ گلو سے اُس پر یہ بُعد
اللہ اللہ کس قدر دُور ہے تو!

دیوانِ کلامِ اسلامی یعنی تجریدِ محقق طوسیؒ میں تو اس مسئلے کو جس اصلِ اصیل اور اساسِ متین ورصین پر حل وفصل کیا گیا ہے وہ صرف ''وجوب الوجود'' ہے اور حق و انصاف کی بات یہ ہے کہ یہی حکیمانہ اساس حقیقۃً اس مسئلے کا حل پیش کر دیتی ہے، محقق طوسیؒ کے یہ ریزہ ہائے الماس ملاحظہ فرمائیں:

''وَوُجوبُ الوجودِ يَدُلُّ علىٰ سَرمَدِيَّتِهِ وَ نَفيِ الزَّوائِدِ و الشَّرِيْكَ وَالمثلِ و التَّرکیبِ بِمعَانِيهِ والضِدّ و التحيُّزِ والحُلُولِ وَ الاتّحادِ وَ الجهةِ و حُلولَ الحوادِثِ فِيهِ، وَ المعَانِیُ الاحوالِ والصِّفاتِ الزائِدَةِ عَيناً والرُّؤيَةِ...''

اس عبارت کے پورے ترجمے کی یہاں پر حاجت نہیں ہے۔ توجہ صرف

اس نکتہ کی طرف دلانی ہے کہ جنابِ خواجہ نے رویت کو بھی دوسرے تمام صفاتِ سلبیہ یا صفاتِ جلالیہ کے زمرے میں رکھتے ہوئے ایک صفتِ وُجوب کو اساس قرار دیتے ہوئے حضرتِ اقدس الٰہی سے مستبعد قرار دیا ہے۔ اور اس کے بعد کی عبارت میں خصوصیت کے ساتھ مسئلہ رویت کے مؤیدین کے دلائل کا جواب تحریر فرمایا ہے۔

"وَسوَالُ موسیٰ لِقوْمِه والنظر لایَدُلُّ علیٰ الرّوية مَعَ قَبُوْلِ التأوِيلِ و تَعْلِيْقُ الرُّؤْيَةِ باستقرارِ المُتحرِّكِ لا يَدُلُّ عَلیٰ الاِمْكانِ!"

حضرتِ واجب الوجود کا چشمِ سر سے نظر آنا ناممکن ہے۔ اور جنابِ کا اپنی قوم کے لیے حضرت باری تعالیٰ سے رویت کی درخواست کرنا یا آیت قرآنی میں لفظ نَظَر کا استعمال و اطلاق جبکہ اس کی تاویل ممکن ہے، بلکہ ظاہر ہے، رویت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اور اسی طرح رویت کو مُتحرک پہاڑ کے استقرار پر معلّق و مشروط قرار دینا بھی امکانِ رویت کی دلیل نہیں بن سکتا۔"

اس مختصر عبارت میں محقق طوسیؒ نے حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے بچشم سر رویت کے قائلین کو تشفی بخش جوابات دے دیے ہیں۔ بطورِ استدراک یہ عاجز و قاصر صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہے کہ قائلینِ رویت "التماسِ موسیٰ" کو دلیل بناتے ہیں جوابِ ربِّ موسیٰ پر ذرا بھی کان نہیں دھرتے کہ فرمایا: ﴿لَنْ تَرَانِیْ﴾ مجھے بچشمِ سر کبھی نہیں دیکھ سکتے!!

ہاں! اس بحث کو پھر اس نکتے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہ وہ چشمِ ظاہر (بہ چشمِ سر) حسبِ ظاہر کبھی بھی نظر نہیں آسکتا، البتہ نگاہِ باطن یا دیدۂ دل سے کبھی بھی

ہمارے تازہ دم مفکر بھرپور محقق، دریائے معرفت کے شناور، فکر و آگہی کے میدان کے شہسوار جواں سال عبقری حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ عقیل الغروی دام فضلہ جنہوں نے ان بگڑے مزاج ناقدینِ دعا کو اپنی حیرتناک فکر اور دلچسپ طریق استدلال سے یہ بات سمجھا دی کہ دعا کا فلسفہ ضرور سمجھیے لیکن جب تک سمجھ میں نہ آئے اس عرصہ میں دعاؤں کے فیوض سے محروم نہ رہیے، کیونکہ کنارہ کشی عقلمندی نہیں ہے، حقیقۃً حضرت علامہ کا یہ کارنامہ معمولی نہیں ہے کیونکہ دعا کے موجیں مارتے اتھاہ سمندر کی غواصی کے تقاضے اور ہیں اور نامانوس ذہنوں کو دعا سے مانوس کر لینے کے تقاضے اور ہیں۔ بیک وقت دونوں کا حق ادا کر دینا بہت بڑی بات ہے، کیوں نہ ہو قابلیت پھر قابلیت ہے جو عصبیت کی گرم بازاری میں بھی اپنا لوہا منوالیتی ہے۔ میری بارگاہِ احدیت میں دعا ہے کہ معبود حقیقی مصنف علاّم کو بلندیوں کی ان حدود تک پہونچا دے جہاں طائر خیال کی رسائی بھی مشکل ہو۔ امین!

سید محمد شاکر امرہوی

ممتاز الافاضل

مدرس جامعہ ناظمیہ لکھنؤ

۱۱ر جنوری ۲۰۰۴ء

روپوش نہیں رہتا جبھی تو مولائے موحدین امیر المؤمنین علیہ السلام نے ذِعلبِ یمانیؒ سے فرمایا تھا:

''اَفَاَعۡبُدُ مَالَا اَریٰ؟''

''کیا میں ایسے رب کی عبادت کرتا ہوں جسے دیکھتا نہیں ہوں؟''

آپ کا یہ فقرہ مختلف روایتوں میں مختلف الفاظ میں نقل ہُوا ہے، لیکن تمام روایتوں کو پیشِ نظر رکھ کر فی الجملہ اس واقعہ اور مکالمہ کی تصدیق ضرور کی جاسکتی ہے۔

اب اس سلسلۂ بحث ونظر سے قطعِ نظر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر غور کیجیے۔ میر انیسؒ کی ایک اور انتہائی لطیف رباعی پڑھیے اور وجدانِ عشق وعرفان پر وَجد کیجیے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''مَنۡ رَآنِی فَقَدۡ رَیَ الۡحَقَّ''

''جس نے مجھے دیکھا اُس نے حق کا دیدار کیا!''

اور میر انیسؒ نے فرمایا:

یا ختمِ رُسل مَستِ مئے الفت ہیں!
قدموں کی قسم کہ عاشقِ صورت ہیں!
دیکھا جو حضورؐ کو، خدا کو دیکھا
اِس وجہ سے ہم بھی قائلِ رُویَت ہیں!!

☆☆☆☆

(۱۳)

حمدِ یگانہ و یکتا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَيْسَ لَهُ مُنَازِعٌ يُعَادِلُهُ

وَلَا شَبِيْهٌ يُشَاكِلُهُ

وَلَا ظَهِيْرٌ يُعَاضِدُهُ

قَهَرَ بِعِزَّتِهِ الْاَعِزَّاءَ

وَتَوَاضَعَ لِعَظَمَتِهِ الْعُظَمَاءُ

فَبَلَغَ بِقُدْرَتِهِ مَايَشَاءُ

''تمام حمد ہے اسی معبود کی جس کے برابر کا اس سے کوئی جھگڑنے والا نہیں ہے۔

نہ اس کے جیسا کوئی اُس کا مثل و نظیر ہے

نہ اس کو سہارا دینے والا کوئی پشت پناہ!

اس نے اپنی شان سے تمام عزیزانِ دہر کو زیر کیا

اور تمام بزرگانِ دہر نے اس کی بزرگی کے سامنے فروتنی اختیار کی

اور اس نے اپنی قدرت سے جو چاہا کیا!''

اس فقرے کے الفاظ زیادہ بحث و تحقیق کے متقاضی نہیں معلوم ہوتے۔ مضمون اصطلاحی طور پر ''توحیدِ تنزیہی'' ___ نفیِ شرک ___ وحدت مطلقہ اور وحدتِ حقہ ہی کے اثبات واعتراف کا ہے۔ معبودِ برحق کی یکتائی اور یگانگی کا اِس سے مشابہ بیان اس دُعا کے پانچویں اور چھٹے فقروں میں گزر چکا ہے۔ انسان عقل کی بے حاصلی اور بے حوصلگی، نیت کی کھوٹ، دل کی ویرانی، دارِ دنیا یا دارِ غفلت میں انہماک

اور غفلت شعاری، بے ضمیری، غرض بہت سے اسباب کی بنا پر حقیقتِ توحید کو درک و دریافت کرنے سے عاجز یا قاصر رہ جاتا ہے اور طرح طرح کے مشرکانہ خیالات میں گرفتار ہوتا رہتا ہے۔ اسی لیے اہلِ تحقیق اربابِ توحید گوناں گوں اسالیب میں بار بار شرک کی نفی اور ربِ اکبر کی یکتائی بیان کرتے رہتے ہیں۔ پھر کچھ یہ بھی ہے کہ جب عرفان و عشق کمال پر ہوتا ہے تو ذکرِ محبوب میں زیادہ سے زیادہ لطف محسوس ہوتا ہے بقولِ حضرت آثر لکھنوی:

دَخل ہے اس کو بہت کچھ مرے تڑپانے میں
وہ جو لذت ہے ترے نام کے دہرانے میں

اور کچھ یہ بھی ہے کہ ربِ اکبر ہی نے اپنے مخلصین کو حمد و ثنا، ذکر و تسبیح، توصیف و تمجید، شکر و سپاس، دعا اور مناجات کے گوناگوں عارفانہ اسالیب میں اپنی وحدانیت کے بیان کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائی ہے تاکہ ان فقروں میں الفاظ کی ذرا ذرا سی ردوبدل اور مضامین میں تھوڑے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اُن مغالطوں کے کافی و شافی جوابات فراہم ہو جائیں جو مختلف مُشرکانہ اور ملحدانہ مذاہب رکھنے والے طرح طرح کی تشکیک اور توہمات کی شکل میں پیش کرتے رہتے ہیں۔

اسی کے ساتھ اس کے مختلف ''صفات'' کا بیان بھی ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً اس دُعا کے آغاز سے اب تک اس کی چند صفتوں کا تذکرہ ہوا۔ اَب اس فقرے میں ایک اور صفت کا تذکرہ سامنے آیا اور وہ صفت ''قہاریّت'' ہے۔

"قَهَرَ بِعِزَّتِهِ الْاَعِزَّاءَ" کا جملہ ربِّ اکبر کے اسم گرامی "قہّار" میں غور و خوض کا مقتضی ہے۔ لیکن یہ بحث شرحِ دعائے جوشنِ کبیر میں آگئی ہے اس لیے یہاں پر اس کی پوری تفصیل پیش کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مختصراً صرف دو مطالب کی طرف اشارے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اوّلاً: یاد رکھنا چاہیے کہ اسمِ مبارکِ "قہّار" کا مفہوم ذہنِ عوام میں کچھ عجیب سا ہے، جبکہ یہ اسم مبارک بھی معبودِ برحق کے اسمائے حُسنیٰ میں سے ہے۔ اور اِس میں مخلوقات کے لیے افاضۂ صفات اور نفاذِ مصالحِ الٰہیہ کے برکات پائے جاتے ہیں۔

ثانیاً: اس کے معنی اور اطلاقات کو معصومین علیہم السلام کے اِرشادات میں جا بجا تلاش کرنے کی ضرورت ہے مثلاً حضرتِ امیر المؤمنین علیہ السلام سے منسوب دعائے صباح میں یہ جملہ بہت معنی کشا ہے کہ:

"یَامَنْ تَوَحَّدَ بِالعِزِّ وَ البَقَاءِ وَ قَهَرَ عِبَادَهُ بِالمَوْتِ و الفَنَآءِ"

"اے وہ کہ جس نے اعزاز و بقا کے ساتھ یکتائی حاصل کی اور مرگ و ناتمامی کے ذریعہ اپنے بندوں کو زیر کیا" [1]

عارفوں، عاشقوں یا دوسرے لفظوں میں شیعیانِ خدا کے لیے اُس کے قہر میں بھی بے پناہ لذت ہے۔ جس کا ادراک اس کی معرفت اور محبت سے خالی دل و دماغ کے لوگ کسی طرح نہیں کرسکتے۔ حضرت مولانا صفی لکھنوی کا شعر ہے۔

---

[1] فنا، بقا کی ضد ہے "بقا میں "دوام" کے معنی ہیں تو اس کی ضد "ناتمامی" قرار پاتی ہے جو نابودی کو بھی مستلزم ہے۔"

١٦٤

کچھ ہمارا ہی دل سمجھتا ہے

اُن کے لطف و عتاب کا عالم!

بلاشبہ اُس کی قہاریّت کی شان بھی ہر آن، ہر مکان، ہر فرد، ہر فرمان میں جُدا جُدا اظاہر ہوتی ہے۔ یہ بھی اس کی قہاریت ہی کی ایک شان ہے جس کی ترجمانی حضرت اکبرالہ آبادی کے اس شعر میں ہوتی ہے۔

خدا سے بیگانہ تھی طبیعت دلی ارادوں پہ تھا بھروسہ

عزیمتیں فسخ ہوگئیں جب عرفت ربی عرفت ربی [1]

یا اسی مضمون کا انہیں کا ایک شعر ہے۔

تدبیر سدا راس جو آتی نہیں اکبؔر

انسان کی طاقت کے سوا بھی ہے کوئی چیز

اور یہ بھی ایک شانِ قہاریّت ہی ہے جِسے مولانا حالؔی کے پاکیزہ وِجدان نے شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

اُن کے غصے میں ہے دلسوزی ملامت میں ہے پیار

مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

یہی سبب ہے کہ اداشناسانِ مشیت ''قہرِ الٰہی'' کے مقابلے میں تسلیم وتواضع کی خو پیدا کرتے ہیں نہ کہ بغاوت یا سرگرانی یا قرآنی تعبیر میں ''استکبار'' کی ___ اور اسی لیے

[1] اکبرالہ آبادی کے اس شعر کا مضمون دراصل حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ایک مشہور قول سے ماَخوذ ہے۔ یہ قول فنِ حدیث کی اصطلاح میں صحیح اسناد کے ساتھ آنجنابؑ سے مروی ہے:

''عرفتُ ربّی بفسخ العزائم''

اسی سیاق میں، دُعا کے اسی فقرے میں کہا گیا ہے:

"وَتَوَاضَعَ لِعَظَمَتِهِ العُظَمَآءُ"

"اور تمام بزرگانِ دہر نے اُس کی بزرگی کے سامنے فروتنی اختیار کی"

اس جملے میں عظماء سے مراد مستعمرین و مستکبرین وطواغیت نہیں ہیں کہ وہ کسی "داعی الی اللہ" یا "ناجی من اللہ" کی تعبیر میں عظمت سے متصف نہیں ہو سکتے، یہاں مُرادشیعانِ خدا ہیں جو چاہت کے ساتھ اطاعت کی اور ہر ہر تقاضائے مشیت کے سامنے تواضع وتسلیم کی خُو رکھتے ہیں۔اور انہیں کے وسیلے سے ربِّ اکبر اپنی قدرتوں اور مشیتوں کا اظہار فرماتا رہتا ہے، "فَبَلَغَ بِقُدرَتِهِ مَا یَشَآءُ"۔

"اور اس نے اپنی قدرت سے جو چاہا کیا"۔

☆☆☆☆☆

(۱۴)

زمزمۂ ثنا

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي يُجِيْبُنِي حِيْنَ اُنَادِيْهِ وَيَسْتُرُ عَلَيَّ كُلَّ عَوْرَةٍ وَاَنَا اَعْصِيْهِ وَيُعَظِّمُ النِّعْمَةَ عَلَيَّ فَلاَ اُجَازِيْهِ فَكَمْ مِنْ مَوْهِبَةٍ هَنِيْئَةٍ قَدْ اَعْطَانِي وَعَظِيْمَةٍ مَخُوْفَةٍ قَدْ كَفَانِي وَبَهْجَةٍ مُوْنِقَةٍ قَدْ أَرَانِي فَأُثْنِي عَلَيْهِ حَامِداً وَاَذْكُرُهُ مُسَبِّحاً.

''حمد ہے اس معبود کی! جسے میں پکارتا ہوں تو وہ میرا جواب دیتا ہے، اور میری ہر برائی کو چھپاتا ہے جبکہ میں اس کی نافرمانی کرتا ہوں، اور مجھ پر نعمتوں کی فراوانی کرتا ہے جبکہ میں اس کا صلہ نہیں دیتا، نہ جانے کتنی خوشگوار نعمتیں اس نے مجھے عطا کیں ہیں، اور نہ جانے کتنے خوفناک مہلکوں میں اس نے مجھے بچایا اور مجھے نرالی خوشیاں دکھائیں، بس میں شکرگزاری کرتے ہوئے اس کی نیکیاں دہراتا ہوں اور تسبیح پڑھ کر اس کو یاد کرتا ہوں!''

ربِ کریم کی کتنی ہی مخصوص عنایتیں ہر ہر فرد کے شاملِ حال رہتی ہیں اس کی معرفت صرف کسی کسی کو ہوتی ہے۔ دعائے افتتاح کے اس فقرے میں اِسی حقیقت کا اظہار فرمایا گیا ہے۔

وہ سمیع ومجیب ہر ایک کی ہر بات سنتا ہے، خصوصاً کوئی فریاد وفغاں اس کی بارگاہِ اقدس میں ''صدا بصحرا'' نہیں ہوتی! وہ خود ہی ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾

''اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں (تو آپ فرمادیں کہ) میں نزدیک ہی ہوں، پکارنے والے کی آواز پر آواز دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارے! بس ان کے لیے ضروری ہے کہ میری آواز پر آواز دیں

اور مجھ پر یقین رکھیں تا کہ صحیح راستا پا جائیں!''

یہ آیت کریمہ مسئلۂ دعا کے دینیاتی اور فقہی ابعاد کا احاطہ کرتی ہے۔ اور شرائط قبولیت دعا پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ دعائے افتتاح کے زیرِ غور فقرے میں جو بات کہی گئی ہے اس کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ ''جسے میں پکارتا ہوں تو وہ میری آواز پر لبیک کہتا ہے!''_ اگرچہ یہ بات ہر کس و ناکس کی زبان پر نہیں آسکتی۔ اگر آتی بھی ہے تو از روئے حقیقت نہیں بلکہ بر سبیلِ حکایت یا بہ عنوانِ مجاز آتی ہے۔ دعائے افتتاح کے اس جملے میں ''صاحبِ دعا'' حجتِ خدا علیہ التحیۃُ والثناء حقیقۃً ذہنِ انسانی کے اسی قلعۂ بستہ کو فتح کرنے کی تربیت فرما رہا ہیں۔ انسان اور معبود برحق کے درمیان موہوم فاصلے کو مٹا رہے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ جسے انسان نے گنبدِ بے در سمجھ رکھا ہے اس کے دروازے کی نشاندہی فرما رہے ہیں کہ وہ ربِّ کریم ایسا ہی ہے، اسے پکارنے کی جرأت تو کرو!

''اَلَّذِی یُجِیْبُنِی حِیْنَ اُنَادِیْہِ'' اس جملے میں حقیقتِ دعا کو تجربۂ ذات وماجرائے نفس کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

بات حقیقتِ دُعا کی چھڑ گئی ہے اور یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ سورۂ مبارکۂ بقرہ کی آیت میں مسئلۂ دعا کے دینیاتی اور فقہی ابعاد کا احاطہ کیا گیا ہے تو اس آیت کی تلاوت کا شرف بھی حاصل کر لیجیے جو حقیقت دُعا کے فلسفیانہ وجودی اور عرفانی ابعاد کا احاطہ کرتی ہے۔

﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَ یَکْشِفُ السُّوْءَ﴾

(سورۂ نمل آیت ٦١)

بھلا وہ کون ہے جو سُنتا ہے لاچاروں کی جب وہ اسے پکارتے ہیں اور

تمہید

دعا ایک بیانیہ تعبیر بھی ہوسکتی ہے اور ایک نا قابل بیان کیفیت بھی! بلکہ یہ پوری کائنات اسی ایک کیفیت پر قائم ہے۔ابن سینا نے بود و بقائے کائنات کا سبب عشق کو قرار دیا ہے،عُرَفا نے بھی عشق کی جوہریت اور ''حرکتِ حُبّی'' کا انکشاف کیا ہے۔عصر حاضر میں،طبیعیات کی عام زبان میں بھی،نظمِ کائنات کے جاری وساری قوانین میں سب سے اہم اور اساسی قانون کو ایک طرح کی ''کشش'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔دعا اسی عشق کا ترانہ، اسی حرکتِ حُبی کی حدی خوانی اور اسی کشش کا لفظی و معنوی آہنگ ہے!

عالمِ ممکنات کا ''فقر'' یا ''حقیقتِ امکان'' ہی حرفِ دعا کا اصلی سرچشمہ ہے۔ یہ دَقیق لیکن درخشاں نکتہ اپنی جگہ پر بے حد غور طلب ہے۔لیکن اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔اس وقت صرف اس قدر اشارہ مقصود ہے کہ پوری کائنات کی زبانِ حال دعا ہی ہے! یہ دعا کا ایک بڑا فلسفیانہ پہلو بھی ہے۔

ممکنات کی اسی فلسفیانہ حقیقت یا ''وجودی کیفیت'' کی بہترین ادبی تعبیریں، اہل اللہ کی دعاؤں اور مناجاتوں کی صورت میں، انسانی ادب کے نفیس ترین سرمایہ کی تشکیل کرتی ہیں۔

ہر ہر لحۂ امکان اور ہر ہر ذرۂ ممکن کی صوت وصدا،فریاد وفغاں،یا تسبیح ودعا کو سُن سکنا اور سمجھ پانا تو ہمارے امکان میں نہیں ہے۔لیکن انسان اور انسانی معاشرے کی ''عرضِ حال'' پر مشتمل بعض بہترین اور مستند ترین دعائیں ہماری دست رس میں ضرور ہیں۔''دعائے افتتاح'' اپنے طرزِ بیان، معانی اور مطالب کے لحاظ سے ایسی ہی ایک مہتم بالشان دعا ہے۔جو آج ہمارے درس و بحث کا موضوع ہے۔

یہ دعا ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے مروی دوسری دعاؤں سے کئی حیثیتوں سے ممتاز ہے۔

(بھلا وہ کون ہے) جو مصیبتوں کو دُور کرتا ہے؟''

قرآن مجید میں حقیقتِ دعا پر اور بھی متعدد آیتیں روشنی ڈالتی ہیں لیکن اگر کوئی انہیں دو آیتوں پر کماحقہ غور کر لے تو بھی شرحِ صدر کے لیے کافی سروسامان مُہیا ہو سکتا ہے۔

ربِّ کریم کی مخصوص اور مسلسل عنایتوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بندوں کی آواز پر آواز دیتا ہے اور یہ بھی ہے کہ وہ بندوں کی برائی کو چھپاتا ہے جبکہ بندے اس کی نافرمانیاں کرتے رہتے ہیں!

دُعائے افتتاح کا یہ جملہ ''وَيَسْتُرُ عَلَىَّ كُلَّ عَوْرَةٍ وَ اَنَا اَعْصِيهِ'' اسی حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے اور ربِّ اکبر کے اسمائے مبارکہ ''ستار'' اور ''عفوٌ'' کے جاری وساری برکات کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے!

اسی طرح اس کے بعد کے جملے اُس کے اَلطاف وعِنایات اور اِفضال و اِکرام کے بعض تجلیات کی طرف ملتفت کرتے ہیں۔

دعائے افتتاح کے ان جملوں سے حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے مروی دعائے کمیل کے بعض جملوں کی طرف بھی ذہن منتقل ہوتا ہے۔ بطورِ خاص یہ جملے:

''اَللّٰهُمَّ مَوْلَایَ كَمْ مِنْ قَبِيحٍ سَتَرْتَهُ وَ كَمْ مِنْ فَادِحٍ مِنَ الْبَلَاۤءِ اَقَلْتَهُ وَ كَمْ مِنْ عِثَارٍ وَقَيْتَهُ وَ كَمْ مِنْ مَكْرُوهٍ دَفَعْتَهُ وَ كَمْ مِنْ ثَنَاءٍ جَمِيلٍ لَسْتُ اَهْلاً لَهُ نَشَرْتَهُ!''

اے معبود اے آقا! کتنے ہی عیب ہیں جنہیں تو نے چھپایا ہے اور کتنی ہی سنگین بلائیں ہیں جن سے تو نے چھڑایا ہے اور کتنی ہی ٹھوکریں ہیں جن سے تو نے

١٧٠

بچایا ہے اور کتنی ہی برائیاں ہیں جنہیں تو نے دفع کیا ہے اور کتنی ہی اچھی تعریفیں ہیں جن کا میں اہل نہیں تھا لیکن تو نے پھیلائی ہیں!''

حقیقت یہ ہے کہ ربِّ کریم کی اتنی نعمتیں انسان کو حاصل ہیں اور اُس کے لطف و کرم کا ایسا فیضان اِس کائنات میں جاری وساری ہے کہ انسان نہ اس کا احصاو احاطہ کر سکتا ہے نہ ادائے شکر پر قادر ہے۔ اُس کی ''ستاری'' ہی کی شان کو اگر کوئی غور کرے تو اتنا تو سمجھ ہی سکتا ہے کہ اُس ستار العیوب نے ہر ہر انسان کو کس قدر حجاباتِ عزت وشرف سے اعزاز واحتشام عطا فرمایا ہے کہ انسان نہ جانے اپنے دل ودماغ میں دوسروں کے لیے کیا کیا سوچتا رہتا ہے لیکن دوسروں کو اس کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہوتا اسی طرح نہ جانے کیا کیا غلطیاں انسان سے سرزد ہوتی رہتی ہیں لیکن اس کی بہت ہی کم غلطیوں کی اطلاع دوسرے انسانوں کو ہو پاتی ہے جیسے کسی انتہائی چاہنے والے بُرے وقتوں پر کام آنے والے بے لوث و بے غرض دوست کا ہاتھ انسان کی تمام غلطیوں کے آثار مٹاتا چلا جاتا ہے تا کہ اس کی کوئی گرفت نہ ہو جائے۔ ورنہ اگر انسان کے تمام خیالات، تمام ارادوں، تمام نیتوں اور تمام غلط کاریوں کا افشا ہو جائے یا ہوتا رہے تو ذرا سوچیے کہ اس معمورۂ عالم میں ہر آن کیسی حشر سامانی برپا رہے!!!

ہاں وہی ہے معبودِ برحق، رؤف ورحیم، رحمان ووَدُود، جو اپنے بندوں پر ماں باپ اور قریب سے قریب تر عزیزوں سے بھی زیادہ شفیق ہے، جو اس کی آواز پر آواز دیتا ہے، اس کی ہر ہر برائی کو چھپاتا ہے، اور پیہم افزائشِ نعمت فرماتا رہتا ہے جبکہ انسان اس کی قدرِ نعمت کرنے سے بھی قاصرِ محض ہے ___ اور اس کے علاوہ اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے کہ اُسی کے بتائے ہوئے ذکرِ حمد وورِدِ تسبیح میں مشغول

رہنے کی اپنی سی کوشش میں لگا رہے تا کہ یہ بھی کہنے کے قابل رہے "فاثنی علیه حامداً و اذکرہُ مسبحاً"!

مناسب ہے کہ اس مقام پر ذِکر و تسبیح کے بارے میں بعض آیات و روایات پر نظر ڈالتے ہوئے کچھ مدام ذکر اور مسلسل تسبیح کے آداب بھی سیکھتے چلیں۔

"ذکر" کے معنی صرف زبان پر کسی کا نام جاری رکھنے یا کوئی جملہ دہراتے رہنے کے نہیں ہیں، بلکہ "ذکر" دل میں کسی یاد کو قائم رکھنے کا نام ہے۔ کبھی یادِ معبود میں کمالِ استغراق خُموشی کا موجب بن جاتا ہے تو خموشی بھی ذکر کہلاتی ہے! بقولِ شاعر۔

لفظوں کے پرستار خبر بھی تجھے کیا ہے
جب دل سے لگی ہو تو خموشی بھی دعا ہے!

اور کبھی تلاوت و نماز میں بھی اگر توجہ صرف حُسنِ صوت و حسن ادا پر مرکوز رہے تو وہی سر و سامانِ غفلت بن جاتی ہے! تاہم دل، دماغ، زبان اور عمل، ذاتِ انسانی کے ہر جزو اور شخصیت کے ہر عُنصر کو مشغولِ ذکر رکھنا ضروری ہے۔ یہ ضرورتِ دین نہیں ضرورتِ انسان ہے۔ ضرورتِ وجود اور ضمانتِ بقا و ارتقا ہے!

قرآنِ مجید میں ذکرِ الٰہی کو دل کا چین کہا گیا ہے:

﴿اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (سورۂ رعد ۱۳، آیت ۲۸)

"ہاں! آگاہ رہو کہ یادِ خدا سے دلوں کو اطمنان نصیب ہوتا ہے!"

ذکر کے وسیع تر مفہوم و مصداق کو سمجھنے کے لیے قرآنِ مجید کا یہ جملہ بھی بہت کافی ہو سکتا ہے کہ ربِ اکبر نے "نماز" کو بھی ذکر ہی کا ایک مصداق قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

﴿اَقِمِ الصَّلَاۃَ لِذِکۡرِیۡ﴾ (سورۂ طٰہٰ ۲۰- آیت ۱۴)

''مجھے یاد کرنے کے لیے نماز قائم کرو''۔

اور نماز کی ایک مخصوص وموقت ولازمی ہیئت کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس کے مفہوم کی حقیقی وسعیت اور اس کے مَصادیق کی کثرت کو بھی بہت سے آیات و احادیث میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً کہا گیا:

''جب تک تم طہارت پر رہو گے گویا کہ نماز میں ہو!''

انہیں اِرشادات سے تفصیلی منازِل ومقاماتِ ذکر کی جستجو کا باب کھل جاتا ہے۔

''ذکر'' کے مقابلے میں ''تسبیح'' کے معنی، مفہوم اور مصداق میں دقّت و ظرافت یا لطافت ونزاکت کچھ زیادہ ہی ہے۔

اس کے جمال کا پر جلال بیان ذکر ہے، اور اس کے جلال کا پر جمال اظہار تسبیح۔

تسبیح کے معنی ہیں معبودِ برحق کی پاکی اور قداست بیان کرنا، ظاہر ہے کہ اس ذاتِ ستودہ صفات کا تمام صفات سلبیہ سے مبرّا ہونے کا بیان چاہے کسی بھی اسلوب میں ہو حقِ بیان ادا نہیں ہوسکتا۔ دوسری طرف قرآنِ مجید کا حکم ہے:

﴿سَبِّحِ اسۡمَ رَبِّکَ الۡاَعۡلَی﴾ (سورۂ اعلیٰ آیت ۱)

''تسبیح کرو اپنے بلند پروردگار کے نام کی!''

﴿فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الۡعَظِیۡمِ﴾

(سورۂ واقعہ ۵۶ آیت ۷۴ اور آیت ۹۶)

اور قرآنِ مجید میں کئی سورے تسبیحِ پروردگار ہی سے شروع ہوتے ہیں

جنہیں اہلِ ذکر کی زبان میں ''مستحبات'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جن کی تلاوت ''تزکیۂ نفس اور تجلیۂ قلب کی اکسیر ہے!

ان سورہائے قرآنی کے علاوہ ائمہ اہلِ بیت نبوت علیہم السلام سے بہت سے اَوراد واذکار خصوصاً ''تسبیحات'' کے عنوان سے بھی وارد ہوئے ہیں جن میں سے سب سے زیادہ مشہور اور غالباً سب سے زیادہ قابلِ عمل اور گنجینۂ ثواب ''تسبیح زہرا'' علیہا السلام ہے، جس کے متعلق یہاں تک روایت ہے کہ ایک تسبیح زہرأ ایک ہزار رکعت نوافل کا ثواب رکھتی ہے! اللہ اکبر والحمد للہ وسبحان اللہ!!!

☆☆☆☆☆

(۱۵)

حسن نقاب اور حجابِ عظمت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي

لَایُهْتَکُ حِجابُهُ وَلَا یُغْلَقُ بابُهُ

وَلَایُرَدُّ سائِلُهُ

وَلَایُخَیَّبُ آمِلُهُ

’’تمام تعریف اس معبود کی ہے

جس کا نہ پردہ چاک ہوتا ہے نہ اس کا دروازہ بند ہوتا ہے

نہ اس کا سوالی پھیرا جاتا ہے

نہ اس سے امید لگانے والا مایوس ہوتا ہے۔‘‘

الفاظ کے لحاظ سے ’’یُھتَکُ‘‘ (فعل مضارع مجہول کا صیغہ) اُسی مادّے سے ہے جس سے اردو میں لفظِ ہتک استعمال ہوتا ہے۔ زیادہ تر ہتکِ حرمت، ہتکِ عزت، وغیرہ ترکیبوں کے ساتھ، اور یُغلق (وہی فعلِ مضارع مجہول کا صیغہ) اس مادّے سے جس سے اردو میں ’’مُغلَق‘‘ کا لفظ مستعمل ہے۔ اسی طرح بقیہ تمام الفاظ ہیں۔ خالص عربی کی ہیئت وترکیب میں ہونے کی بنا پر جو غرابت ہے وہ ترجمے سے دُور ہو جاتی ہے۔

اس فقرے میں بھی مضمونِ حمد وثنا ہے مگر ایک الگ ہی مقام سے ہے۔ یہ وہ عارفانہ زاویۂ نظر ہے جس میں شاذ ونادر ہی کوئی عارف زاویہ نشیں رہ پاتا ہے، اور محض شاعرانہ ادراک وتخیل یا نرا تفلسف توحید شناسی کے اِس مقام کا وجدان حاصل نہیں کر پاتا۔ اصحابِ عرفان و اربابِ تصوف کے کلمات میں ربِّ اکبر کے ’’حجابات‘‘ کا تذکرہ بہت پایا جاتا ہے۔ بعض روایات میں بھی حجابہائے نورانی و ظلمانی کی تفصیل پائی جاتی ہے۔ اگرچہ ان روایات کا کسی معصوم سے صادر ہونا یقینی

نہیں ہے۔لیکن فی الجملہ اِس مضمون کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے ارباب سیر و سلوک کی زبان پر اکثر یہ فقرہ بھی رہتا ہے کہ ''العلم هو الحجاب الاكبر! ''علم ہی سب سے بڑا حجاب ہے۔اس جملے کے معنی بیان کرنے میں اصحابِ قول و قلم میں خاصا اختلاف ہے۔اس وقت ہمیں اس سے غرض نہیں ہے۔

قرآنِ مجید میں پروردگار کے اوراس کے بندوں کے درمیان جس حجابِ جلال وعظمت کا تذکرہ ملتا ہے وہ یہ ہے کہ فرمایا گیا:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْياً اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُولاً فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهِ مَا يَشَاءُ اِنَّهُ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾

''مضمونِ آیت یہ ہے کہ کسی بشر کو یہ اعزاز حاصل نہیں کہ معبودِ برحق اس سے کلام فرمائے مگر یہ کہ بذریعۂ وحی یا پسِ حجاب سے یا کوئی فرشتہ بھیجے کہ وہ اُس کے اذن سے جو چاہے وحی پہنچائے، یقیناً وہ بلندی اور حکمت والا ہے!''

اس کی بلندی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ جسم و جسمانیات سے، مکان اور مکانیات سے، زمان اور زمانیات سے، عالمِ طبیعت اور اپنے مخلوقات کے جملہ خصوصیات سے پاک اور منزہ ہے! اُس کے سراپردۂ جلال تک مخلوقات کی کسی بھی خصوصیت کا گزر نہیں ہے! پھر مخلوقات سے اُس کے قرب کا تصور کیوں کر قائم ہوسکتا ہے؟ یہ سوال بہت سے اربابِ فکر و نظر کو دشواری میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔اس وقت اِس سوال سے تعرض کا محل نہیں ہے۔بس یہ ہے کہ اس کا ایک خاص حسن التفات ہے، ایک عنایت، ایک مہربانی، ایک توجہ خاص، ایک چشمِ کرم ہے، جسے حاصل ہوجائے! لیکن ابھی دعائے افتتاح کے بالکل اس سے پہلے والے فقرے میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے دعا گزار بندوں کی آواز پر آواز دیتا ہے! اور یہاں اس آیت میں

کہا جا رہا ہے کہ وہ کسی سے بھی بغیر کسی حجاب یا واسطہ کے کلام نہیں فرماتا اور دُعا کے اس فقرے کے پہلے ہی جملے میں کہا گیا ہے کہ ''لَا یُھتَکُ حِجَابُہٗ'' ''اس کا پردہ چاک نہیں ہوتا'' ''یا اُس کا پردہ اٹھایا نہیں جا سکتا!'' اِن تمام مقاماتِ سخن کو علیحدہ علیحدہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دعا گزار کی آواز پر آواز دینا ایک الگ مفہوم رکھتا ہے۔ اور کسی بشر سے اس کا ہم کلام ہونا ایک الگ معنیٰ ہے اور کسی نہ کسی حجاب کا درمیان میں رہنا ایک جُداگانہ احتشام ہے اور یہاں پر جو کہا گیا ہے کہ ''اس کا نہ پردہ چاک ہوتا ہے اور نہ اس کا دروازہ بند ہوتا ہے'' یہ مخلوقات کی پرورش و پرداخت کے اُس کے حکیمانہ نظام کا ایک تمثیلی بیان ہے۔

نہ اس کا کوئی سوالی پھیرا جاتا ہے نہ اس سے کوئی امید لگانے والا مایوس ہوتا ہے یہ سب کچھ ہے لیکن اس کا پردۂ جلال قائم ہے!

کہاں حجابِ عظمت وجلال کا یہ بلند پایہ مفہوم اور کہاں یہ شاعری کہ:

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں!

ہاں مجھے آرزوؔ لکھنوی کے اس شعر میں ضرور اس مضمون سے کچھ مناسبت نظر آتی ہے:

اللہ اللہ حسن کی یہ پردہ داری دیکھیے
بھید جس نے کھولنا چاہا وہ دیوانہ ہوا!

☆☆☆☆☆

(۱۶)

جَمالِ عدل وجلالِ رحمت

اولاً: اس کا اسلوب دوسری تمام دعاؤں سے منفرد ہے۔ اس ضمن میں کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے یہ چار دعائیں ہر لحاظ سے دوسری تمام دعاؤں کے بالمقابل جداگانہ شان رکھتی ہیں، اور ان میں سے ہر ایک دعا اپنی جگہ پر بھی انتہائی منفرد ادبی اور معنوی خصوصیات اور آثار کی حامل ہے۔

۱- دعائے صباح ، ۲- دعائے افتتاح ۳- دعائے کمیل اور ۴- دعائے سمات۔

دعائے عرفہ اور دعائے جوشن کبیر کی عظمتیں اور ان کے آثار کی دنیائیں الگ ہیں!

ثانیاً: اس دعا کا مضمون گویا ''دہر آشوب'' ہے! یہ محض ایک فرد کی دعا نہیں بلکہ پوری ملت یا پورے معاشرۂ انسانی کی فریاد اور ہر ایک کے ایک ایک درد کی ترجمان ہے!

ثالثاً: جس طرح ہمارے بعض اکابرین نے حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام سے مروی ''دعائے عرفہ'' اور حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے مأثور ''زیارتِ جامعہ'' کے بارے میں فرمایا ہے کہ دعائے عرفہ ایک مکمل دَورۂ خداشناسی ہے اور زیارتِ جامعہ ایک مکمل دورۂ امام شناسی ہے میری ناچیز رائے میں ''دعائے افتتاح'' اپنے مثالی ایجاز و اختصار کے باوجود توحید و خداشناسی سے لے کر آخرت و معادشناسی تک ایک مکمل دورۂ دین شناسی ہے۔ وہ بھی فراز ہائے عرفانی کے ساتھ ساتھ وسعت و عمقِ حیاتِ انسانی تک اور زندگی کے روحانی اقدار کے ساتھ ساتھ معاشرتی اوضاع و احوال تک، اہم ترین پہلوؤں کی جامع ہے۔ اسی لیے اِس عاجز کا خیال ہے کہ اگر اِس دعائے مبارکہ کے تمام کلمات اور اُن میں سموئے ہوئے مضامین کی مفصل شرح لکھی جائے تو ایک مکمل دائرۃ المعارف تالیف کی جاسکتی ہے۔

''دورہ'' کا لفظ حوزۂ علمیہ نجف وقم کے روزمرہ میں شامل ہے۔ اردو میں کہنا چاہیے کہ دعائے عرفہ خداشناسی کا ایک پورا نصاب ہے ___ اسی طرح زیارتِ جامعہ ایک پورا نصاب ہے امام شناسی کا۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي يُؤْمِنُ الْخَائِفِيْنَ وَيُنَجِّي الصَّالِحِيْنَ۔
وَيَرْفَعُ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ وَيَضَعُ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ
وَيُهْلِكُ مُلُوكاً وَيَسْتَخْلِفُ آخَرِيْنَ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ قَاصِمِ الْجَبَّارِيْنَ، مُبِيْرِ الظَّالِمِيْنَ ، مُدْرِكِ الْهَارِبِيْنَ، نَكَالِ الظَّالِمِيْنَ، مُعْتَمَدِ الْمُؤْمِنِيْنَ !"

تعریف ہے اسی معبود کی جو ڈرنے والوں کو پناہ دیتا ہے، نیکو کاروں کو نجات دیتا ہے،

کمزور بنائے گئے لوگوں کو اٹھاتا ہے، بڑے بننے والوں کو زیر کرتا ہے،

بادشاہوں کو ہلاک کرتا ہے، اوران کی جگہ دوسروں کو عطا کرتا ہے،

تعریف ہے اسی معبود کی جو جباروں کو توڑنے والا ہے، ظالموں کو ہلاک کرنے والا ہے، بھاگنے والوں کو پکڑنے والا ہے، ظلم کرنے والوں کو سزا دینے والا ہے، فریاد کرنے والوں کا فریاد رس ہے، چاہنے والوں کی حاجتوں کا مرکز ہے، ایمانداروں کا بھروسہ ہے!

☆☆☆

ان فقروں میں چند الفاظ قابلِ غور ہیں ۔

يُؤْمِنُ ، يُنْجِي ،يَرْفَعُ ،يَضَعُ ، يُهْلِكُ ، يَسْتَخْلِفُ ، یہ سب کلمات اَفعال (Verbs) ہیں ۔اور سب کے سب مضارع کے صیغے ہیں جن کا حال اور استقبال دونوں پر اطلاق ہوتا ہے ۔اور ان کے اطلاق سے استمرار (Continuation) کے معنی بھی پیدا ہوتے ہیں ۔اور کسی جاری وساری وثابت اصول یا قانون کی تعبیر کے لیے اسی کے بطن سے ثبوت اور اِثبات کے مفاہیم بھی

حاصل ہوتے ہیں۔

یہ عجب حسنِ اتفاق ہے کہ اس دعا میں شروع سے اَب تک بیشتر کلمات ایسے آئے ہیں جن کے بارے میں بار بار عرض کیا گیا کہ ان کے مادّے سے مشتق مختلف کلمات ہماری اردو زبان میں بھی موجود ہیں۔اَب یہ چھ کے چھ افعال ایسے ہیں کہ ان کے مادّوں سے مشتق الفاظ نہ صرف یہ کہ اردو میں استعمال ہوتے ہیں بلکہ بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔

یُؤمِنُ (پناہ دیتا ہے) اس کا مادّہ (Rootword)۔ اَم ن۔ امن، امان، ایمان، اور مومن وغیرہ کلمات بھی اسی مادّے سے ہیں۔

یُنَجِّی (بچاتا ہے یا نجات دیتا ہے) یہ۔نجی۔ یُنَجِّی ثلاثی مزید فیہ کا صیغہ ہے۔جبکہ اس کی اشتقاقی اصل ن ج و کے مادّے سے آتی ہے۔

اَور اسی مادّے سے نجات کا لفظ اردو اور بہت سی ہندوستانی زبانوں میں مستعمل ہے۔''ناجی'' کا لفظ ہمارے ایک قدیم کلاسیکی شاعر ''شاکر ناجی'' کے نام کا جزو ہے۔

یَرْفَعُ (اٹھاتا ہے، بلند کرتا ہے)۔رف ع۔رِفْعَتْ، رَفِیع، تَرَفُّع کلمات اسی مادّے سے ہیں۔آپ کے ذہن کی غرابت بھی رفع ہوگئی ہوگی۔

یَضَعُ (رکھتا ہے، گراتا ہے، زیر کرتا ہے) یہ۔وض ع۔کے مادّے سے ہے۔اردو میں وضع، وضع قطع، وضع دار، وضع داری، وضع کرنا، وضع ملنا، وضع نباہنا، وضیع (بمعنیٰ ذلیل) اور (بمعنی منکسر المزاج) شریف و وضیع، وَاضِع اور موضوع وغیرہ سارے کلمات اسی مادّے سے ہیں۔

یُھْلِکُ (ہلاک کرتا ہے)۔ھ ل ک۔ ھلاکت، آج کل دنیا میں

روزانہ بے شمار حادثے رونما ہوتے رہتے ہیں جن میں ''ہلاکتوں'' اور ''مہلوکین'' کی تعداد سے دل بیٹھا جاتا ہے۔

یَسْتَخْلِفُ (جانشیں ہوتا ہے یا بناتا ہے، خلافت عطا کرتا ہے...) یہ خ ل ف کے مادّے سے ہے، خِلاف، مُخالفت، خلیفہ، یہ سب کلمات بھی اسی مادّے سے ہیں۔

صرف ان ہیئتوں (Forms) کی تبدیلیوں اور تصاریف (Variations) کی وجہ سے معانی بدلتے چلے گئے ہیں۔

اِن افعال کے بعد چند اسماء ہیں، جو مشتقات سے ہیں، یا وہ مبنی برائے مفعول ہیں، یا مبنی برائے فاعل، مُسْتَضْعَفِیْن (کمزور بنائے گئے لوگ) مُستَکْبِرِین (بڑائی یا تکبر کرنے والے) قَاصِم (توڑنے والا) مُبِیْرِ (ہلاک کرنے والا) مُدرِک (پانے یا پکڑنے والا) ھَارِبِیْن (فِرار کرنے والے) مُستَصرِخِیْنَ (چیخنے والے یا فریادی) ذرا مشکل سے ہیں ورنہ خَائِفِیْنَ (ڈرنے والے) صَالِحِیْنَ (نیکوکار) مُلُوک (بادشاہ) جَبّارِیْنَ (ستم پیشہ حکمراں) ظَالِمِیْنَ (ظلم کرنے والے) اور طَالِبِیْنَ (طلب کرنے والے، مانگنے والے یا چاہنے والے) وغیرہ کلمات سے آپ تقریباً آشنا اور مانوس ہیں۔

☆☆☆

الفاظ سے گزر کر اِن فقروں کے مفہوم میں غور کریں۔

یہ کلمات ''عدلِ الٰہی'' کی انتہائی پیچیدہ اور مشکل بحث کا اِحاطہ کر رہے ہیں۔ انسانی افکار و نظریات اور مسلمانوں کے عقائد کی تاریخ میں ''عدل'' کی بحث بہت اہمیت رکھتی ہے۔ بلکہ اس بحث نے بھی مسلمانوں میں بڑا تفرقہ ڈالا ہے۔ اس

کی تفصیل ''مِلَل ونحَل'' کی کتابوں سے مل سکتی ہے۔

دعائے افتتاح کے پیشِ نظر کلمات کی روشنی میں ہم اصل موضوع پر غور کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ''عدل'' ''رحمت'' کے بعد اور ''رحمت'' کے پردے میں (مُستَتر) یا ذاتِ باری تعالیٰ، ذاتِ حق جلّ شانہ وعزّ اسمہ کے جملہ صفات، خصوصاً صفت رحمانیت ورحیمیت کی جلو میں سب سے اہم، سب سے بنیادی، سب سے جوہری اور سب سے محوری ''صفتِ فعلی'' ہے!

اِس عالم کا ترکیبی قوام اور تدبیری نظام اسی ''عدل'' پر استوار ہے۔ پروردگارِ عالم نے جو نظامِ ہدایت قائم فرمایا ہے، بعثتِ انبیاء، اوصیائے انبیاء اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی تعیین، آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے نزول کا سلسلہ، پھر حشر و نشر، جزا وسزا، بہشت اور دوزخ غرض معاد اور آخرت کا سارا اہتمام، سب اسی عدل کے تقاضوں کے تحت فرمایا گیا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

''لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ'' (سورۂ حدید، آیت ۲۵)

''ہم نے اپنے پیمبروں کو حقیقت طراز معجزوں کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو بھیجی تاکہ لوگ عدل قائم کریں''

اب ظاہر ہے کہ جو ربّ اپنے بندوں کو عدل قائم کرنے کا حکم فرمائے کیا وہ خود عدل کی راہ وروش اختیار نہ فرمائے گا؟!

عدل کی ضِد ظلم ہے۔ ظلم ہی سے انسان کو خوف لاحق ہوتا ہے۔ ظلم سے ڈرا سہما ہوا مظلوم ''عدالت'' اور ''عادل'' کی پناہ میں عافیت کا طالب ہوتا ہے۔ وہ خوف

جو عظمت و جلالِ الٰہی کے اثر سے پیدا ہوتا ہے، اُس کی حقیقت اِس خوف سے مختلف ہے جو ظالم اور اس کے ظلم سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بیان دعا کے دوسرے کلمات کے ضمن میں آئے گا۔ یہاں پر ارشاد فرمایا جا رہا ہے ''تعریف ہے اُسی معبود کی جو ڈرے سہمے ہوئے لوگوں کو پناہ دیتا ہے!'' یہ آثارِ عدل کو بیان کر کے عدلِ الٰہی کی تفہیم کا ایک طریقہ ہے۔

اسی طرح اس سے متصل تمام جملے فکر و نظر کو ایک ایک شانِ عدالت ربّانی کی طرف مُتوجہ کرتے ہیں۔ صالحین یا اچھوں اور نیکو کاروں کو نجات یا سرفرازی عطا کرنا، ظلم اور زیادتی سے کمزور بنا دیے گئے لوگوں کو اٹھانا، انہیں قوت و اقتدار بخشنا، ناحق بڑے بننے والوں کو زیر کرنا، ستم پیشہ حکمرانوں کو ہلاک کرنا اور ان کی جگہ دوسرے عدالت شعار اور رَحم پَروَر اشخاص کو حکمرانی عطا کرنا، جفا کاروں جبّاروں کو توڑنا، ظالموں کو ہلاک کرنا، فریادیوں کی فریاد رسی، ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور ایمان داروں، امن و عافیت پسندوں کا بھروسہ قائم رکھنا، یہ سب امور عدالت کے تقاضے، عدل شعاری کے لوازم اور کسی عادلِ حکیم و حلیم کے لازمی اوصاف اور خصوصیات ہیں۔ اسی لیے عرض کیا گیا کہ معبودِ برحق اور خالقِ کائنات کے صفات میں ''عدل'' کو ''بنیادی'' اور ''محوری'' حیثیت حاصل ہے۔ 184

آثارِ عدل و آثارِ ظلم پر غور کیا جائے، ظالمین و مستکبرینِ عالم کے تمام افعال و اقوال کا تجزیہ کیا جائے اور ظالم کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ ظلم کیوں کرتا ہے؟ تو اس کی ہزار ہا وجہیں بیان کی جا سکتی ہیں، لیکن اگر ان تمام وجہوں کا علمی، بیان اور نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو دنیا میں ہنگامہ آرا اور حشر ساماں تمام اسبابِ ظلم کی صرف دو ہی بنیادیں سامنے آتی ہیں۔ ایک ''جہل'' اور ایک ''حرص''۔

انسان یا جہل و نادانی کی بنیاد پر ظلم کرتا ہے یا حرص و ہوس کی وجہ سے اپنے حق سے تجاوز کر کے دوسروں کا حق یا حصہ غصب کر لیتا ہے۔ اسی لیے جہاں غِنائے مطلق اور اِستِغنائے کامل ہو اور علم بھی ہو وہاں ''ظلم'' یا قبح کا وجود ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی سبب ہے کہ عدل کی بحث میں محققِ طوسیؒ نے تجرید الاعتقاد میں یہ جملہ سپردِ قلم کیا ہے:

''اِستِغْنَاؤُهُ وَعِلْمُهُ يَدُلَّانِ عَلَىٰ اِنْتِفَاءِ الْقُبحِ عَنْ اَفْعَالِهِ تَعَالیٰ''

''اس کا بے نیاز ہونا اور اس کا علم، یہ دونوں اوصاف، اس کے افعال سے قبح کی نفی پر دلالت کرتے ہیں''

اس باب میں ''خلاصہ کلام'' یہی ہے، لیکن اسی نقطہ کو پھیلائیں تو پورا قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت پیدا ہو جائے گی۔ اور اس مشکل بحث کو حل و فصل کرنے کے لیے عدل تکوینی، عدلِ تشریعی، عدلِ عاجل، عدلِ آجل کے مُصطلحات کا سہارا لینا پڑے گا۔

خیر اور شر کے مسائل، جبر و اختیار کے مباحث، قضا و قدر کے اسرار، ذہن و قلب کو پریشان تو ضرور کرتے ہیں مگر اُسی معبودِ برحق کے ''ذکر'' سے، قرآن ہو یا پھر دعا، جمعیتِ خاطر تشفیِ ذہن اور تسلیِ دل کا سر و سامان کرتے ہیں۔

ہر ایک مسئلہ پر مفصل بحثیں مُطوّل کتابوں میں موجود ہیں، اِس مختصر میں بنا اشارے اور ایجاز ہی پر ہے۔ تاہم ''خیر و شر'' کا مسئلہ چونکہ آج کل بہت زیادہ موضوعِ بحث بنا ہوا ہے اس لیے اس کی تھوڑی سی وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

خالقِ مُتعال خیرِ محض ہے۔ اور اُس نے جو کچھ بھی خلق فرمایا ہے محض خیر ہے۔ ''شر'' ممکنات کی مَحدُودِیتوں یا اَعدام سے مُنتزَع (Perceive یا Draw)

ہوتا ہے۔

ہے خیر سے معمورۂ ہستی آباد
معدوم ہے اِمکان میں شر کی بنیاد
لبریز ہے توحید کے مضمون سے عِلم
ہے جہل فقط دلیلِ شرک و الحاد

شَر کے اعدام یا معدوم سے منتزع ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ربِّ کریم نے ایجاد وتکوین وخلق فرمایا ہے اُس میں کہیں پر ذرّہ بھر بھی شر کا کوئی شائبہ نہیں ہے! بلکہ اُس کے ایجادات سے انسان جب سوءِ استفادہ کرتا ہے تو شر پیدا ہوتا ہے! کسی بھی شئ سے انسان کے سوءِ استفادہ کو بھلا اُس ربِّ رحیم، معبودِ برحق، خالقِ علیم اور باریِ لطیف کی طرف کس طرح نسبت دی جا سکتی ہے؟! اسی لیے اللہ کے معصوم بندوں نے اپنی دعاؤں میں ارشاد فرمایا ہے "والشـرُّ لیـسَ اِلَیکَ!" (اے معبود شر تیری جانب سے نہیں ہے!) اور اگر کہیں پر خیر وشر دونوں کے خلق کی نسبت خدائے متعال کی جانب آئی بھی ہے تو اس کے معنیٰ "خلقِ تقدیری" کے ہیں نہ کہ "خلق تکوینی" کے۔ یعنی اس نے اپنے علم کی بنیاد پر مُقدّراتِ کارِ بشر میں، لوحِ محفوظ میں، پہلے ہی سے اُس انجامِ کار اور نتیجۂ عمل کو ثبت فرمادیا ہے۔ جسے انسان کاشت کرتا ہے:

مولا است مُرادِ ہمہ کس می داند
دانا است سوادِ ہمہ کس میں داند
دٗانستنِ اُو علتِ کارِ ما نیست
دَاند چوں نہادِ ہمہ کس می داند

۱۸۶

جبر واختیار وتفویض کے مسائل میں تمام بحثوں کا خلاصہ اولیائے معصومین علیہم السلام سے تواتر کے ساتھ نقل ہونے والا یہ جملہ ہے کہ اپنی جامعیت اور کمالِ بلاغت میں ایک آیت ہے:

''لاجبرَ ولا تفویضَ وَلکن امرٌ بینَ اَمرینِ'' (مجمع البحرین طریحی)

''نہ سراسر جبر ہے نہ سربسر تفویض، بلکہ دو امروں کے درمیان ایک امر ہے''۔

اردو کے ایک اہلِ دل اہلِ مودّت شاعر رزمؔ ردولوی نے اس موضوع کو حیرت انگیز شاعرانہ دل آویزی کے ساتھ ایک رُباعی میں سموڈالا ہے:

ہر چند کہ جبر خِشتِ بنیادی ہے
قدرت نے مگر راہ بھی بتلا دی ہے
اٹھّے تو دوعالم کو مُسَخّر کرلے
اِتنی حدِ زَنجیر میں آزادی ہے!

اَور تو اور ہمارے ''زبان کے شاعر'' جناب شیخ امام بخش ناسخؔ نے بھی اِس موضوع پر ایک ایسا شعر کہہ دیا ہے کہ اس کی تشریح ایک مبسوط کتاب کی متقاضی ہوسکتی ہے۔

چلا عدم سے میں جبراً تو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا!

☆☆☆

دعائے افتتاح کے بالکل ابتدائی فقروں کے ذیل میں لطفِ الٰہی کے بیان میں میں نے عرض کیا تھا کہ ''انسان اِس کائنات میں ''مجبورِ محض'' نہیں ہے

بلکہ 'محتاجِ محض'' ہے! اور یہ محتاجی ''مخلوق'' ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ اُس قادرِ وقیوم نے اِسے محتاج کیا ہے! یہ انسانِ ذلیل ہے کہ اپنی حقیقت وحیثیتِ ذاتی میں محتاج ہے اور وہ ربِّ کریم ہے کہ اپنے لطف سے اِسے مختار بننے کی راہیں دکھاتا جاتا ہے!!!''

اور بلا مبالغہ تمام مباحثِ ''عدل'' و ''توحید'' کا قرآنِ بلاغت و بیان حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا یہ جملہ ہے:

''اَلتَّوحِیدُ اَلَّا تَتَوَهَّمَهُ والعَدلُ اَلَّا تَتَّهِمَهُ''

(نہج البلاغہ نسخہ صبحی صالح)

''توحید یہ ہے کہ اُسے اپنے وہم وگمان کے حدود میں نہ لاؤ اور عدل یہ ہے کہ اُس پر اتہام نہ رکھو!''

☆☆☆☆☆

(۱۷)

جلال و جبروتِ قدرت

متن وترجمہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي مِنْ خَشْيَتِهِ تَرْعَدُ السَّمَاءُ وَ سُكَّانُهَا وَتَرْجُفُ الْاَرْضُ وَعُمَّارُهَا وَتَمُوْجُ الْبِحَارُ وَمَنْ يَسْبَحُ فِي غَمَرَاتِهَا.

تمام حمد ہے اس معبود کی جس کی ہیبت سے آسمان اور آسمانوں میں بسنے والے کانپتے ہیں زمین اور اس پر زندگی بسر کرنے والے لرزتے ہیں سمندروں اور اس کی گہرائیوں میں پیرنے والے لرزہ بجاں ہیں۔

دعائے افتتاح کا یہ فقرہ عجیب فرازِ معرفت کی نشاندہی کرتا ہے۔ توحیدِ ذات، توحیدِ صفات، توحید افعال، صفاتِ ثبوتیہ اور صفاتِ سلبیہ کے بہت سے گوشوں کی طرف گزشتہ فقراتِ حمد وثنا میں توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ اس مقام پر تمام کائنات پر اُس کے جلال وقہاریت کا ایک اثر بیان کیا گیا ہے کہ:

اس کے آگے کمالِ تواضع سے آسمان اور اہلِ آسمان،

زمین اور اہلِ زمین

سمندر اور اس کی گہرائیوں میں تیرنے والے سبھی لرزہ براندام ہیں!

اس سے قبل کے بعض فقرات میں کچھ اس سے قریب تر مضامین گزر چکے ہیں مثلاً دعا کے پہلے ہی فقرے میں یہ جملہ بھی تھا:

"وَاَعْظَمُ الْمُتَجَبِّرِيْنَ فِىْ مَوْضِعِ الْكِبْرِيَآءِ وَ الْعَظَمَةِ"

"(اے معبود) کبریائی اور عظمت کے موقع پر کوئی تجھ سے برتر صاحبِ جلال وجبروت نہیں ہے۔"

اس جملے میں صرف عظمت وجبروت کا ذکر ہے، مخلوقات پر اس کے کسی

واضح اثر کی نشاندہی نہیں ہے۔

اس کے بعد ایک فقرے میں یہ جملہ بھی آیا ہے:

"قَهَرَ بِعِزَّتِهِ الاَعِزَّآءَ وَ تَوَاضَعَ لِعَظَمَتِهِ العُظَمَآءُ فَبَلَغَ بِقُدرَتِهِ مَا يَشَاءُ"

اس جملے میں قہاریت کے ذکر کے ساتھ مخلوقات پر اس کے ایک بڑے اثر کی نشاندہی بھی موجود ہے۔ اور وہ ہے ربِّ اکبر کی عظمت کے مقابلے میں مخلوقات کا خضوع وخشوع و"تواضع"۔

زیرِ غور فقرے میں ایک اور بڑا اثر بیان کیا گیا ہے۔ خشیت جس کے بجائے خود بہت سے آثار ہیں۔ مثلاً رونا، سر افگندہ ہونا، لرزہ براندام ہونا۔

اردو میں عام طور پر خشیت کا ترجمہ خوف سے کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ اگر لفظ و معنی کے رشتوں سے متعلق اُس نظریہ کو تسلیم کیا جائے جس میں مُترادفات کے وجود کا سرے سے انکار کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ہر لفظ بجائے خود اپنے مستقل معنی و مصداق رکھتا ہے۔ اگر دو مستقل الفاظ ہوں گے تو اُن کے معنی بھی بہر حال علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ یہ ممکن نہیں کہ دونوں لفظوں کے بعینہٖ ایک ہی معنی ہوں۔ تو پھر غور کرنا پڑے گا کہ خوف اور خشیت دونوں الفاظ عربِی فصیح میں پائے جاتے ہیں اور دونوں ہی الفاظ قرآنِ مجید میں بھی اپنے اپنے موقع محل پر استعمال ہوے ہیں۔ تو پھر ان کے درمیان معنی کا کچھ نہ کچھ فرق و تفاوت ضرور ہوگا۔

اور اگر اس نظریہ کو تسلیم نہ بھی کریں یعنی مترادفات کے وجود کو تسلیم کریں

تب بھی مختلف الفاظ بطورِ خاص اِن دونوں کلمات (خشیت وخوف) کے درمیان معنوی امتیاز کی جستجو کا جواز بہر حال باقی رہے گا خصوصاً جب کہ دونوں الفاظ قرآنِ مجید میں علیحدہ علیحدہ استعمال ہوئے ہیں۔

کلامِ عرب اور قرآنِ مجید کے آیات میں ان الفاظ کا تفحّص کرنے سے یہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ خوف اور خشیت کے الفاظ بالکل مترادف اور متحد المعنی تو نہیں ہیں لیکن قریب المعنی ضرور ہیں۔ فرق وتفاوت یہ ہے کہ "خوف" مذموم اور منفی انفعالِ نفس کا نام ہے اور خشیت ممدوح اور مثبت اثر پذیری اور تواضع کے درجۂ کمال کا نام ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں جگہ جگہ مؤمنین وصالحین کے صفات میں خشوع اور خشیت کا شمار کرایا گیا ہے اور خوف کی ان سے نفی کی گئی ہے۔

﴿لا خوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون﴾

بعض مرشدین و مُعلّمینِ اخلاق نے "خوف" کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں۔

خوف، خشیت، وجل، رہبت، ہیبت۔

اور فرمایا ہے کہ خوف گنہگاروں کو لاحق ہوتا ہے، خشیت ادائے حق میں تقصیر کے احساس سے پیدا ہونے والی کیفیت ہے، وجل ترکِ خدمت کے نتیجہ میں ہونے والا انفعال ہے، رہبت اور ہیبت، حسبِ مقاماتِ معرفت، اس کی عظمت و جبروت کے احساسات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے عاجزانہ تاثرات ہیں۔ قرآنِ مجید کے مختلف آیات میں ان تمام مقاماتِ خوف وخشیت کا تذکرہ آیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ﴾ (سورۂ رحمٰن آیت ۴۶)

''اور جو اپنے رب کے مقامِ عظمت کا خوف رکھتا ہے اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔''

۲۔ ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (سورۂ فاطر آیت ۲۸)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے خشیت اس کے بندوں میں صرف علم رکھنے والے ہی رکھتے ہیں۔''

۳۔ ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾

(سورۂ انفال آیت ۲ و سورۂ حج آیت ۳۵)

''ایمان والے تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں۔''

۴۔ ﴿وَيَدْعُوْنَنَا رَغَباً وَّ رَهَباً﴾ (سورۂ انبیاء آیت ۹۰)

''اور (یہ انبیاء) ہمیں رغبت اور رہبت کے ساتھ پکارتے ہیں۔''

۵۔ ہیبت کا کلمہ قرآنِ مجید میں نہیں آیا ہے، اس کے معنی و مفہوم کو دوسرے کلمات و تعبیرات مثلاً ﴿يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾ وغیرہ کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

تمام عالمِ ممکنات پر جس طرح خوف و خشیت و کمالِ تواضع کی تصویر کشی دعائے افتتاح کے اس فقرے میں کی گئی ہے وہ دعائے سمات کے بعض جملوں کی یاد بھی دلاتی ہے جہاں کہا گیا ہے:

''وَبِجَلَالِ وَجْهِكَ الْكَرِيْمِ اَكْرَمِ الْوُجُوْهِ وَ اَعَزِّ الْوُجُوْهِ الَّذِىْ عَنَتْ لَهُ الْوُجُوْهُ، وَخَضَعَتْ لَهُ الرِّقَابُ، وَخَشَعَتْ لَهُ الْاَصْوَاتُ، وَوَجِلَتْ لَهُ الْقُلُوْبُ مِنْ مَخَافَتِكَ''۔

''اور (تیری بارگاہ میں سوالی ہوں) تری کرم گستر ذات کے جلال کے حوالے سے، جو سب سے زیادہ عظیم اور سب سے زیادہ باعزت ہے۔ جس کے آگے سبھی ذاتیں سرنگوں ہیں، اور ساری گردنیں خمیدہ ہیں، تمام آوازیں لرزاں اور تمام دل ترے خوف سے ہراساں ہیں۔''

☆☆☆☆☆

(۱۸)

لطفِ ربوبیت

یا

فیضانِ ہدایت

''اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡ ھَدٰانَا لِھٰذَا وَ مَا کُنَّا لِنَھۡتَدِیَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ ھَدٰانَا اللّٰہُ''

''تمام تعریفیں اُسی معبودِ برحق کی ہیں جس نے ہماری (اِس بابِ راہِ نجات وفردوس تک) رہنمائی فرمائی جبکہ اگر معبودِ برحق رہنمائی نہ فرماتا تو ہم ہدایت پانے والے نہ تھے۔''

دُعا کا یہ فقرہ قرآنِ مجید کی ایک آیت سے اِقتباس کیا گیا ہے۔ یہ سورۂ مبارکۂ اعراف (ساتویں سورے) کی ۴۳ ویں آیت کا اِبتدائی حصہ ہے جو یہاں بغیر کسی تصرف کے بعنوانِ ثنائے الٰہی دُہرایا گیا ہے۔

اصل آیت میں عالمِ آخرت کی حکایت ہے۔ یعنی یہ مقام محاکاتِ قرآنی میں سے ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ انسانی ادب میں بیشتر بلکہ تمامتر ماضی ہی کی محاکات پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ قرآنِ مجید کے عظیم ترین خصوصیات میں سے ہے کہ اس میں بہ کثرت اور بہ کمالِ حسن و بہ کمالِ صداقت مستقبل اور آخرت سے متعلق محاکات موجود ہیں۔

اِس سے قطعِ نظر، اصل آیت میں بات یہ بیان کی گئی ہے کہ آخرت میں نجات پانے اور بہشتِ بریں میں جگہ پانے والوں کی صدائے حال اوران کا زمزمۂ مقال یہ ہوگا کہ:

> ''شکر ہے معبودِ برحق کا جس نے ہم کو (نجات اور فردوس تک پہنچنے والے) اِس راستے پر لگا دیا اور ہم یہ راستا پا ہی نہیں سکتے تھے اگر اللہ ہمیں اس کی رہنمائی نہ فرماتا!''

قرآن مجید میں اس کے آگے ایک فقرہ اور ہے جس میں اللہ کی طرف

سے آنے والے پیمبروں کی تصدیق اور اُن کے برحق ہونے کا اعلان ہے:

﴿لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾

''ہمارے پروردگار کے پیغام پہنچانے والے بلاشبہ برحق آئے۔''

اس محاکاتِ قرآنی میں کانٹے کی بات یہی ہے کہ اگر وہ ربّ کریم اپنے نظامِ ہدایت سے ہمیں بہرہ مند نہ فرماتا تو ہم ایسے کہاں کے دانا تھے جو خود بخود ہدایت پاجاتے اور اپنی دنیا و آخرت سجا سنوار کر نجات پا سکتے۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس مخصوص لُطفِ الٰہی یعنی نظامِ ہدایت ربّانی کا کسی قدر تفصیل سے تذکرہ کرنے کی سعادت بھی حاصل کی جائے کہ یہ بھی ایک اندازِ شکر و سپاس اور ایک اسلوبِ حمد و ثنا ہے۔

١٩٧

گزشتہ مباحث میں کہیں پر یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ حقیقۃً بنیادِ تخلیق ''لُطفِ مشیت'' یا ''مشیتِ لطف'' ہے۔ ابتدائے خلقت سے انتہائے آخرت تک جو کچھ بھی ہے سروسامانِ لطفِ ربّانی ہی کی جلوہ گری ہے۔ یہاں پر خصوصیت کے ساتھ یہ تذکرہ مقصود ہے کہ اسی لطفِ بے پایاں کا تقاضا یہ ہوا کہ ''خلق'' سے پہلے ہدایتِ خلق کا اہتمام فرمایا جائے۔ چنانچہ ربّ کریم نے ہدایتِ خلق کا موثر ترین وسیلہ سب سے پہلے خلق فرمایا جس کا نام عقل ہے۔ اس کے علاوہ اصولِ کافی کی یہ مشہور حدیث صحیح السند بھی ہے اور صریح الدلالت بھی:

[اَخبرنا ابو جعفر محمد بن یعقوب قال: حدثنی عِدَّةٌ من اصحابنا منهم یحیٰ العطار، عن احمد بن محمد، عن الحسن بن محبوب، عن العلاء بن رزین عن محمد بن مسلم عن أبی جعفرؑ قال:]

"لَـمّـا خلق الله العقل استنطقه ثم قال له: اَقْبِلْ فَاَقْبَلَ ثُمَّ قَالَ لَـهُ اَدْبِـرْ فَـاَدْبَرَ، ثُمَّ قَالَ وَ عِزَّتِي وَ جَلالِي مَاخَلَقْتُ خَلْقاً هُوَ أَحَبُّ اِلَيَّ مِـنْـکَ وَلا اُکْـمِـلُـتُکَ اِلّا فِـیْـمَـنْ اُحِبُّ، اَمّا اِنِّي اِیَّاکَ آمرُ وَ اِیَّاکَ انهِي وَ اِیَّاکَ اُعَاقِبُ وَ اِیَّاکَ اُثِیْبُ!"

حضرت امام محمد باقرؑ علیہ السلام نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو اسے گویا کیا پھر اس سے فرمایا کہ آگے بڑھو تو وہ آگے بڑھی پھر فرمایا کہ پیچھے ہٹو تو وہ پیچھے ہٹ گئی پھر فرمایا کہ میری عزت اور میرے جلال کی قسم میں نے کوئی مخلوق ایسی نہیں پیدا کی جو مجھے تجھ سے زیادہ محبوب ہو اور میں تجھے کسی بھی فرد میں بہ حد کمال نہیں پہنچاؤں گا مگر اسی میں جس سے مجھے محبت ہوگی۔ میں تیرے ہی ذریعہ سے امر کروں گا اور تیرے ہی ذریعہ سے نہی کروں گا اور تیرے ہی سبب سے سرزنش کروں گا اور تیرے ہی ذریعہ سے جزا دوں گا۔"

اس حدیث سے نظامِ ہدایتِ الٰہیہ میں عقل کی اہمیت اور اس کی محوری حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض اسلامی روایات میں "عقل" کو "نبیِ باطن" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ عقل ہی ہے جس سے سلامت روی اور سعادت مندی کے ساتھ استفادہ کیا جائے تو حقیقتِ کبریٰ تک رسائی یا ثبوتِ حق کے لیے کوئی سرگردانی نہیں ہوتی اور انسان بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسولؐ نہ آتے تو صبح کافی تھی!

لیکن یہ بھی ایک تلخ سچائی ہے کہ انسان بالعموم اپنی عقل کی آواز اور اپنے ضمیر کی پکار بھی نہیں سنتا۔ اسی لیے ہادیِ مطلق نے اپنے نظامِ ہدایت میں انبیاء

مرسلین، ائمہ اور اولیا کا منظّم سلسلہ بھی قائم فرمایا۔[۱] قرآن حکیم گواہ ہے کہ کوئی بھی نسل ،کوئی بھی قبیلہ اور کوئی بھی خطّہٴ ارض یا کوئی منطقہٴ حیات آسمانی ہدایت کے فیضان سے محروم نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ قرآنِ مجید نے ایک سے زائد مقامات پر اس بات کی صراحت فرمائی ہے۔ سورہٴ مبارکہٴ یونس (دسویں سورے) میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ﴾ (آیت ۴۷)

''اور ہر امت کے لیے رسول ہوئے''

اسی طرح سورہٴ مبارکہٴ نحل (سولھویں سورے) میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولاً أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ (آیت ٦)

''اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور سرکشوں کی بندگی سے بچو۔''

یہی حقیقت سورہٴ نحل کی ۸۴ ویں آیت سے مُستَفاد ہوتی ہے:

﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيداً﴾

''اور جس روز (روزِ آخرت) ہم ہر امت میں سے ایک گواہ اٹھائیں گے...''

---

[۱] محقق طوسیؒ نے تحریر الاعتقاد میں بعثتِ انبیاء کے باب میں نظریہٴ لُطف کے حوالے سے یہ عبارت تحریر فرمائی ہے:

"البعثةُ حَسَنَةٌ لِاشتِمالِها علىٰ فَوائدَ كَمُاضدة العَقلِ فِيمَا يَدُلُّ عليهِ وَاستفادة الحكم فيما لايدل..."

ان کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ پروردگارِ عالم کا نبیوں کو بھیجنا اچھائی ہے۔ اس سے بندوں کے حق میں ربِ کریم کا لطف شاملِ حال ہو جاتا ہے۔ اس لیے انبیا کے بھیجنے میں بہت سے فائدے ہیں۔ مثلاً جن باتوں میں عقلِ انسانی رہنمائی کرتی ہے نبوت ان باتوں میں عقل کی تائید کرتی ہے اور جن باتوں میں عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی اُن میں نبوت رہنمائی کرتی ہے...''

اَللّٰهُمَّ

اِنِّي اَفْتَتِحُ الثَّناءَ بِحَمْدِكَ

وَأَنْتَ مُسَدِّدٌ لِلصَّوابِ بِمَنِّكَ

وَاَيْقَنْتُ اَنَّكَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ فِي مَوْضِعِ العَفْوِ وَالرَّحْمَةِ

وَأَشَدُّ المُعاقِبِيْنَ فِي مَوْضِعِ النَّكالِ وَالنَّقِمَةِ

وَأَعْظَمُ المُتَجَبِّرِينَ فِي مَوْضِعِ الكِبْرِياءِ وَالعَظَمَةِ

اَللّٰهُمَّ

اَذِنْتَ لِي فِي دُعائِكَ وَمَسْأَلَتِكَ

فاسْمَعْ يا سَمِيْعُ مِدْحَتِي

وَاَجِبْ يا رَحِيْمُ دَعْوَتِي

وَاَقِلْ يا غَفُوْرُ عَثْرَتِي

فَكَمْ يا اِلٰهِي مِنْ كُرْبَةٍ قَدْ فَرَّجْتَها

وَهُمُومٍ قَدْ كَشَفْتَها

وَعَثْرَةٍ قَدْ اَقَلْتَها

وَرَحْمَةٍ قَدْ نَشَرْتَها

وَحَلْقَةِ بَلاءٍ قَدْ فَكَكْتَها

اَلحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي

لَمْ يَتَّخِذْ صاحِبَةً وَلا وَلَدًا

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيْكٌ فِي المُلْكِ

سورہ فاطر (۳۵) میں ہے:

﴿وَ اِنۡ مِّنۡ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیۡهَا نَذِیۡرٌ﴾ (آیت ۲۴)

''اور کوئی اُمّت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی ''نذیر'' (کوئی خدا اور آخرت سے ڈرانے والا) نہ آیا ہو۔''

اِن صاف وصریح قرآنی بیانات کی روشنی میں یہ حقیقت کہ پروردگار نے کسی بھی قوم کو اپنے لطفِ ہدایت سے محروم نہیں رکھا، اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ یہ ایک علیٰحدہ بحث ہے اور ایک خاص مصلحتِ الٰہی پر مبنی ہے کہ قرآنِ مجید میں نہ تمام کی تمام اقوام و ملل کا تذکرہ ہے نہ سارے کے سارے مبعوث ہونے والے انبیا کا۔ قرآنِ مجید میں تو صرف ۲۵/انبیا کا نام آیا ہے جو حسب ذیل ہیں: [۱]

۱۔ حضرت خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۲۔ حضرت آدمؑ	۳۔ حضرت ادریسؑ
۴۔ حضرت نوحؑ	۵۔ حضرت ہودؑ
۶۔ حضرت صالحؑ	۷۔ حضرت ابراہیمؑ
۸۔ حضرت لوطؑ	۹۔ حضرت اسماعیلؑ
۱۰۔ حضرت اسحاقؑ	۱۱۔ حضرت یعقوبؑ
۱۲۔ حضرت یوسفؑ	۱۳۔ حضرت ایوبؑ
۱۴۔ حضرت شعیبؑ	۱۵۔ حضرت موسیٰؑ
۱۶۔ حضرت ہارونؑ	۱۷۔ حضرت یونسؑ

۱۔ جیسا کہ سورہ مبارکہ نسا کی اس آیت میں خود ہی ارشاد فرمایا ہے:
(وَرُسُلًا قَدۡ قَصَصۡنٰهُمۡ عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ وَرُسُلًا لَّمۡ نَقۡصُصۡهُمۡ عَلَيۡكَ...)
''کچھ رسول ہیں جن کے قصے ہم نے آپ سے بیان کیے ہیں اور کچھ رسول ہیں جن کا تذکرہ ہم نے نہیں کیا...''

۱۸۔ حضرت داوٗدؑ ۱۹۔ حضرت سلیمانؑ

۲۰۔ حضرت الیاسؑ ۲۱۔ حضرت الیسعؑ

۲۲۔ حضرت زکریاؑ ۲۳۔ حضرت یحیٰؑ

۲۴۔ حضرت عیسیٰؑ

۲۵۔ حضرت ذوالکفلؑ (بقولِ اکثرِ مفسرین)

یہ نام علامہ بہائیؒ کی مرتب کردہ فہرست کے مطابق ہیں جوانہوں نے کشکول میں ثبت فرمائی ہے۔

(کشکول بہائی ج ا ص ۲۷، نسخہ خراسان طبع نجف، عراق)۔

بعض علماء نے ان انبیاء کے مفصل حالات میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ بعض نے زیادہ ''توسُّع'' سے کام لیا ہے اور قرآنِ مجید میں مذکور انبیا کے علاوہ دوسرے تاریخی مآخذ سے استفادہ کرتے ہوے اور بھی بہت سے انبیا کا تذکرہ مرتب فرمایا ہے۔ برادرِ معظم جناب حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید ذیشان ہدایتی صاحب قبلہ نے ایک عرصہ سے ''تاریخِ انبیاے ہندوستان'' مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔ جس کا کافی مواد جمع کرلیا ہے، لیکن ابھی وہ کام بھی تحقیقی مراحل میں ہے اور اختتام یا اتمام تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ اسی طرح اسی موضوع پر ایک آیتِ قرآنی کے ذیل میں معاصرِ بزرگوار علامۂ عبقری حضرت علامہ طالب جوہری مدظلہ العالی بھی تحقیق وتحریرِ مباحث ومطالب میں مشغول ہیں۔ ربِّ کریم سے دعا ہے کہ وہ ان مساعیِ جلیلہ کو اِتمام اور قبولیت سے سرفراز فرمائے۔

مجملاً اس باب میں جو استفادہ میں نے ان بزرگوں کے بیانات سے کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر آنے والے پیمبروں میں بعض اہم قرائن کی

بنیاد پر گوتم بدھ، کرشن، مہادیو وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے مشہور صوفی شاعر اور مفسر و عالم حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کی رائے اور بعض دوسرے علمائے اعلام کی رائیں بھی خاصی شہرت رکھتی ہیں۔ جن کا نقل کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

جہاں قرآنِ مجید میں تمام اقوام یا امتوں میں بعثتِ انبیاء کا تذکرہ کیا ہے وہیں اس افسوس ناک تاریخی حقیقت کا بھی ایک سے زائد مقامات پر تذکرہ کیا ہے کہ ہر امت نے اپنے ''رسول'' یا نبی کا مذاق بھی اڑایا ہے اور خدا کے نمائندوں سے نبرد آزمائی بھی کی ہے۔ انبیا کی زندگیوں میں بھی انہیں ہر طرح کی اذیتیں دی ہیں اور ان کے گزر جانے کے بعد اُن کی سیرتوں کو مسخ اور شریعتوں کو منحرف کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ یقیناً یہ تاریخِ انسانی کا شرمناک ترین باب ہے کہ قرآنِ مجید میں قلبِ مشیت کی بھی ''آہ'' اِن الفاظ میں ڈھل گئی ہے:

﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ﴾ (یٰسین آیت ۳۰)

''ہائے افسوس! ان بندوں پر جن کے پاس جو بھی رسول آیا اس کے ساتھ انہوں نے تمسخر کیا۔''

اسی طرح سورہ غافر کی یہ آیت ہے:

﴿وَهَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَجَادَلُوهُ بِالْبَاطِلِ﴾

(سورہ غافر آیت ۵)

''اور ہر امت اپنے رسول کی درپے ہوئی کہ انہیں گرفتار کرے اور باطل پر جھگڑتی رہی۔''

اس کے علاوہ اور بھی آیتیں ہیں۔ ان آیات کا تاریخِ انبیاء خصوصاً سیرت وسوانحِ انبیاء اور ان کی طرف منسوب تعلیمات کا مطالعہ کرتے وقت لحاظ رکھنا صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے ازبس ضروری ہے۔ ورنہ گمراہی میں پڑ جانا آسان ہے۔

☆☆☆

تخلیقِ عقل یا نبیِ باطن اور بعثتِ انبیا یا عقولِ کاملہ وظاہرہ کے علاوہ آسمانی صحیفوں کا نزول اور شریعتوں یا زندگی بسر کرنے اور معاشرۂ انسانی کو منظم کرنے کے اصول اور قوانین کا پروردگار کی جانب سے عطا کیا جانا بھی اسی لطفِ ربّانی، لطفِ ہدایت اور محبت الٰہیہ کا بہترین مظہر ہے۔ اور غور کیجیے تو جتنے علوم وفنون شرفِ انسانی کا سرمایہ ہیں سب کے سب انہیں دو سرچشموں سے حاصل ہوئے ہیں۔ یا عقل و ادراکِ انسانی سے یا تعلیماتِ انبیاء علیہم السلام سے۔ اور اس لحاظ سے تمام علوم و فنون سراسر الطافِ الٰہیہ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں!

۲۰۳

اسی لیے میں اکثر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ جب بھی کسی کے ذہن میں کوئی تازہ علمی نکتہ، نظریہ یا کوئی بھی مسئلہ منکشف ہو، اسے اپنی ذہانت پر نازاں نہیں ہونا چاہیے بلکہ ربِّ کریم کا سجدۂ شکر بجا لانا چاہیے کہ معبودِ برحق نے اُس پر لُطف فرمایا، تجلّی فرمائی کہ اُسے انسانی تہذیب کے سرمایہ میں کسی علم و اطلاع کے اضافے کا ذریعہ بنایا۔

اس موقع پر حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک بھی ذکر کرنے کی سعادت حاصل کرنی چاہیے کہ آپؐ نے فرمایا:

"العِلمُ نُورٌ يَقْذِفُهُ اللّٰهُ فِي قَلْبِ مَنْ يَشَاء"

"علم نور ہے اللہ جس کے دل میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے"۔

☆☆☆

اِس مقام پر تمام علوم وفنون کا تذکرہ تو کُجا اُن کی فہرست سازی بھی ممکن نہیں ہے۔ تاہم چند اساسی علوم وفنون کی طرف کچھ سرسری اشارے بھی ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

الطافِ الٰہیہ سے انسانی عقل کا سب سے بڑا اکتساب ''حکمت'' یا ''فلسفہ'' ہے۔ جسے علوم انبیاء کی تائید بھی حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اغراض میں شریعت اور حکمت دونوں کی تعلیم شامل ہے۔

''حِکْمَت'' اصالۃً عربی اور قُرآنی کلِمہ ہے۔ اور، اپنے لغوی اور اصطلاحی معانی اور تعریفات کے لحاظ سے، اپنے یونانی مترادف کلمہ ''فلسفہ'' سے کہیں زیادہ وقیع، وزین اور وسیع ہے۔

''حکمت'' یا ''فلسفہ'' کی تعریف میں تعبیرات کا بہت اختلاف ہے۔ لیکن جو تعریف مجھے سب سے زیادہ اچھی اور سچی لگتی ہے وہ یہ ہے کہ ''حِکمت حقیقت کو جاننے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا نام ہے۔'' اس تعریف میں حکمتِ نظری اور حکمتِ عملی دونوں ہی کا تعارف شامل ہے۔

حکمت کی یہ بہت پرانی تقسیم ہے کہ بنیادی طور پر اس کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں اور پھر ہر قسم کے تین اقسام بیان کیے گئے ہیں:

حکمت یا فلسفہ

- حکمت نظری یا فلسفۂ نظری
  - اِلٰہیات، یا علمِ اعلیٰ
  - ریاضیات یا علمِ اوسط
  - طبیعیات یا علمِ ادنیٰ
- حکمت عملی یا فلسفۂ عملی
  - تہذیب نفس یا علمِ اخلاق
  - تدبیر منزل یا اصولِ خانہ داری
  - سیاست مدن یا تدبیرِ اجتماع

بقیہ تمام علوم انہیں بنیادی علوم کی شاخیں ہیں۔

یہاں پر ایک اور اہم نکتہ کی طرف التفات ضروری ہے کہ ''علوم'' کے

اقسام دراصل اقسام نہیں ہیں بلکہ یہ ''تقسیم ناپذیر حقیقتِ علم'' کے مختلف مراتب ہیں۔ جنہیں سہولت پسندی سے اقسام کہہ دیا جاتا ہے۔ اور جہاں علومِ عقلی کے مراتب ختم ہوتے ہیں وہاں سے علومِ وحی کے مراتب شروع ہوتے ہیں۔ یعنی عالمِ حقیقت و ہستی کے جو مراتب عقلِ بشری بطورِ خود درک و دریافت کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے، حضرت ربّ الارباب اپنے فیضِ مزید اور لطفِ مُستزاد سے وحی و نبوت کے ذریعہ عالمِ بشری کو اُن مراتبِ حقیقت و ہستی سے بھی ''باخبر'' فرماتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں دامنِ علمِ بشری علومِ وحی یا علومِ نبوت اور کتبِ سماویہ سے مالا مال ہوتا ہے۔ یہی مراتبِ علم ''علوم دینیہ'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

''علوم دینیہ''، جنہیں ''علومِ عقلیہ'' (حکمت یا فلسفہ اور اس کے اقسام) کے بالمقابل ''علوم نقلیہ'' (Narrative Sciences) کے ضمن میں شمار کیا جاتا ہے، میرے نقطۂ نظر سے اَساسی طور پر قرآنِ مجید ہی سے متفرع یا منشعب ہوتے ہیں۔ اور اسی لحاظ سے علمِ تفسیر کو علوم دینیہ کی نسبت سے ام العلوم کہنا خلافِ حقیقت نہ ہوگا۔ قرآن مجید کی جو آیتیں توحیدِ ذات اور صفاتِ الٰہیہ سے متعلق مضامین کا احاطہ کرتی ہیں ''علمِ عرفانِ توحید'' کو انہیں آیات کی تفسیر سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح جو آیتیں احکام و معاملات زندگی سے متعلق ہیں، ''علمِ فقہ'' کو انہیں آیات کی تفصیل اور توضیح قرار دیا جاسکتا ہے۔ بقیہ علومِ دین انہیں دو علوم کی تکمیل و تدوین کے فنی آلات اور وسائل یا مُبادیاتِ فقہ و عرفان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فقہ اور بعض دوسرے علوم دینیہ پر کچھ اور روشنی دعا کے آئندہ فقروں کے ضمن میں بھی ڈالی جائے گی۔

تخلیق و بخششِ عقل، بعثتِ انبیاء، تنزیلِ کتاب اور کشفِ اسرار و علوم

کے علاوہ ایک عظیم لطفِ ربانی نظامِ ہدایت کا وہ تربیتی نصاب اور عَملی دستور و منشور بھی ہے۔ خصوصاً وہ تربیتی نصاب جسے ''نظامِ عبادات'' کی شکل میں شریعت کا لازمی حصہ قرار دیا گیا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکاۃ اور جہاد وہ ارکانِ دین اور تربیتِ انسانی کے وہ نسخے ہیں جو سربسر لطفِ الٰہی اور محبت و شفقتِ ربانی کے مصالح سے لبریز ہیں۔ مشہور فلسفی ابنِ سینا نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ یہ رسومِ عبادات دراصل اللہ کے پیمبر کی غیر موجودگی میں اُن کی قائم مقامی اور یاددہانی کی تاثیر رکھتے ہیں۔

بعض نارسا اذہان تکالیفِ شرعیہ اور رسومِ عبادات کی طلب و تعیین پر مختلف وجوہ سے اعتراض کرتے ہیں مثلاً کوئی کہتا ہے:

بدنام نہ کیوں ہو خَمِ گردن یہ خودی کا
مارا ہے ازل سے تری سجدہ طلبی کا
جھکنا بھی بُرا اور جھکانا بھی بُرا ہے
چوکھٹ سے مٹا داغ مری خیر سری کا

حالانکہ وہ غور نہیں کرتا کہ:

اللہ رے اعجاز یہ سجدہ طلبی کا
احساس تو بیدار ہے بندے میں خودی کا

ہوتا نہ تقاضا تو یہ توہین بڑی تھی
احسان رہا شوق پہ سجدہ طلبی کا

جب سے تری چوکھٹ پہ جھکا ہے سرِ تسلیم
آنکھوں کو کھٹکتا ہے نشاں خیر سری کا

☆☆☆

(۱۹)

فیضانِ حیات و فردوسِ بقا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي يَخْلُقُ وَلَمْ يُخْلَقْ

وَيَرْزُقُ وَلاَيُرْزَقُ

وَيُطْعِمُ وَلاَيُطْعَمُ

وَيُمِيْتُ الْأَحْيَاءَ وَيُحْيِي الْمَوْتىٰ

وَهُوَ حَيٌّ لاَيَمُوْتُ

بِيَدِهِ الْخَيْرُ

وَهُوَ عَلىٰ كُلِّ شَيٍْ قَدِيْرٌ

حمد اس معبود کی!

جو پیدا کرتا ہے خود پیدا نہیں کیا گیا!

جو رزق دیتا ہے اسے رزق نہیں دیا جاتا

جو کھلاتا ہے کھاتا نہیں،

جو زندوں کو مارتا ہے، اور مردوں کو جلاتا ہے

اور وہ خود ایسا زندہ ہے جسے موت نہیں،

اسی کے ہاتھ میں بھلائی ہے

اور وہی ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے

دعائے افتتاح میں حمد و ثنا کے سلسلے کا یہ اٹھارواں اور آخری فقرہ ہے۔ اس میں کوئی لفظ اَدَق، غریب، مُغلَق یا مشکل نہیں ہے۔ سادہ الفاظ میں گہری باتیں اور سامنے کی باتوں میں ماورائی حقیقتیں سموئی ہوئی ہیں۔

توحیدِ باری اور ثنائے الٰہی کے بعض اَدَق مضامین گزشتہ فقروں میں آچکے ہیں۔ یہاں پر وہ باتیں ذکر کی گئی ہیں جن پر ہر کس و ناکس غور کرسکتا ہے، اور ہر طرح کی تشکیک دل سے نکال کر اطمنان و یقین حاصل کرسکتا ہے۔

''وہ پیدا کرتا ہے خود پیدا نہیں کیا گیا''

یہ جواب ہے ایسے کوتاہ اندیشوں کا جو سمجھتے ہیں کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا تصور ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے۔ اس فکر کی ترجمانی بعض شعرا نے بہت زیادہ کی ہے اور کچھ ایسی شاعرانہ دل آویزی کے ساتھ کی ہے کہ راہ گم کردہ لوگ اپنی گمراہی میں اور راسخ ہو جاتے ہیں، [1] لیکن شاعری شاعری ہے اور حقیقت و حکمت، حقیقت و حکمت ہے!

تقریباً تمام عالمِ خلقت ہمارے سامنے ہے۔ ہر مخلوق کو ہم بنتے بگڑتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، ہماری سائنسی نگاہ بھی عالَمِ تغیرات کا دقیق تر مُشاہدہ کر رہی ہے۔ اور اگر چہ وہ ''دستِ تخلیق کار'' جو اس تمام سلسلۂ تخلیق و تغیر میں کارپرداز ہے کسی کے مشاہدہ میں نہیں آتا لیکن اُس کے تصرفات تو سبھی کے مشاہدے میں آرہے ہیں۔ اس لیے اُس وجودِ حقیقی اور واجب الوجود کو محض ایک انسانِ مجبور کے تھکے ہوئے ذہن کا ایک تصورِ موہوم کیوں کر کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا سوچنا یا اس خیال کا اظہار کرنا، نہ صرف ایک بڑی جسارت ہے بلکہ یہ فکر بجائے خود بعض اذہان کی تھکن یا نارسائی کا مظہر ہے۔ اور جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ مشاہدے ہی میں نہیں آتا تو کسی بھی دستِ تصرُّف کا اُس کے دامنِ ناز تک پہنچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے کہ کوئی اُسے کسی بھی صورت یا کسی بھی شکل میں تخلیق کرے یا اُسے رزق یا غذا فراہم کرے۔ اسی لیے درحقیقت یہ انسان کے صاف و شفاف ضمیر

---

[1] جیسے:

بے نیازوں کے لیے چاہیے تخییل پناہ
وہ نہ ہو بھی تو ضرورت ہے مسلم اس کی
ہے خدا اورصنم آذریِ فکر و نظر
خود اک افسردۂ اصنام ہے وحدت اس کی
فلسفیوں نے جسے جنبشِ مجبور کہا
فلسفوں پر متبسم رہی حکمت اس کی

۲۰۹

اَے معبود!

میں آغاز کر رہا ہوں اس عرضِ نیاز کا تیری حَمد سے

اور تُو ہی اپنے کرم سے کامیابی بخشنے والا ہے

جبکہ مجھے یقین ہے کہ بخشش اور مہربانی کے موقع پر تو ہی تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

اور سزا و سرزنش کے موقع پر تو ہی تمام سزا دینے والوں سے زیادہ سخت ہے

اور بزرگی کے موقع پر تو ہی تمام بزرگواروں سے بزرگ تر ہے

اَے مَعبود!

تُو نے مجھے پکارنے اور مانگنے کی اجازت دی ہے

تو اَے سُننے والے میری حَمد سَماعت فرما

اور اے ہمیشہ رحم کرنے والے میری طلب پوری کر

اور اے درگزر کرنے والے میری خطا سے درگزر فرما!

نہ جانے کتنے دکھوں کو اے معبود تجھی نے دور کیا

اور نہ جانے کتنے رنج تجھی نے مٹائے ہیں

اور نہ جانے کتنی خطائیں تجھی نے درگزر فرمائی ہیں

اور نہ جانے کتنی رحمتیں تجھی نے سایہ فگن کی ہیں

اور نہ جانے کتنی بلاؤں کے پھندے تجھی نے کھولے ہیں

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے

جس نے نہ کوئی بیوی اختیار کی نہ کوئی بیٹا

اور نہ کوئی اس کی پادشاہی میں شریک ہے

اور اُس کے بیدار قلب کی ''اذانِ توحید'' کے بول ہیں جو دعائے افتتاح کے اس فقرے میں آگئے ہیں:

''وہ رزق دیتا ہے اُسے رزق نہیں دیا جاتا''

''وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں ہے''

یہ انسان کی عملی فکر کے ثمرات ہیں جو نظری سطح پر حقیقتِ توحید کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

''وہ پیدا کرتا ہے خود پیدا نہیں کیا گیا''

یہ جملہ ان لوگوں کی فکری الجھنوں کا بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز میں مداوا بھی کرتا ہے جو ایک خالق کے قائل تو ہیں لیکن اُس کی عبادت کے لیے طرح طرح سے صنم تراشیاں بھی کرتے ہیں۔ یہ جملہ مُشاہداتی بیان اَور تجربی وجدان کی روشنی میں بطلانِ تسلسل کا نظریاتی محاکمہ بھی ہے۔

''وہ رزق دیتا ہے اُسے رزق نہیں دیا جاتا''

یہ عرفانِ جمیل بھی ہے۔ یعنی حیات و کائنات کی تمام نیاز مَندیوں کا اُسی کے فیض سے پورا ہوتے رہنے کا اعتراف ہے اور ساتھ ہی اُس کی عظمت اور عُلُو کی یہ شان بھی ظاہر کر رہا ہے کہ ہر شے اپنی ہر ضرورت میں اُسی کی نیاز مند ہے جبکہ وہ کسی بھی لحاظ سے کسی کا نیاز مند نہیں ہے۔ اور ہر ایک کی تمام نیاز مندیوں کو پورا بھی کرتا ہے۔ لفظ ''رزق'' لفظ ''طعام'' سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اسی لیے اس میں ''تمام نیاز مندیوں'' کا ذکر آگیا۔ جس میں مادّی اور معنوی، جسمانی اور روحانی سبھی نیاز مندیاں شامل ہوگئیں۔ اور اسی بنا پر سطحی، مادّی اور جسمانی ضرورتوں تک محدود فکر و نظر رکھنے والوں کے لیے بطورِ استدراک و اتمامِ کلام یہ بھی کہا گیا:

''وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں ہے!''

☆☆☆☆☆

چونکہ حمد وثنائے الٰہی کے مضامین کا سلسلہ یہاں پر تمام ہو رہا تھا اس لیے حیات وموت اور حیاتِ ابدی کا تذکرہ کر کے ''عالمِ آخرت'' کی طرف بھی دُعا گزار کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

''وہ زندوں کو مارتا ہے اور مردوں کو جلاتا ہے''

اِس جملے کی تشریح میں معانی اور مفاہیم کی کئی منزلیں سر کرنی پڑیں گی۔

''حیات'' ایک ذومراتب یعنی نہایت تہہ دار حقیقت ہے اور اس کی ہر تہہ ،اس کی ہر سطح اور اس کے ہر مرتبہ کی مناسبت سے ''موت'' کے مفاہیم اور مصادیق بھی اُتنے ہی تہہ دار یا مرتبہ در مرتبہ، سطح در سطح، گوناں گونی کی صفت سے متصف ہیں۔

قرآنِ مجید کی استعاراتی زبان میں ''ایمان'' کو ''حیات'' اور کفر کو ''موت'' سے تعبیر کرنے کی مثال بھی موجود ہے۔

چنانچہ سورۂ مبارکہ یونس کے اِن الفاظ کی:

﴿یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ﴾

''وہ زندے کو مردہ سے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے''

تشریح میں مَروی ہے کہ معصوم علیہ السلام نے فرمایا یہاں پر مراد یہ ہے کہ وہ پروردگار کافر کی صُلب سے مومن اور مومن کی صلب سے کافر کو پیدا کرتا ہے۔

خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ حیات کے گوناں گوں مراتب ہیں۔ حیاتِ مادّی کا ایک مرتبہ ہے، حیاتِ روحانی کا مرتبہ کچھ اور ہے۔ حیاتِ دنیوی الگ ہے۔ حیاتِ اخروی جداگانہ ہے۔ حیاتِ ممکن کے مرتبے محدود اور حیاتِ الٰہیہ کی لامتناہی حقیقت بالکل ماورائے حدود وقیود ہے ''وھوحیٌ لایموت''۔ ''وہ ایسا زندہ ہے کہ اُسے موت نہیں ہے''۔ یہاں مطالب اس قدر ہیں کہ ایک علیحدہ کتاب کے مقتضی ہیں۔ تاہم چند نکات نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کر دینے میں اس مقام پر بھی کوئی

مضائقہ نہیں ہے۔

اولاً: حیاتِ حضرتِ رَبُّ الارباب کی صفتِ ذاتی ہے۔ وہ ''حی'' ہے چونکہ جس طرح حیات صفت ذاتی ہے اسی طرح ''قِدم'' بھی اس کی صفتِ ذاتی ہے۔ جیسا کہ صفاتِ ثبوتیہ میں ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ ''قدیم'' ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ چنانچہ اس کی حیات کی ابدیت وسرمدیت میں کوئی جائے تردید نہیں ہے۔ اور یہ بہت سادہ سی بات ہے جو صفاتِ ثبوتیہ کے مشہور بیان وتقریر کے مطابق کہہ دی گئی۔ ورنہ صفتِ ''قدم'' تو صفتِ حیات کے عینِ ذات ہونے کا لازمہ ہے۔

ثانیاً: جملہ مخلوقات خصوصاً انسان اپنی ابتدا سے انتہا تک مختلف مراتبِ حیات سے گزرتا اور اُسی نسبت سے مختلف موتوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ اس کی مثال اسی ایک عرصۂ حیاتِ دنیوی میں کئی لحاظ سے پیش کی جاسکتی ہے۔ علم ایک مرتبۂ حیات ہے اور اس کے مقابلے جہل ایک موت ہے۔ انسان جب کوئی علم حاصل کرتا ہے تو اس کے وجود کا وہ حصہ زندہ ہوجاتا ہے، جو اُس پر حائز ہوتا ہے۔ اور جب انسان کوئی علم فراموش کر دیتا ہے تو اُس کا وہ حصۂ وجود جو اس علم پر حائز ہوتا ہے مردہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ایمان ایک مرتبۂ حیات ہے۔ جب انسان ایمان پیدا کرلیتا ہے تو اسے زندگی حاصل ہوجاتی ہے۔ جب اس کا ایمان زائل ہوجاتا ہے تو وہ اس لحاظ سے مردہ ہوجاتا ہے۔ اِسی طرح ایک ایک اخلاقی صفت کا لحاظ کرتے ہوئے بھی حیات اور موت کے گوناں گوں مراتب کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ حضرتِ رب الارباب کی ذات چونکہ ہر لحاظ سے کامِل ہے اس لیے اس کی حیات بھی ہر لحاظ سے مکمل ہے اور کسی بھی طرح کی موت کا شائبہ اس میں نہیں پایا جاسکتا۔

ثالثاً: چونکہ حضرتِ احدیت کی حیات ہر لحاظ سے کامِل واَکمل ہے اسی

لیے خیرِ مطلق کا سرچشمہ بھی وہی ہے اسی لیے اسی سیاق میں کہا گیا :

''اُسی کے ہاتھ میں ساری بھلائی ہے''

اس لیے کہ جہاں بھی عدم کا ذرا سا بھی شائبہ ہوگا اُسی نسبت سے ''خیر'' محدود ہو جائے گا۔ ''الخیر'' کسی نہ کسی طرح ''خیر'' میں بدل جائے گا۔ اور اسی نسبت سے وہاں ''شر'' بھی پیدا ہو جائے گا۔ یہ بحث بھی کافی بیان و تفصیل کی متقاضی ہے لیکن:

ابھی شکایتِ جورِ خزاں کا وقت نہیں
ابھی حکایتِ فصلِ بہار باقی ہے

اسی فقرے کے ضمن میں حیات و موت کے ذکر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم ایک اور انتہائی اہم بحث یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں، تا کہ توحید کے بعد م''اصولِ دین'' یا انسانی ذہن کے فِکری مسائل کی تشفی کے موضوعات میں سے ایک اور اہم موضوع یعنی موضوعِ ''آخرت'' بھی مختصراً ہی سہی اس کتاب میں زیرِ بحث آجائے۔ جبکہ متن کے سطور و بین السطور میں بھی اس موضوع کی گنجائش موجود ہے۔

ربِّ کریم کے فیّاض علی الاطلاق ہونے اور خود اس کی حیات کے سرمدی ہونے کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مخلوقات کو بھی، ہر ایک کے حسبِ ظرف، ابدیت کی لذت سے ضرور بہرہ مند فرمائے۔ جبکہ:

''بِیَدِهِ الْخَیْرُ''

''اسی کے ہاتھ میں ساری بھلائی ہے''

اور ''وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر''

''وہی ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے''

پھر اُسے فانی کو بھی باقی بنا دینے میں کیا دشواری پیش آسکتی ہے؟!

''فیضانِ حیات'' اور ''فردوسِ بقا''

رَبِّ حَیِّ وقَیُّوم اور مُنعِمِ غنی وفیاض کی جانب سے اس کے مخلوقات خصوصاً ذی شعور مخلوقات بالاخص ''انسان'' کے مستقبل حیات کا کیا اہتمام ممکن ہے اس سوال پر شاعرانہ فکروتخیل سے کام لے نے والے تواِس طرح کا استفہام قائم کرتے ہیں:

نہ جانے کل تری جلوہ گری کا نام کیا ہوگا
ادائے خاص کیا ہوگی، لباسِ عام کیا ہوگا

لیکن علمی، عرفانی اور کلامی مذاق رکھنے والے عالمِ آخرت اور بہشت و دوزخ کے بارے میں اپنے اپنے زاویہ ہائے نظر سے بہت کچھ تفصیلات بیان کرتے ہیں۔

حقیقت عالمِ برزخ اور امکانِ قیامت سے لے کر وقوعِ حشر ونشر وحساب ومیزان وصراط اور دیگر منازل آخرت واعراف تک اور پھر حقیقتِ جنت ونار اور معنیِ خُلُودوابدیَّت تک نہ جانے کتنی بحثیں ہیں جو علمِ کلام، علمِ حکمت اور عرفان اسلامی کی کتابوں میں سموئی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں پر اُن تمام مباحث کا ان کے تمام جزئیات کے ساتھ ذکر وبیان ممکن نہیں ہے۔ اس لیے صرف چند کلی مباحث کی طرف سرسری اشاروں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اس باب میں سب سے پہلا نکتہ یہ قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت کسی بھی آسمانی کتاب میں جنہیں آسمانی کہا یا سمجھا جاتا ہے اور جن میں، سوائے قرآنِ کریم کے، انسان کے دست انحراف نے خوب خوب تحریفیں بھی کر ڈلی ہیں، آخرت کے موضوع پر کوئی قابلِ ذکر تفصیل نہیں ملتی۔ موجودہ توریت تو سرے سے ذکر آخرت سے خالی ہے۔ انجیل میں ضرور چند مقامات پر معمولی سے اشارے باقی رہ گئے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ آج اہلِ توراۃ واہلِ انجیل دُنیا میں فتنہ وفساد اور دہشت گردی کی سیاست اختیار کرنے میں ذرا سی بھی جھجک محسوس نہیں کرتے کیونکہ سرے

سے ''آخرت'' کا عقیدہ ہی نہیں رکھتے تو حضورِ پروردگار میں جواب دہ ہونے کا خوف ہی کہاں رہ جاتا ہے؟

ہاں! یقیناً یہ صرف قرآنِ کریم ہے جو آخرت پر ایمان، اور دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں عدل و میزان پر نہ صرف بار بار زور دیتا ہے بلکہ اس کتابِ عظیم کی تقریباً بیس فی صد آیتیں آخرت شناسی کے رموز و اسرار سے بحث کرتی ہیں۔ اور اگر صرف انہیں آیات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس باب میں کوئی بھی مسئلہ مبہم یا غیر واضح باقی نہیں رہ سکتا۔

قرآنِ مجید کی انہیں آیتوں کی تفسیر و تاویل میں وارِد رسولِ اسلام خطیبِ قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثوں اور ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام کی بیان کردہ تشریحوں کا مطالعہ اس نتیجہ تک پہنچاتا ہے کہ وقوعِ آخرت پر ایک دو نہیں بلکہ متعدد مستقل دلیلیں بیان کی جاسکتی ہیں۔ اور آخرت یا معاد کے دلائل امکان ہی نہیں بلکہ اس کے وقوع پر دینیاتی، طبیعاتی اور مابعد طبیعاتی تینوں زاویہ ہائے نگاہ سے نہایت مستحکم براہین موجود ہیں۔ ان میں سے سرِ دست ہم صرف پانچ دلائل آخرت کے عناوین ذکر کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

۱۔ دلیلِ حرکت: وجود حضرت باری تعالیٰ پر ارسطو کی جانب ایک دلیل منسوب ہے کہ اس خدا پرست فلسفی نے وجود حق سبحانہ وتعالیٰ پر یہ دلیل قائم کی تھی کہ کوئی بھی حرکت بغیر محرک کے پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس لیے یہ تمام حرکت وحرارت زندگی جو کائنات کی صورت میں ہمارے مشاہدے میں ہے یہ کسی ''محرکِ اول'' کے بغیر کیوں کر وجود میں آسکتی ہے!

اُس نے حرکت ومحرک کے حوالے سے صرف نقطۂ آغاز وابتداء کا معمہ حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ بعد کے اسلامی حکماء نے اسی دلیلِ حرکت سے انجام و انتہاء پر دلیل قائم کی کہ ہر وہ حرکت جو کہیں سے شروع ہوتی ہے وہ بالآخر کہیں پر

جا کر ختم ضرور ہوتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ حرکت شروع ہو لیکن پھر کبھی ختم نہ ہو۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تمام کائنات جو مختلف حرکات ہی کا مجموعہ ہے ایک دِن ضرور نقطۂ آخر تک پہنچ کر تمام ہو جائے گی۔

اس دلیل کی تائید میں بعض آیتوں کے حوالے بھی دیے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آخرت کے دینی یا اسلامی نظریہ پر اس دلیل کی یہ تقریر ناقص ہے۔ آیات سے مزید روشنی حاصل کر کے اِسے ایک مکمل دلیل معاد بنانے کے لیے مزید کد و کاوشِ فکر و نظر درکار ہے۔ اس عاجز و قاصر کا معروضہ یہ ہے کہ قیامت کی دلیل حرکت سے کہیں زیادہ مستحکم وہ کونیاتی دلیل ہے جو قرآنِ مجید کے ان الفاظ میں سموئی ہوئی ہے:

﴿اَلسَّمَاءُ مُنفَطِرٌ بِهِ﴾

''یہ پوری قضائے کائنات اسی حقیقت و حکمت پر مبنی ہے!''[1]

اس ناچیز کی رائے میں قرآنی اور دینیاتی نقطۂ نظر سے سب سے مستحکم دلیل، ''دلیلِ رحمت'' ہے۔

قرآنِ مجید کی پہلی ہی آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے لے کر آخرِ قرآن تک بہت سے مقامات پر جوششِ رحمت الٰہیہ کو دلیل معاد و آخرت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، میں جب بھی اس دلیل کو پیش کرتا ہوں، جناب میر انیسؔ علیہ الرحمہ کا ایک شعر ضرور یاد آجاتا ہے۔ فرمایا ہے:

سیاقِ رحمتِ معبود ہے قیامت و حشر
ہم اس کو بھی کرمِ بے حساب سمجھے ہیں

خلاصۂ دلیل یہ ہے کہ ربِّ کریم جو کہ غنی علی الاطلاق بھی ہے اور

---

[1] سورۂ مزمل کی یہ مختصر آیت اپنے دامنِ معنی میں دو دلیلوں کی جامع ہے، دلیلِ کونی اور دلیلِ دینی، ''اَلسَّمَاءُ مُنفَطِرٌ بِهِ'' دلیل کونی کا ترجمان فقرہ ہے اور ''كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا'' ایک طرح کی دینیاتی دلیل ہے!

فیاض علیٰ الاطلاق بھی! وہ اپنے فیضانِ حیات میں کبھی بھی کوئی کمی فرمانے والا نہیں ہے۔ جبکہ اُس نے ابتدا ہی میں بغیر کسی طلب کے فیضِ وجود عطا فرمایا تو وہ اس فیض کو کبھی ''سلب'' نہیں فرما سکتا۔ بس یہ ہے کہ جو جس طرح کا مذاقِ زندگی پیدا کرے گا اُسے وہ اُسی طرح کا دارِ بقا عطا فرمائے گا۔ زندگی کے حسنِ حقیقی کے قدردانوں کو ''فردوس بقا'' عنایت فرمائے گا تو ناقدروں کو خُلود فی النار نصیب ہوگا۔ اور یہ ان کے اپنے مذاقِ زندگی ہی کا صلہ ہوگا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا قرآن مجید میں رحمت کو مختلف الفاظ و عبارات میں پیش کیا گیا ہے، تاہم یہ ایک آیت یہاں پر بطورِ استشہاد پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے سورۂ انعام آیت ۱۲:

﴿قُلْ لِّمَنْ مَّافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾

''کہیے کہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمینوں میں ہے، وہ کس کا ہے؟ کہہ دیجیے کہ اللہ کا ہے۔ اس نے اپنے ذمہ رحمت کرنا عائد کر لیا ہے وہ تم سب کو یقیناً روزِ قیامت تک جس میں کوئی شک نہیں اکٹھا کرتا رہے گا جنہوں نے خود اپنا نقصان کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے''

دلیلِ حرکت اور دلیلِ رحمت کی طرح دلیلِ حکمت، دلیلِ عدالت، دلیلِ فطرت، دلیلِ قدرت اور اسی طرح مزید دلائلِ آخرت ہیں جن کی تفصیل و توضیح کلام و حکمت کی مفصل کتابوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

وہ بحث بھی اس سے بھی ذرا آگے کی ہے جو ہمارے عرفانی صحیفوں مین پائی جاتی ہے کہ ''قیامت'' بھی کوئی ایک ہی تھوڑی ہے، قیامت یہ ہے کہ پانچ

قیامتیں ہیں جن سے گزر کر انسانِ ضعیف کو ربِّ قوی قہار کا فیضِ ابدی حاصل کرنا ہے۔شرحِ فصوصِ قیصری کی عبارت ہے:

اَقْسَامُ الْقِیَامَۃِ خَمْسَۃٌ: مَا ھُوَ فِي کُلِّ وَقْتٍ وَ آنٍ

وَمَاھُوَ بِالْمَوْتِ الطَّبِیْعِی

وَمَا ھُوَ بِالْمَوْتِ الاِرَادِيْ

وَمَا ھُوَ مَوْعُوْدٌ مُنْتَظَرٌ

وَمَاھُو بِالْفِنَاءِ لِلْعَارِفِیْنَ!"

قیامت کی پانچ قسمیں ہیں۔ایک وہ ہے جو ہر وقت اور ہر آن سر پر کھڑی ہے۔

ایک وہ ہے جس سے طبیعی موت کے بعد روبرو ہونا ہے

ایک وہ جو موت اِرادی پر موقوف ہے

ایک وہ قیامتِ موعودِ منتظر ہے

اور ایک وہ قیامت ہے جو عرفاء کو فنا فی اللہ کا مقام حاصل ہونے پر برپا ہوتی ہے!

☆☆☆☆☆

(۲۰)

درودِ بے پایاں

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذُّلِّ
وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيراً
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بِجَمِيعِ مَحَامِدِهِ كُلِّهَا
عَلٰى جَمِيعِ نِعَمِهِ كُلِّهَا
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي
لَامُضَادَّ لَهُ فِي مُلْكِهِ
وَلَامُنَازِعَ لَهُ فِي اَمْرِهِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَاشَرِيْكَ لَهُ فِي خَلْقِهِ
وَلَا شَبِيهَ لَهُ فِي عَظَمَتِهِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْفَاشِي فِي الْخَلْقِ اَمْرُهُ وَحَمْدُهُ
الظَّاهِرِ بِالْكَرَمِ مَجْدُهُ
الْبَاسِطِ بِالْجُودِ يَدَهُ
الَّذِي لَا تَنْقُصُ خَزَائِنُهُ
وَلَا تَزِيْدُهُ كَثْرَةُ الْعَطَاءِ
اِلَّا جُوداً وَكَرَماً
اِنَّهُ هُوَ الْعَزِيْزُ الْوَهَّابُ
اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْأَلُكَ قَلِيْلاً مِنْ كَثِيرٍ
مَعَ حَاجَةٍ بِي اِلَيْهِ عَظِيمَةٍ وغِنَاكَ عَنْهُ قَدِيمٌ
وَهُوَ عِنْدِي كَثِيرٌ
وَهُوَ عَلَيْكَ سَهْلٌ يَسِيرٌ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ وَاَمِيْنِكَ وَصَفِيِّكَ وَ حَبِيْبِكَ وَ خِيَرَتِكَ مِنْ خَلْقِكَ وَحَافِظِ سِرِّكَ وَمُبَلِّغِ رِسَالَاتِكَ اَفْضَلَ وَ اَحْسَنَ وَ اَجْمَلَ وَ اَكْمَلَ وَاَزْكٰى وَ اَنْمٰى وَ اَطْيَبَ وَ اَطْهَرَ وَاَسْنٰى وَاَكْثَرَ مَاصَلَّيْتَ وَبَارَكْتَ وَتَرَحَّمْتَ وَتَحَنَّنْتَ وَسَلَّمْتَ عَلٰى اَحَدٍ مِنْ عِبَادِكَ وَ اَنْبِيَائِكَ وَرُسُلِكَ وَاَهْلِ الْكَرَامَةِ عَلَيْكَ مِنْ خَلْقِكَ.

اے معبود! رحمت فرما اپنے بندے، اپنے پیمبر، اپنے امانت دار، اپنے برگزیدہ، اپنے چہیتے، اپنی تمام خلقت میں سب سے بہتر، اپنے راز دار اور اپنے پیغامات کے پہنچانے والے محمدؐ پر!

سب سے بہتر، سب سے برتر، سب سے حَسین، سب سے کامل، سب سے زیادہ نفیس، سب سے زیادہ پرفروغ، سب سے زیادہ پرنکہت، سب سے زیادہ پاکیزہ اور سب سے بلند رحمت! اور جو بھی رحمت، برکت، ہمدردی، محبت اور سلامتی تو نے اپنے بندوں، نبیوں، رسولوں، اپنے چُنے ہوئے لوگوں اور اپنی تمام خلقت میں سے اپنے نزدیک بامرتبہ، باشرف لوگوں پر کی ہے، اُس سب سے بھی زیادہ!

☆☆☆

اس فقرے کے ساتھ دعائے افتتاح ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتی ہے! یہ مرحلہ نہایت لطیف اور پہلے مرحلے سے شیریں تر ہے۔

پہلے مرحلے میں ربِّ ذوالجلال کی حمد کا زمزمہ تھا جس میں عظمت وجلالِ کبریائی کا پرتو زیادہ تھا۔ اس مرحلے میں رب کریم کے حضور میں اُس کے حبیبؐ کے ذکر کی لطافت شامل ہوگئی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ "حبیبِ کبریاء" اور

اس کے تمام تر اوصاف کے کامل ترین مظہر۔ بطورِ خاص اس کی رحمتِ کاملہ کا مجسمہ ہیں، اس کے محبوب ترین بندے ہیں، اس کے مخلوق اور عبد، اس کے مظہرِ صفات اور پیمبر ہونے کی حیثیتوں سے بجائے خود اس کی لامتناہی اور جاودانی رحمتوں کے مستحق ترین فرد ہیں، اس لیے دعا گزار ربّ کریم کے حضور میں اُن کا ذکر کر کے رَب کی بیش از بیش عنایتیں اپنے شامل حال کر لیتا ہے!

کس کے قلم اور کس کی زبان میں طاقت ہے جو ''حبیب کبریاء'' صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف، آپ کے خصائص، آپ کی نعت و سیرتِ پاک لکھنے اور بیان کرنے کا حق ادا کر سکے؟! اسی لیے بڑے سے بڑے بلند پرواز، قادرالکلام شاعروں، ادیبوں اور خطیبوں نے ہمیشہ اپنے عجز کا قرار واقعی اعتراف کیا ہے۔

عرفی کا مشہور شعر ہے۔

عُرفی مشتاب این رہِ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

(اے عرفی جلدی شتابی نہ کرو، یہ نعتِ پیمبر کا راستا ہے کوئی صحرا، کوئی اور وادیِ تخیل، نہیں ہے، آہستہ چلو یہاں تلوار کی دھار پر راستا طے کرنا ہے)۔

اسی قصیدے کا ایک اور شعر ہے۔

دانش نکشاید بسزا عقدہَ نَعتَت
زین جاست کہ اندیشہ نگون کرد علم را

(علم و دانش کے زور سے آپؐ کی نعت کا عقدہ حل نہیں ہوسکتا، یہی وہ مقام ہے جہاں فکر و تخیل نے اپنا پرچم سرنگوں کر دیا ہے!)

اور غالبؔ کا یہ مقطع بھی بہت مشہور ہے۔

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم

کان ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است!

(غالبؔ ہم نے آقا کی ثنا، حضرت یزداں پر چھوڑ دی ہے کیونکہ وہی ذات پاک اس ستودہ صفات کی مرتبہ داں ہے!)

حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی سیرتِ طیبہ کا سچا مرقع تو ربِّ کریم کا ''قرآن'' ہی ہے جس میں آپ کے ''خلق عظیم'' اور ''رحمتِ عالمین'' ہونے کے اسنادِ الٰہی ثبت ہیں اور جس کے آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی عبادت و بندگی ، مجاہدۂ نفس اور جہاد فی سبیل اللہ کی کوئی حدّ و انتہا سامنے نہ آسکی بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ارشاد فرمانا پڑا:

''اے میرے حبیب نمازیں پڑھو، مگر کم...''

﴿یا اَیُّھا المُزَّمِّل قُمِ اللَیلَ اِلاَّ قَلِیلاً ...﴾

یارب کریم کو یہ فرمان صادر کرنا پڑا کہ:

''اے میرے پاک و پاکیزہ، طیب و طاہر، اے طٰہٰ، اے نفاست کے پیکر، میں نے قرآن تمہارے اوپر اس لیے نہیں اتارا کہ اتنی زحمتیں اور مشقتیں اٹھاؤ...''

﴿طٰہٰ مَا اَنزَلنَا عَلَیکَ القُرآنَ لِتَشقیٰ﴾

''...لگتا ہے تم اس غم میں کہ لوگ مجھ پر ایمان نہیں لاتے اپنی جان دے ڈالو گے...''

﴿لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَفسَکَ اَلاَّ یَکُونُوا مُؤمِنِینَ...﴾

قرآن مجید کے ان آیات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت

کیسی محبت الٰہیہ، کیسے تعلق خاص اور کس قدر محبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے اور جناب رب العزت کی نسبت آپؑ کی بندگی اور جاں نثاری کی کیسی بے پناہ کیفیت سامنے آتی ہے۔

جب آپؑ نے مخلوق ہو کر اس کی بندگی میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی تو وہ آپؑ پر اپنی رحمتوں کا سلسلہ کیسے منقطع کر سکتا ہے اسی لیے اس نے ارشاد فرمایا:

''اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً'' (سورۂ احزاب ۵۶)

''حق یہ ہے کہ اللہ اور اُس کے فرشتے اِس نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی اُن پر درود بھیجو اور اُن کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کرو جو اطاعت اور تسلیم کا حق ہے!''

اور اسی لیے ہر دعا گزار کی دُعا کا ایک ضروری جزو ''صلوٰت'' ہوتی ہے۔ چنانچہ اس دعائے افتتاح میں بھی یہ صَلوٰت کا جزو بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

اِس فقرۂ دعا میں جو الفاظ آئے ہیں اُن کے معانی ترجمے سے ظاہر ہو گئے ہیں۔ ان کے مزید اشتقاقی اور تصریفی مسائل سے یہاں صرفِ نظر کرتے ہیں۔ اور ان محدود و معدود سطور و صفحات میں جس قدر بھی ممکن ہے ''سیرتِ طیّبہ'' ہی سے متعلق نکات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

☆☆☆

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آئینۂ سیرت اسماء و صفاتِ ربانیہ کی غیر منقطع تجلیّات سے اس قدر معمور ہے کہ اس آئینۂ جلال و جمال کا کوئی ایک جوہر

بھی کسی کی چشم حیراں میں سمانہیں سکتا۔ تاریخ کی کتابوں میں جو کچھ ہے وہ آپ کی حیاتِ جاوداں کا بس ایک ایسا پرتو ہے جو اس خاکنائے دہر کے لیے قابل تحمل ہوسکتا تھا، بلکہ اس سے بھی کم!

آپؐ کی تاریخِ تخلیق کا مصرع تو لوحِ عرش کی زینت ہے، نہ اسے کوئی پڑھ سکتا ہے نہ بتا سکتا ہے کہ آپ کا نورِ مبارک کب خلق ہوا، ہمیں تو آپؐ ہی کی زبانی معلوم ہوا:[1]

''اَوَّلُ ما خَلَقَ اللّٰہُ نُورِی''

''معبود نے سب سے پہلے جو خلق کیا وہ میرا نور تھا''

اسی طرح کوئی نہیں بتا سکتا کہ آپؐ کی نبوت کا سلسلہ کب شروع ہوا، آپ کا یہ ارشادِ مبارک آپؐ کی نبوت کے کسی درمیانی مرحلے کا سُراغ دیتا ہے:

''کُنْتُ نَبِیّاً وآدمُ بَیْنَ الْمَآءِ وَالطِّیْنِ''

''میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے''

ہاں جب آپ نے اس خاکنائے دہر کو اپنے ظہور سے منور فرمایا تو وہ ماہِ ربیع الاول کی ۱۷ر تاریخ جمعہ کا دِن عام الفیل کا پہلا سال اور سن عیسوی کے لحاظ سے ۵۷۰ء کا سال تھا۔

آپؐ کی ولادت حرم الٰہی مکۂ مکرمہ میں اللہ کے ولی اور کعبہ کے متولی حضرت ابوطالب علیہ السلام کے گھر میں ہوئی۔ یہ گھر آج تک محفوظ اور دارالقرآن کے نام سے موسوم ہے!

---

[1] راقم کے ایک نعتیہ قصیدہ کی ایک بیت ہے۔

ظلمتِ تاریخ کے فرزند کیا پائیں سُراغ
اس کی تاریخِ تجلّی عرش پر تحریر ہے

آپؐ نے ۵۳؍برس اسی شہر میں گزارے، ۴۰؍برس خاموش عملی تبلیغ کے اور ۱۳؍برس رسالت کے منصب پر فائز ہو کر ہمہ گیر طور پر پیغام رسانی کے۔ ۱۰؍برس مدینہ منورہ میں گزارے اور اسی شہر کو اپنا حرم قرار دیا۔ جب آپ نے ۲۸؍صفر ۱۱ہجری کو دارِ بقا میں لقائے خدا اختیار فرمایا تو اسی سرزمین کو قیامِ قیامت تک آپ کے جسدِ اطہر کی امانت داری کا شرف نصیب ہوا۔

''صَلَوٰتُ اللّٰهِ وَصَلَوٰتُ مَلاَئِكَتِهٖ وَاَنْبِيَائِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجَمِيْعِ خَلْقِهٖ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَالسَّلَامُ عَلَيْهِ وَ عَلَيْهِمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهُ!

☆☆☆

۶۳؍برسوں کی مدتِ زمانی میں آپؐ نے وہ نمونۂ زندگی پیش کیا جس سے اس خاک زار کے کسی بھی گوشے میں اور کسی بھی عہد میں گزر بسر کرنے والا کوئی بھی بشر، فائدہ اٹھا کر ''خدا رسیدہ انسان'' بن سکتا ہے!

سبھی انبیا خالقِ کائنات اور معبودِ برحق کی وحدانیت کا پیام لے کر آئے تھے لیکن تقریباً ہر نبی کی یا تو زندگی ہی میں یا اس کی وفات یا شہادت کے فوراً بعد اس کے ماننے والوں میں کسی نہ کسی صورت سے شرک و بت پرستی داخل ہو گئی۔ لیکن آپؐ کے کمالِ تبلیغ نے حقیقتِ توحید کو ذہنوں اور ضمیروں میں اس طرح راسخ کر دیا کہ ذاتِ باری گویا انسانی ادراکات (Perceptions) کے دائرے میں آ گئی اور آپؐ کے زیرِ داماں پروردہ ذہانت نے کہا:

''لَوْ كُشِفَ الغِطَآءُ لَمَا ازْدَدْتُ يَقِيناً''

''اگر پردے ہٹا دیے جائیں تو میرے یقین میں کوئی اضافہ نہ ہوگا''

یہی نہیں آپؐ کے ادائے حق رسالت کا لازوال اثر یہ ہے کہ آج تک آپؐ کے دین میں کسی بھی شکل وصورت میں شرک و بت پرستی کا نفوذ نہ ہوسکا۔ نہ آئندہ قیامت تک اس کا امکان ہے! ارباب فکر ونظر کے لیے اس نکتہ میں ختمِ نبوت کا ایک بڑا راز پوشیدہ ہے!

آپؐ نے مدینہ منورہ میں ''مدینۂ فاضلہ'' بلکہ ''مدنیّتِ الٰہیہ'' کی بنیاد رکھی! افرادِ انسانی کو انفرادی زندگی بسر کرنے کے آداب سکھانے کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کو معمور رکھنے کے اصول اور قوانین تعلیم فرمائے۔ تھوڑے تھوڑے قوانین کے مجموعے تو گزشتہ انبیاء کی میراث سے بھی بعد کے انسانوں تک منتقل ہوتے آئے تھے لیکن آپ نے قیامِ قیامت تک کے لیے پہلے سے وضع شدہ قوانین کی غیر موجودگی میں تازہ قوانین بنانے کے اصول اور ضوابط بھی تعلیم فرمائے۔ یہ بات بھی منجملۂ اسرارِ خاتمیت ہے!

آپؐ نے اللہ کے تمام احکام اور اللہ ہی کے دیے ہوئے حکم اور حق کے تحت اپنے بنائے ہوئے تمام قوانین کے نفاذ میں بھی دنیا کے سامنے مثالی کردار پیش کیا اور اخلاق کی اس بلندی پر فائز ہوئے کہ خالقِ کائنات نے ''اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیم'' کی لفظی سَنَد عطا فرمانے کے ساتھ ساتھ عملاً آپؐ کو ''معراج'' کا شَرَف بخشا!

اہلِ دل آگاہ ہیں کہ معراجِ مصطفوی بھی مقامِ ''ختم نبوت'' کا ایک سُراغ نامہ ہے!

آپؐ نے اپنی مختصری زندگی میں تقریباً ۶۷ ر(یا بقولے ۸۴) چھوٹی بڑی جنگیں لڑیں، جو سب کی سب دفاعی تھیں اور جن میں آپ کی حکمتِ عملی سے مثالی حد

تک کم سے کم خوں ریزی ہوئی اور زیادہ سے زیادہ احکام، اقدار اور جان و مال و ناموسِ انسانی کی حفاظت ہوئی بلکہ اپنے جانبازوں کے لیے آپؐ کے فرامین حقوقِ بشری کے ساتھ ساتھ زمینوں، کھیتوں، درختوں اور حیوانوں تک کے حقوق کی نگہداشت کے مثالی دستور کی حیثیت رکھتے ہیں!

"عَبْدِکَ"

دعائے افتتاح میں صلوٰت کا یہ فقرہ ہو، یا اذان و تشہدِ نماز میں رسالت کی گواہی کے جملے، اکثر مقامات پر آپ دیکھیں گے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نام نامی کے ذکر کے بعد آپ کی رسالت کی گواہی سے پہلے آپ کی "عبدیت" کی گواہی دی گئی ہے! بجائے خود اس میں بڑے بڑے اسرار و آیات پوشیدہ ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی "شانِ بندگی" کی عظمتوں کا بھی کوئی ٹھکانہ ہے؟!

آپؐ کی "لامتناہی عبدیت" معراج بداماں ہے! سورۂ اسراء کا مطلع کس مسلمان، مومن اور عاشقِ رسول کو یاد نہ ہوگا؟ جس میں ربِّ سبحان نے اپنے بندۂ خاص کی "دعوتِ لاہوتی" کا تذکرہ کر کے خود اپنی بڑائی بیان کی ہے:

﴿سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی الَّذِیْ بَارَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ آیَاتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾

"پاک ہے، منزہ ہے جس نے اپنے بندے کو راتوں رات سیر کرائی، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، جس کے گرد و پیش کو ہم نے پُر برکت

بنایا ہے تا کہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں، یقیناً وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے!''

معراج واسرائے پیغمبرؐ کے موضوع پر پوری بحث کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اس مقام پر لفظ ''عَبْدِکَ'' کی اہمیت اور اس کی تشریح میں ایک ارشاد نبوی بھی سماعت فرمالیں۔ مبرّد نے الکامل میں نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''لا تَرْفَعُوْنِی فَوْقَ قَدْرِي، فَتَقُولُوا فِيَّ مَا قَالَتِ النَّصارىٰ فِی الْمَسِيحِ، فَإِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَنِی عَبْداً قَبْلَ اَنْ يَّتَّخِذَنِی رَسُوْلاً''

''مجھے میری واقعی قدر و منزلت سے اوپر نہ اٹھانا کہیں تم میرے بارے میں ویسی بات کہنے لگو جو نصاریٰ نے مسیح کے بارے میں کہدی، اس لیے کہ اللہ نے مجھے اپنا پیمبر بنانے سے پہلے اپنا بندہ بنایا ہے''!

یہیں پر ایک یاددہانی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسی روایت کو توڑ مڑور کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حاسدوں نے ایسی روایتیں بھی بنا ڈالی ہیں اور وقتاً فوقتاً اسے اپنی تحریروں اور تقریروں میں پیش کرتے رہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا مجھے مجھ سے پہلے کے انبیاء اور مرسلین سے افضل و برتر قرار نہ دو... ظاہر ہے کہ وہ روایتیں بے اصل ہیں۔ آنحضرتؐ کی فضیلت تمام انبیاء پر عقلاً اور نقلاً ہر طرح ثابت اور آشکارا ہے۔ اس میں کوئی جائے بحث نہیں، اصل روایت یہی ہے جو مبرّد کے حوالے سے عرض کی گئی۔

یقیناً آپ ''ابن اللہ'' نہیں ہیں، ''ثالث ثلاثہ'' نہیں ہیں، آپ معبودِ

وَاحِد واحَد کے وَاحِد واحَد بندے ہیں۔

ع وہ خالقِ کل ہے تو یہ کاملِ مخلوق!!

☆☆☆

''رَسُوْلِکَ''

آپ کی شانِ رسالت اور اَسرارِ خاتمیت پر چند اشارے گزشتہ سطور میں گزر چکے، یہاں پر ہم صرف لفظ رسول پر تھوڑی سی گفتگو کرنا چاہیں گے۔

''رسول'' کے لفظی یا لغوی معنی ہیں ''بھیجا ہوا''۔ قرآن مجید میں اس کا اطلاق فرشتوں پر بھی ہوا ہے اور انسانوں پر بھی۔ لیکن ''اصطلاحی'' تعریف کے لحاظ سے ''مرتبہ رسالت و نبوت'' پر ربِّ کریم نے صرف اپنے والہانہ اطاعت شعار اور ''انسانِ کامل'' بندوں کو منصوب فرمایا ہے اور انہیں سندِ رسالت کے طور پر معجزات عطا فرمائے۔

ہمارے نبی کریم حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی بہت سے معجزات عطا فرمائے گئے۔ لیکن آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ ''قرآنِ مجید'' ہے۔ جس کے بارے میں دُعا کے آئندہ فقروں کے ضمن میں کسی قدر تفصیلی بحث آئے گی۔

بعض علماء و حکماء نے معجزات کی دو قسمیں قرار دی ہیں: ''قولی معجزات'' یعنی وہ معجزات جن کا تعلق صرف لفظ و بیان سے ہے جیسے ''قرآنِ مجید''۔ اور ''فعلی معجزات''، یعنی وہ معجزات جن کا تعلق عمل اور عناصرِ خارجیہ سے ہے۔ جیسے سرکارؐ کے ہاتھوں پر سنگریزوں کا کلمہ پڑھنا، درخت کا حرکت کرنا، چاند کا شق ہونا یا سورج کا پلٹنا! اس ضمن میں یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرتؐ کا سب سے بڑا معجزہ ''قرآن'' اپنے ''متن و مُحتویٰ'' کے لحاظ سے تو ''قولی'' معجزہ ہے، لیکن اپنے آثار اور اپنی بقا

اور نہ کوئی فرومائیگی میں اس کا سرپرست

(اے بڑائی کرنے والو!) بڑائی کرو اسی کی جیسی اس کی بڑائی کرنی چاہیے

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے اس کے تمام کے تمام اوصاف حمیدہ کے ساتھ

اس کی تمام کی تمام نعمتوں پر!

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے

نہ جس کی بادشاہی میں کوئی اس کی مخالفت کرنے والا ہے

اور نہ اس کے نظام میں کوئی اس سے جھگڑنے والا ہے

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے۔ جس کی کارگاہِ خلقت میں کوئی شریک نہیں ہے

اور نہ اس کی عظمت میں کوئی اس کا مثل ونظیر ہے

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے۔ جس کا حکم اور جس کی حمد تمام خلقت میں آشکارا ہے

جس کی بزرگی اس کے کرم سے ہویدا ہے

اور جس نے فیاضی کے لیے اپنے ہاتھ کھول رکھے ہیں

جس کے خزانے میں کمی نہیں ہوتی

اور داد و دہش کی زیادتی سے اس کے یہاں کوئی اضافہ نہیں ہوتا

سوائے فیاضی اور کرم گستری کے

وہی ہے۔ بس وہی قدرتمند اور داتا

اے معبود! میں سوال کر رہا ہوں تجھ سے! بہت زیادہ میں سے بہت کم کا

جبکہ مجھے اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے اور تو اس سے ہمیشہ سے بے نیاز ہے

اور وہی ''کم'' میرے لیے بہت زیادہ ہے

جبکہ (اس کا عطا کرنا) تیرے لیے بہت آسان اور معمولی کام ہے!!

کے لحاظ سے یہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فعلی معجزہ بھی ہے!

اس کے علاوہ آپؐ کا ایک فعلی معجزہ جو آج تک باقی ہے اور قیامت تک آپؐ کی شانِ اعجاز کی طرف لوگوں کی توجہ کو مبذول کراتا رہے گا وہ مسجد نبویؐ کے ''قبلہ'' کا تعین ہے!

اس کی شرح و تفصیل علیٰحدہ مقالے کی متدعی ہے۔

یہ سب اپنی جگہ پر، لیکن ہمارے ایک مرثیہ نگار شاعر ڈاکٹر سید صفدر حسین مرحوم نے کیا اچھی اور سچی بات کہی ہے کہ

ع ''معجزے دو تھے پیمبرؐ کے علیؑ اور قرآن''

دعا کے اس کے بعد کے فقرے میں وصیِ رسولؐ و معجزۂ خاتم حضرت علی مرتضٰی علیہ السلام ہی پر درود و صلوٰت کا ذکر ہے۔

☆☆☆☆☆

(۲۱)

سلامِ فروزاں

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَیٰ عَلِیٍّ اَمِیرِ الْمُؤْمِنِینَ

وَوَصِیِّ رَسُولِ رَبِّ الْعَالَمِینَ

عَبْدِکَ وَوَلِیِّکَ

وَاَخِي رَسُولِکَ

وَحُجَّتِکَ عَلَیٰ خَلْقِکَ

وَآیَتِکَ الْکُبْرَیٰ

وَالنَّبَأُ الْعَظِیم

اے معبود! رحمت فرما امیر المومنین،

وصی رسول،

اپنے بندۂ خاص اور اپنے ولی

اپنے رسول کے بھائی

اور اپنی تمام خلقت پر اپنی ''حجت''،

اپنی بزرگ نشانی

اور اپنے ''عظیم ترین پیغام'' علیؑ پر!

☆☆☆

دعائے افتتاح کا یہ فقرہ حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بارے میں تمام عقائدِ حقہ بلکہ آپؑ سے متعلق جملہ مباحث کا بہترین خلاصہ ہے۔

دعا کے اسی فقرے کی مکمل اور مفصل شرح کی جائے تو کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک مستقل کتاب تیار ہو جائے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ آج تک حضرتِ

امیر المؤمنین علیہ السلام کے بارے میں قرآن وحدیث کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن سب کو دُعائے افتتاح کے اس فقرے کی شرح سمجھنا چاہیے۔

''علیؑ'' نام ہے اور آپ کی بلند پایہ ذات کا ایک نامی حوالہ ہے۔

''امیر المؤمنین'' آپ کے ظاہری منصبِ الٰہی کا شناس نامہ ہے۔

''عَبدِکَ'' آپ کی مخصوص عرفانی حقیقت کا استعارہ ہے،

''ولیک'' آپ کے باطنی عُہدہ ٔ ربّانی، واسطہ ٔ فیض رحمانی اور وسیلہ ٔ فیضانِ رحیمی ہونے کا تعارف نامہ ہے۔

''اخی رسولک'' آپ کی شخصیت کے تمام نَسبی اور نَسبی فضائل ومناقب کا حسین ترین کنایہ ہے۔

''وَحُجّتکَ علیٰ خلقک'' خدا اور دینِ خدا کی طرف آپ کی رہنمایانہ حیثیت اور عصمت کا توثیق نامہ ہے۔

''آیتک الکبریٰ'' اور ''نبأ عظیم'' آپ کی ذات وشخصیت کے قرآنی استعارے اور القاب ہیں۔

میں نے اس سے قبل کہیں لکھا ہے اور بارہا منبروں سے کہا ہے کہ:

''حق ناشناس لوگ خصوصیت کے ساتھ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے مقام ومنصب اور آپ کے فضائل میں شکوک وشبہات رکھتے ہیں یا پیدا کرتے ہیں اور کبھی کبھی یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ کا نامِ نامی قرآن میں کیوں نہیں آیا؟ حالانکہ کب نہیں آیا اور کہاں نہیں آیا؟

جب کسی شخصیت میں گونا گوں صفات ہوتے ہیں تو اسی مناسبت سے اس

کے نام اور القاب بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ ربّ کریم نے تو اپنے اس جامعِ کمالات ''ولی'' اور مظہرِ صفات ''بندے'' کا ذکر ایک سے ایک اچھے اسماء والقاب کے ساتھ قرآنِ مجید میں جا بجا فرمایا ہے! کہیں صراطِ مستقیم کہا ہے تو کہیں امام مبین، کہیں ''حبلِ متین'' کہا ہے تو کہیں ''مآءِ معین''، کہیں ''خیر البریّہ'' کہا ہے تو کہیں ''صالح المومنین''، کہیں ''نباءِ عظیم'' کہا ہے تو کہیں ولیِ امرِ مُسلمین، بلکہ ولیِ امرِ عالمین...

کہیں کتاب کہا ہے تو کہیں ذکر، کہیں صلاۃ کہا ہے تو کہیں صبر، کہیں اذان کہا ہے تو کہیں دُعا!...

کہیں ''ولی'' کہا ہے تو کہیں وسیلہ، کہیں عدل کہا ہے تو کہیں احسان، کہیں حیاۃ کہا ہے تو کہیں ایمان... کہیں وصی کہا ہے تو کہیں وارث... کہیں خلیفہ کہا ہے تو کہیں امام!

معلوم ہے کہ تاریخ میں آپ کے صرف چند نام، القاب اور کنیتیں زیادہ مشہور ہیں مثلاً علی، حیدر، امیر المومنین، مرتضیٰ، ابوالحسن اور ابوتراب، یعسوب الدین، یعسوب المسلمین وغیرہ۔

غالبؔ نے اپنی ایک فارسی کی دُعائیہ نظم میں بڑے حُسن کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کے چند اسماء والقاب کو ایک ہی مصرع میں نظم کیا ہے۔

حرمتِ جانِ محمدؐ یک نظر کن سوئے من

یا علی یا مرتضیٰ یا بوالحسن یا بوتراب!

ہمارے مشہور مُفکر شاعر سَر ڈاکٹر اقبالؔ نے جناب امیر المومنین علیہ السلام کے اسمائے مبارکہ کے کچھ اسرار اپنی مثنوی اسرار خودی میں بیان کر کے اس

منظومہ کی زینت اور معنویت میں چار چاند لگائے ہیں اور اس فصل میں ایسے نکات پیدا کیے ہیں جس سے اُن کے فلسفہ اور پیغام کو تقویت ملتی ہے۔

اقبالؔ کے یہ اشعار یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"درشرحِ اسرارِ اسمائے علی مرتضیٰؓ"

مسلمِ اوّل شہِ مرداں علیؓ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ
از ولائے دودمانش زندہ ام
در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام
نرگسم وارفتۂ نظارہ ام
در خیابانش چوبو آوارہ ام
زمزم ارجوشد زخاکِ من از اوست
مے اگر ریزد زتاکِ من از اوست
خاکم و از مہرِ او آئینہ ام
می تواں دیدن نوادر سینہ ام
از رُخِ او فال پیغمبرؐ گرفت
ملّتِ حق از شکوہش فرگرفت
قوتِ دینِ مبیں فرمودہ اش
کائنات آئین پذیر از دودہ اش

مُرسلِ حق کرد نامش بوتراب
حق ید اللہ خواند در اُم الکتاب
ہر کہ دانائے رموزِ زندگیست
سرِّ اسمائے علیؓ داند کہ چیست
خاکِ تاریکے کہ نامِ او تن است
عقل از بیدادِ او در شیون است
فکرِ گردوں رس زمیں پیما ازو
چشم کورو گوش ناشنوا ازو
از ہوس تیغِ دو رُو دارد بدست
رہرواں را دل بریں رہزن شکست
شیرِ حق ایں خاک را تسخیر کرد
این گلِ تاریک را اکسیر کرد
مرتضیٰؓ کز تیغِ او حق روشن است
بُوتراب از فتحِ اقلیمِ تن است
مرد کشور گیر از کرّاری است
گوہرش را آبرو خود داری است
ہرکہ در آفاق گرد بوتراب
باز گر داند زمغرب آفتاب
ہرکہ زیں برمرکبِ تن تنگ بست
چوں نگیں برخاتمِ دولت نشست
زیرِ پاش اینجا شکوہِ خیبراست
دست او آنجا قَسِیمِ کوثر است

از خود آگاہی یداللہی کند
از یداللہی شہنشاہی کند
ذات او دروازۂ شہر علوم
زیر فرمانش حجاز و چین و روم
حکمراں باید شدن بر خاکِ خیش
تا مئے روشن خوری از تاکِ خیش
خاک گشتن مذہبِ پروانگی است
خاک را اب شو کہ ایں مردانگی است

بلاشبہ حضرتِ امیر المؤمنین علی مرتضٰی علیہ التحیۃ والثنا کی ذاتِ مبارک حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک زندہ مجسم اور لازوال معجزہ ہے۔ اور منجملۂ اسرار خاتمیت ہے!

• آپ کی ولادت ۱۳ ؍ رجب المرجب ۳۰ عام الفیل کو مکۂ مکرمہ میں جوفِ کعبہ میں ہوئی، اور یہ وہ شرف ہے جو کبھی کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ جیسا کہ ائمۂ حدیث و تاریخ: حاکمِ نیشاپوری، ابنِ صباغ مالکی، ابو عبداللہ محمد بن یوسف شافعی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ملاّ مبین فرنگی محلی اور بہت سے محدثین و مورخین نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مرزا دبیر علیہ الرحمہ کی ایک رُباعی کے آخر کے دو مصرعے ہیں ؎

ہوں بیت سے جس طرح عیاں معنیِ بیت
یوں ہم نے علیؑ کو حق کے گھر سے پایا

اردو، فارسی، ترکی، عربی اور دوسری زبانوں میں بھی شاہکار قصیدے کہے

گئے ہیں، لیکن مجھے سنائی کا یہ شعر بہت پسند ہے:

در پسِ پردہ آنچہ بود آمد
اسد اللہ در وجود آمد

اور اسی طرح عربی کی یہ بیت ۔

مَا لُفَّ فِي خِرَقِ القَوَابِلِ مِثْلُهُ
الَّا ابْنُ آمِنَةَ النَّبِيِّ مُحَمَّدُ

• آپ کی ولادت سے پہلے اور ولادت کے وقت ہی کے معجزات وکرامات اتنے ہیں کہ انہیں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے اور ان سے متعلق تمام روایات میں پوشیدہ اَسرار اور ان اَسرار کے تاویلات پر بحث کی جائے تو بجائے خود ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ اسی سے ظاہر ہے کہ آپؑ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کرامات و معجزات بداماں تھا!

• آپ نے اس دنیا میں کل ۶۳ برس گزارے۔ جس میں ۳۳ برس اپنے ابنِ عم، استاد و مربی، رسول خاتم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ بسر کیے۔ اُنہیں کی آغوشِ نُور اور سایۂ رحمت میں پروان چڑھے اور انہیں کے قدم بہ قدم تمام مہماتِ رسالت میں کارپرداز رہے!

• آپؑ کے ذاتی اوصاف میں تمام اُصولِ اخلاق ؛ حکمت و شجاعت و عفت کا ایسا ہی اجتماع تھا کہ آپ آیتِ مباہلہ میں صاحب خلقِ عظیم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے بمنزلہ ''نفس'' قرار دیے گئے۔

• آپؑ کے علم کے چرچے محبوں اور مبغضوں دونوں ہی کی زبانوں پر اپنے اپنے انداز سے، شروع سے آج تک جاری رہے ہیں۔ جمعِ قرآن و تفسیر قرآن اور فی الجملہ علومُ القرآن کے باب میں آپ کے کارنامے، تالیف و تحفظِ سیرتِ نبویہ میں آپ کے مجاہدات، بیان و بلاغت میں آپ کے معجزات، علومِ ادب کے ایجاد اور

تدوین میں آپ کے اولیّات، قیامِ قیامت تک سبیلِ علم وحکمت بنے رہیں گے۔

• آپ کی شجاعت کے باب میں چاہے بدر واحد وخیبر وخندق وحنین کے غزوات ہوں، چاہے جمل وصفین ونہروان کے معرکے، چاہے عہدِ نبویؐ میں یمن سے لے کر خود اپنے عہد حکومت میں سرحدِ ہند وسندھ تک کے فتوحات، تاریخ عزیمت وشرف انسانی میں تجلی بار حرفوں سے لکھے ہوئے کارنامے ہیں۔

• آپؑ کی سیاست عدلِ الٰہی کا مکمل آئینہ تھی۔ جو اہلِ دنیا اور طالبانِ دنیا کے لیے ناقابلِ تحمل تھی، اسی لیے جمل وصفین کے معرکے پیش آئے اور یہی عدل گسترانہ راہ وروش آپ کی شہادت کا سبب بنی۔ اس سلسلے میں آپ کا ایک انتہائی بلیغ جملہ گوشِ تاریخ میں گونجتا رہتا ہے: ''انا قتیل العدالة'' ''میں کشتۂ عدالت ہوں'' آپ کی شہادت کا واقعہ یہ ہے کہ ایک باغیانہ منصوبہ کے تحت انتہائی سازشی انداز میں ۱۹ر رمضان المبارک کو مسجد کوفہ میں، نماز فجر میں آپ کے اوپر قاتلانہ حملہ کیا گیا، اور ۲۱ر رمضان المبارک ۴۰ھ کو آپ نے اس دارِ فنا سے دارِ بقا کی جانب توجہ فرمائی۔

کردیا کلکِ مشیت نے بصد ناز و نیاز
فرقِ محراب پہ تاریخِ شہادت تحریر
م ۴۰ ھ

آپ کی ولادت اور شہادت دونوں واقعات کو ایک ہی شعر میں بہت سے شعراء نے نظم کیا ہے لیکن اس موضوع ومضمون کا غالباً سب سے مشہور شعر شیخ سعدی کا ہے۔

کسے را میسر نہ شد ایں سعادت
بہ کعبہ ولادت بہ مسجد شہادت

اَللّٰهُمَّ

اِنَّ عَفْوَکَ عَنْ ذَنْبِي

وَتَجاوُزَکَ عَنْ خَطِيئَتِي

وَصَفْحَکَ عَنْ ظُلْمِي

وَسِتْرَکَ عَلىٰ قَبِيحِ عَمَلِي

وَحِلْمَکَ عَنْ کَثِيرِ جُرْمِي

عِنْدَما کانَ مِنْ خَطاءِ ي وَعَمْدِي

اَطْمَعَنِي

فِي اَنْ اَسْأَلَکَ مالا اَسْتَوْجِبُهُ مِنْکَ

الَّذِي رَزَقْتَنِي مِنْ رَحْمَتِکَ وَاَرَيْتَنِي مِنْ قُدْرَتِکَ

وَعَرَّفْتَنِي مِنْ اِجابَتِکَ

فَصِرْتُ أَدْعُوکَ آمِنًا

وَاَسْأَلُکَ مُسْتَأْنِساً لاخائِفاً وَلاوَجِلاً

مُدِلًّا عَلَيْکَ فِيما قَصَدْتُ فِيهِ اِلَيْکَ

فَاِنْ أَبْطَأَ عَنِّي عَتِبْتُ بِجَهْلِي عَلَيْکَ

وَلَعَلَّ الَّذِي اَبْطَأَ عَنِّي هُوَخَيْرٌلِي

لِعِلْمِکَ بِعاقِبَةِ الْاُمُورِ

فَلَمْ أَرَمَوْلىً کَرِيماً

اَصْبَرَ عَلىٰ عَبْدٍلَئِيمٍ مِنْکَ عَلَيَّ

اردو میں لِسان القوم مولانا سید علی نقی صفی لکھنوی کے قصیدۂ لامیہ کے یہ اشعار بھی قابلِ حوالہ ہیں:

مہد سے تا بہ لحد ذاتِ خُدا پر تکیہ
مسقط الرأس حرم، مسجدِ کوفہ مقتل
ذکرِ توحید ہے بے ذکرِ علی لاحاصل
نقدِ اسلام ہے بے حبِّ علی جنسِ دغل [1]

☆☆☆

تاویلِ آیات کے باب میں وارِد ارشاداتِ نبویہ میں سورۂ والشّمس کی آیت ''اِذِانبَعَثَ اَشقٰھَا'' کی تاویل میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا قاتل ''اشقی الآخرین'' اور ''اشقی الناس'' ہے!

بظاہر آپؑ کا قاتل ایک خارجی تھا۔ لعنۃ اللہ علیہ وعلیٰ مَن اَیدہ من الاولین والآخرین۔ لیکن تاریخ کے دقیق مطالعہ اور تجزیہ سے آپ کے قتل کی تمام تر ذمہ داری 'باغیِ شام' پر عائد ہوتی ہے۔

کوئی چاہے اس سے اختلاف کرے یا اس کا اعتراف، اور قتلِ امیر المؤمنین علیہ السلام کی اصلی ذمہ داری جس پر بھی عائد ہوتی ہو، قرآنِ کریم کی یہ آیتیں اُس کے انجام کی پوری خبر دیتی ہیں:

---

[1] لسان القوم مولانا سید علی نقی صفی لکھنوی، اردو شاعری کے اساتذۂ متاخرین میں فردِ فرید، اور استادِ وحید کی حیثیت رکھتے ہیں تھے۔ اُن کا ۱۰۵ اشعار پر مشتمل یہ قصیدہ تمام مشتاقانِ ادب وعرفان کے پڑھنے کی چیز ہے، اور اردو کے عرفانی شعروادب کا ایک بہترین حصہ ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

پیچ در پیچ ہے شیرازۂ اسباب وعلل
رازِ ہستی ہے عجب عقدۂ مالا ینحل

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِآیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّ یَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ• اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ فِی الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃِ وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ﴾ (سورۂ آلِ عمران، آیات ۲۱،۲۲)

''جولوگ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں، اور ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں، اُنہیں دردناک عذاب کا مژدہ سنادو، یہ وہ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں اکارت ہوگئے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے!''

☆☆☆

''امیر المؤمنین''

دعائے افتتاح کے زیرِ غور فقرے میں نامِ نامی کے بعد ''امیر المؤمنین'' کے لقب کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسے یہاں پر نام سے پہلے نہیں لایا گیا ہے، جیسے عام طور پر مسلمانوں کی تاریخ میں بہت سے ناموں سے پہلے یہ لقب اُن کے سیاسی منصب کو ظاہر کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ حدیث و تاریخ سے خصوصاً روایاتِ اہلبیت علیہم السلام سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ یہ لقب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی حیاتِ طیبہ میں حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا۔ اور تمام لوگوں کو حکم دیا تھا کہ: ''سَلِّمُوْا عَلٰی عَلِیٍّ بِاِمْرَۃِ الْمُؤْمِنِیْنَ...'' ''علی پر امیر المؤمنین کہہ کر سلام کرو!''

اصل روایت اصحابِ منتجبینِ رسول؛ بُریدۂ اسلمی اور حذیفۂ یمانی کے اسناد سے حدیث کے متعدد مستند مجموعوں میں موجود ہے۔

''وَوَصِيِّ رَسُولِ رَبِّ الْعَالَمِينَ''

حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ علیہ السلام کی ''وِصایتِ پیغمبر'' صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا موضوع ہے جس پر صدر اسلام سے لے کر آج تک کئی اصحابِ علم و ایمان نے مستقل کتابیں تالیف کی ہیں۔

حضرت امیر المومنینؑ کے لیے لفظ ''وصی'' صرف اپنے لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ یہ آپ کا ایک امتیازی لقب ہے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ''مکمل وصی'' تھے، ذاتی حیثیت سے بھی اور منصبی حیثیت سے بھی، ماسوائے نبوت، کہ وہ درِّ یتیم عبداللہ پر ختم تھی۔

جناب خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث صحت کے اُس درجہ پر ہے کہ اِس سے کوئی منکرِ نبوت ہی انکار کرسکتا ہے جسے علامہ ابنِ حجر مکّی نے ''الصواعق المحرقه'' میں اِن الفاظ میں نقل کیا ہے: ''قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وسلم اَمَا تَرضىٰ اَنْ تَكُونَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هٰارُوْنَ مِنْ مُوسىٰ غَيْرَ اَنَّهُ لَا نَبِیَّ بَعْدِي''

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (اے علی) کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ تم مجھ سے اُسی منزلت پر ہو جو منزلت ہاروں کو موسیٰ سے تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا!''

خاص لفظ ''وصی'' زبانِ پیغمبرؐ پر دعوت ذوالعشیرہ سے لے کر میدانِ غدیر تک اور روزِ غدیر سے روزِ وفات تک اتنی بار جاری ہوا ہے کہ ان تمام روایتوں کا ذکر وبیان ایک مجلسِ درس میں ممکن نہیں ہے۔ تاہم تبرکاً وتیمناً ایک روایت نقل کرنے کی سعادت ضرور حاصل کرتے ہیں:

۲۴۲

امام اہل سنت والجماعت احمد بن حنبل نے یہ روایت جنابِ سلمانؓ سے ان الفاظ میں نقل فرمائی ہے:

''قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم: یا سلمان وَصِیِ وَوارِثی وَمُقضِی دینی و مُنجِزُ وعدِي علی ابن ابی طالب کرم اللہ وجھہ''۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے سلمان میرے وصی، میرے وارث، میرے قرض ادا کرنے والے اور میرے وعدے کو پورا کرنے والے علی ابن ابی طالب ہیں''۔

تاریخ وروایات وادبِ عربی کے صدرِ اسلام کے اصلی اور بنیادی مُتون کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے لیے لفظ و لقبِ ''وصی'' کا اختصاص اُس زمانہ میں اس قدر مشہور تھا کہ لوگ عموماً آپؑ کو صرف اسی لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ عربی کے معروف ادیب ابوالعباس المبرّد نے الکامل میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی شہادت پر عربی کے بعض مراثی نقل کیے ہیں۔ جن میں کمیت اسدی کے بعض اشعار بھی شامل ہیں جن میں لفظِ وصی آیا ہے۔ مبّرد نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''الوصی، فھذا شيء کانوا یقولون و یکثرون فیہ''

(المبرد، الکامل ج ۳ ص ۲۰۳)

''الوصی یہ وہ بات (لقب) ہے جسے لوگ (امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے بارے میں) کہا کرتے تھے اور کثرت سے کہتے تھے''۔

اس کے بعد ابن قیس اور بعض دوسرے شعرا کے کلام سے مبرد نے اس

کے مزید شواہد بھی پیش کیے ہیں۔

حوزۂ علمیہ قم کے استاذِ حکمت و عرفان، فقیہ ذیشان علامہ حسن حسن زادۂ آملی نے ایک جگہ لکھا ہے:

این کہ بندہ جناب امیر المؤمنین را بہ لقب وصی نام می برم جہتش این است کہ بہ شہادت مآخذ روائی صحیح و شعرای زمان صدر اسلام و کتاب ہای اصیلِ اسلامی ما، حضرت امیر المؤمنین در صدر اسلام بہ وصی شناختہ شدہ بود، من شواہد در این بارہ فراواں دارم۔ در جای از شرح نہج البلاغہ بہ عنوانِ ہدایت و ارشاد بسیاری از مآخذ را کہ از ہمان صدر اسلام کسانی او را بہ لقب وصی وصف کردہ اند، و در اشعار و غیر اشعار نام بردہ اند، جمع آوری کردہ ام۔"

(عباس عزیزی، فضائل و سیرۂ چہاردہ معصومین در آثار استاد علامہ حسن زادۂ آملی ص ۱۶۲، بحوالۂ گفت و گو ص ۱۳۰)

لفظ و لقبِ وصی کے بارے میں بطورِ استشہاد اب صرف ایک روایت نقل کر کے آگے بڑھتے ہیں، یہ روایت اور بھی اہم امور سے متعلق کچھ بہ ایما اور کچھ بہ صراحت بیان کرتی ہے:

جناب ثابت ابن دینار، ابوحمزۂ ثمالی نے امام محمد باقر علیہ السلام کا یہ ارشادِ گرامی نقل کیا ہے:

"ما احد من هذه الأمة جمع القرآن اِلّا وَصِیّ محمد صلی الله علیه و آله وسلم"

(عبد الرزاق حرز الدین، تفسیر ابوحمزۂ ثمالی، ص ۱۰۳، بحوالۂ تفسیر قمی ج ۲ ص ۴۵۱)

"اس امت میں کسی نے قرآن کو جمع نہیں کیا سوائے وصیِ محمد صلی اللہ

وعلیہ وآلہ وسلم کے''۔

میر انیس نے ایک سلام میں اچھا شعر کہا ہے۔

علیؑ کو کہتے ہیں بے فصل جو وصیِ نبی
وہی نکاتِ حدیث و کتاب سمجھے ہیں!

☆☆☆

''عبدک''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وصلوٰت کے ضمن میں لفظِ 'عبدک' آیا ہے اور یہاں وصیِ نبی علیہما الصلوٰۃ والسلام پر درود وصلوٰۃ کے فقرے میں بھی یہ لفظ موجود ہے۔ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں اور کیسے بندے ہیں اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جنگِ احد میں آپ کے بدنِ مبارک میں تیر پیوست ہوگیا جس میں اس قدر تکلیف تھی کہ اس کا نکالنا دشوار ہو رہا تھا، یہ صورتِ حال جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کی گئی تو آپؐ نے فرمایا جب علیؑ نماز میں مشغول ہوں تو تیر ان کے بدن سے نکال لینا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حالت نماز میں آپؑ کے بدنِ مبارک سے تیر نکال لیا گیا اور آپ کو اس وقت ذرا بھی احساس نہ ہوا''

اِس واقعہ کو مُفسّر عظیم الشان مُلاّ فتح اللہ کاشانی نے تفسیر منہج الصادقین میں، سورۂ مبارکۂ مؤمنون کی آیت ﴿والَّذِينَ هُمْ فِي صَلَوٰتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾ کی تفسیر میں معتبر اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔

شاعرِ معرفت حکیم سنائی غزنوی اور مُلاّ جامی وغیرہ نے اِسے نظم کیا ہے۔ جامی کے اشعار علامۂ بہائی نے کشکول میں بھی نقل کیے ہیں۔

آپؑ کی کثرتِ عبادت پر حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا ارشاد روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے کہ:

''مَنْ یَقْدِرُ عَلٰی عِبادَةِ عَلِیِّ بْنِ اَبِي طَالِب''

''علی بن ابی طالب کے اتنی عبادت کون کرسکتا ہے؟''

ربِّ کریم نے قرآن مجید میں اپنی محبت اور بندگی کی شرط اپنے محبوب پیغمبرؐ کی اطاعت کو قرار دیا ہے:

''قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِي یُحْبِبْکُمُ اللّٰه''

(سورۂ آل عمران، آیت ۳۱)

''(اے رسول کہیے) اگر تم اللہ سے مُحبّت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا!''

حضرت امیر المومنینؑ نے محبتِ خدا اور پیرویِ رسولِ خدا کا کتنا حق ادا کیا، یہ بتا سکنا کسی کے لیے آسان نہیں ہے۔ ہمارے سامنے دو اقوال ہیں انہیں سے کوئی نتیجہ برآمد کیا جاسکتا ہے۔ ایک خود حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''اَنَا عَبْدٌ مِنْ عَبِیْدِ مُحَمَّدٌ''

''میں تو محمد کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں''

اور ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جو آپ نے غزوۂ خیبر میں فرمایا ہے:

''لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَةَ غَداً رَجُلاً کَرَّاراً غَیْرَ فَرَّارٍ یُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَیُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ''

''میں کل پرچم ایسے بہادر کو دوں گا جو بڑھ کر حملہ کرنے والا ہے، بھاگنے

والا نہیں ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اُس سے محبت کرتے ہیں"۔

"وَلِیّکَ"

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی ولایت بجائے خود بے انتہا وسیع موضوع ہے۔ وہ اللہ کے ولی ہیں! اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے مومنین و مسلمین کے ولی ہیں۔ آپؑ کی ولایت کے تشریعی اور تکوینی ابعاد پر کلام وعرفان کی کتابوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ اہلِ تصوف الگ اس عنوان سے اپنے مطالب بیان کرتے ہیں، اور اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ مشہور ہے کہ تصوفِ اسلامی کے تمام یا بیشتر سلسلے حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام ہی کی ذات مبارک تک پہنچتے ہیں۔

ولایتِ مولا علی مرتضیٰ علیہ السلام کے باب میں اساسِ حق وحقیقت ربّ کریم کا یہ قولِ محکم ہے جو سورۂ مائدہ میں "آیۂ ولایت" کی شکل میں موجود ہے:

"اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ آمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْنَ" (سورۂ مائدہ ۵۵)

"تمہارا "ولی" (حاکم وسرپرست) بس اللہ ہے اور اس کا پیغمبرؐ اور وہ ایمان رکھنے والے جو نماز ادا کرتے ہیں اور خیرات دیتے ہیں اس حالت میں کہ وہ رکوع میں ہیں"

اس آیت کے الفاظ اور اس کی شانِ نزول کی روشنی کے پرتو میں علماء نے جس قدر مطالب بیان کیے ہیں اور جتنے احکام ونکات کا اس آیت سے استفادہ کیا ہے اُس کا احاطہ یہاں ممکن نہیں ہے خود اس ناچیز نے دس تقریریں صرف اسی آیت

کے ذیل میں کی ہیں جو علیحدہ کتابی شکل میں ترتیب دی گئی ہیں۔

اس آیت کے علاوہ، حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی ولایت کے باب میں حدیث غدیر کو بھلا کون فراموش کرسکتا ہے جس کا یہ فقرہ ''مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذا علی مولاه'' تاریخِ حدیث میں بے نظیر تواتر کے ساتھ نقل ہوتا آیا ہے اور جس کے بارے میں صدیق مرحوم مولانا ادیب الہندی صاحب نے اپنی کتاب الامام میں حضرت شاہ حسن جائسیؒ کا یہ شعر نقل فرمایا ہے

عبث در معنیِ من کُنتُ مولا می روی ہر سو

علی مولا بہ این معنیٰ کہ پیغمبرؐ بود مولا (الامام ص ۳۲)

☆☆☆

محقق دیلمیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث بھی جداگانہ نقل فرمائی ہے:

''قال رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم: (اِنَّ عَلِيّاً وَلِيُّكم بَعْدِى).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک میرے بعد علی تمہارے ولی ہیں!''

اگر اس حدیث میں ''ولی'' کے معنی صرف دوست لیے جائیں تو میرے بعد کی قید کے کیا معنی ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ یہاں حکومت و سرپرستی ہی مراد ہے جو کہ حینِ حیاتِ پیغمبرؐ کسی اور کے لیے ممکن نہ تھی اور آپؐ کے بعد ہی اِس ولایت کی منتقلی کوئی معنی رکھتی ہے!

☆☆☆

''وَحُجَّتِکَ عَلٰی خَلْقِکَ''

اس میں کیا شک ہے کہ علی علیہ السلام حُجتِ خدا ہیں۔

دیلمی اور خطیب بغدادی کے حوالے سے مولانا ادیب الہندی مرحوم نے الامام میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اَنَا وَعَلِیٌّ حُجَّةُ اللّٰهِ عَلٰی عِبَادِهٖ'' (الامام ص ۳۲)

''میں اور علی اللہ کی حجت ہیں اُس کے بندوں پر!''

اللہ کے نبی اور اس کے ولی اس کی ''آیت'' بھی ہوتے ہیں اور حجت بھی، آیت کے معنی نشانی کے ہیں اُس میں بھی دلالت پائی جاتی ہے اور حُجت کے معنی بھی دلیل و برہان اور مستحکم استدلال کے ہیں! اردو میں ''تو حُجت کرنا'' تکرار کرنا اور جھگڑنے کے معنیٰ میں بولتے ہیں، جب دو آدمی حجت کر رہے ہوں تو وہ بات جو ان میں سے واقعاً حق پر ہونے والے کی حقانیت کو ثابت کرے اصلی حجت تو وہ ہوتی ہے! جو اپنے صفات سے اپنے افعال سے اور اپنے اقوال سے اللہ کے منکروں کا مُنہ بند کر دیں ان کے ہوتے ہوئے کوئی اللہ کا انکار نہیں کر سکتا! جب تک اس دنیا میں جیتے ہیں ان کی ایک ایک سانس اللہ کے وجود پر ''شہادت'' دیتی ہے! اور جب اللہ کا انکار بڑھتا ہے تو یہ اپنی جان دے کر اُس کے وجود پر گواہ بن جاتے ہیں!

☆☆☆

''وَاَخِیْ رَسُوْلِکَ!''

حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ امیر المومنین علیہ السلام کی اُخوت، ابنِ عم ہونے کی حیثیت سے تو مسلم ہے ہی! یہاں یا دوسرے بہت سے مواقع پر اس خصوصی تذکرے کا سبب کچھ اور ہے۔

اے معبود!

تیرا میرے گناہ کو معاف کر دینا

تیرا میری خطا سے درگزر کر جانا

تیرا میری زیادتی سے چشم پوشی کر لینا

تیرا میرے کرتوت کو چھپا دینا

اور میرے بیشمار جرائم پر بردباری اختیار کرنا

جبکہ یہ جرائم میری صریح غلطی سے اور دیدہ ودانستہ سرزد ہوئے

مجھے لالچ دلا رہا ہے

کہ میں تجھ سے وہ سوال کروں جس کا میں تیری طرف سے مستحق نہیں ہوں

اور جو تو نے اپنی رحمت سے مجھے عطا فرمایا اور اپنی قدرت سے مجھے دکھایا

اور اپنی قبولیت سے مجھے آگاہ کیا

تو میں (اپنے اس قدر گناہوں کے باوجود، مستحق سزا ہونے کے باوجو) تجھے چین سے پکار رہا ہوں

اور تیرا آشنا بن کر تجھ سے سوال کر رہا ہوں! نہ ڈر رہا ہوں نہ جھجک رہا ہوں

بلکہ تیرے سامنے اپنی مقصد براری کے لیے ضد کر رہا ہوں

مراد ملنے میں دیر ہوتی ہے تو اپنی جہالت سے تجھ سے ناراض ہوتا ہوں

جبکہ جو مراد مجھے نہیں ملی ہے وہ میرے لیے بہتر ہے

کیونکہ تجھے تمام باتوں کے انجام کی آگہی ہے!

میں نے تو تیرے جیسا کرم فرما آقا کوئی نہیں دیکھا

جو میرے جیسے ذلیل بندے کو برداشت کرے!

عربی کی ایک مثل ہے ''رُبَّ اَخٍ لَمْ تَلِدْہُ والدہ'' [1] ایسے بھائی بھی ہوتے ہیں جو ماں جائے نہیں ہوتے! یہ مثل ایسے سچے دوست کے لیے بولی جاتی ہے جو حقیقی بھائی ہی کی طرح یا اُس سے بھی زیادہ شفیق ہوتا ہے۔ اسی طرح کی ایک مثل اور ہے: ''اِنَّ اَخَاکَ مَنْ آسَاکَ'' حقیقت تو یہ ہے کہ تیرا بھائی وہ ہے جس سے تیری آس بندھی رہے، جو تیرا آسرا بنا رہا ہے!

معلوم ہے کہ دنیا میں کتنے ہی بھائی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے لیے کسی ادیب کا یہ طنزیہ فقرہ صادق آتا ہے کہ 'بھائی تو مادرزاد دشمن ہوتے ہیں' پھر بھی ''بھائی کا رشتہ'' بجائے خود اپنی خالص شکل میں اپنی اہمیت اور تاثیر رکھتا ہے۔ اس کی اچھی بری مثالوں کے بارے میں، مختلف زبانوں میں بہت سے ضرب الامثال رائج ہیں۔ تاہم اِس رشتہ کی جو اہمیت دینی ثقافت، بالخصوص اسلامی تہذیب اور اس کے اثر سے مشرقی طرزِ معاشرت میں ہے وہ اہمیت اس کے علاوہ دوسری تہذیبوں خصوصاً مغربی تہذیت میں نظر نہیں آتی۔

مشرقی طرز معاشرت میں یہ ایک عام بات ہے کہ لوگ ''بھائی کا رشتہ'' کہہ کر بھی قائم کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل دراصل بے لوث محبت اور خلوص کا انسانیت نواز مظہر ہوتا ہے۔

حقیقی بھائیوں میں تفرقہ کا حال تو حضرتِ آدم کے بیٹوں ہابیل و قابیل کے زمانے سے معلوم ہے لیکن دو اجنبی افراد میں ''عقدِ مواخاۃ'' (یا بھائی بنانے کی

---

[1] کشکول بہائی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضرب المثل حضرت سبطِ اکبر امام حسنِ مجتبیٰ علیہ السلام کے ارشاداتِ مبارکہ سے ماخوذ ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے: ''کم من اخٍ لم تلِدْہُ اُمکَ''۔

(بہائی، کشکول نسخۂ محمد مہدی خرسان ج ۱ ص ۴۵ ط: نجف اشرف ۱۹۷۳ء۔)

رسم) سب سے پہلے کس نے قائم کی اِس کا مطالعہ سماجیاتی نقطۂ نظر سے تاریخ انسانی کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک دلچسپ عنوانِ تحقیق ضرور ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنس ومحبت اور اخوت کی رشتہ سازی کے اس خصوصی انسانی مظہر کو تاریخ تمدُّنِ انسانی میں انتہائی عظیم الشان تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اور اسی اخوت سازی کے ذریعہ ایک نئے پُرامن وپرخلوص تمدُّن کی بنیاد رکھی۔

کتبِ تاریخ وحدیث میں یہ واقعہ بہ تواتر نقل کیا گیا ہے کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو مرتبہ ''تقریبِ اخوت'' منعقد فرمائی۔ ایک مرتبہ مکۂ مکرمہ میں اور ایک مرتبہ مدینۂ منورہ میں۔ اس کی تفصیل متعلقہ مصادر میں موجود ہے۔ یہاں پر جو بات قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ دونوں مرتبہ آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا بھائی بنایا۔ استیعاب (ج ۲ ص ۴۶۰) میں ابنِ عبد البر کے الفاظ یہ ہیں:

''آخیٰ رُسُولُ اللّٰہِ بین المھاجرِینَ ثُمَّ آخیٰ بَیْنَ الْمُھَاجِرِیْنَ والاَنصَارِ وقَالَ فِي کُلِّ وَاحدٍ منھُمَا لِعَلِيٍّ انتَ اخِي فِي الدُّنیاَ و الآخِرۃ''

''رسول اللہؐ نے مہاجرین کے درمیان بھائیوں کا رشتہ قائم کیا پھر مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائیوں کا رشتہ قائم کیا اور دونوں مرتبہ حضرت علیؑ سے فرمایا تم میرے بھائی ہو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی''۔

''یاعلی انتَ اَخِي فِي الدُّنیا و الآخرۃ'' کا فقرہ صحیح ترمذی (ج ۲ ص

۱۲۳) میں بھی ہے۔ اور اس رشتہ پر حضرت علی علیہ السلام کا خود فخر و مباہات فرمانا بھی تاریخوں میں درج ہے۔ مثلاً تاریخ ابو الفدا ء (ج ا ص ۱۲۷) میں ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

''اَنَا عبدُ اللهِ وَ اَخُو رسُولِ اللّٰهِ''''میں اللہ کا بندہ ہوں اور اللہ کے رسول کا بھائی ہوں!''

ایک پہلو اور بے حد غور طلب ہے۔ دُعائے افتتاح کے اس فقرے ''وَاَخِي رَسُولِکَ'' میں بھی اضافت رسول اللہ کی جانب ہے! علی ابن ابی طالب، محمد بن عبداللہ کے بھائی تو ہیں ہی۔ یہاں ''اللہ کے رسول سے بحیثیت رسول کے بھائی کے رشتہ کا اعلان ہے اِس اضافت و نسبت ہی میں تو شَرف پوشیدہ ہے اسی لیے میں نے عرض کیا ہے کہ ''اخی رسولک'' کی تعبیر حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی شخصیت کے تمام نَسبی و نَسبی فضائل و مناقب کا حسین ترین کنایہ ہے!

☆☆☆☆☆

(۲۲)

خنکیِ چشمِ رحمت

"...وَصَلِّ عَلَى الصِّدِّيقَةِ الطَّاهِرَةِ فَاطِمَةَ الزَّهرَاءِ سَيِّدَةِ نِسَاءِ الْعَالَمِين"

...اور رحمت فرما "صدیقۂ طاہرہ" فاطمہ (سلام اللہ علیہا) پر جو تمام جہانوں کی خواتین کی سردار ہیں!

اِس جُملے کا ہر لفظ بہت واضح بھی ہے اور بے انتہا غامض بھی!

صداقت اور صدّیقہ کے الفاظ اپنے ظاہری معانی کے لحاظ سے بہت سامنے کے الفاظ ہیں، لیکن، بنتِ رسول سیدۂ کونین سلام اللہ علیہا کی شانِ صداقت اور آپ کے لقبِ صدیقہ سے ملقب ہونے کے اسرار کی مکمل شرح نہ آسان ہے اور نہ ہر کس و ناکس کے لیے قابلِ فہم و تحمل!

یہی صورت لفظِ طاہرہ کی ہے۔ اِس لفظ میں کوئی غرابت نہیں ہے۔ لیکن خنکیِ چشمِ رحمت سلام اللہ علیہا کی نسبت سے کہ جو خود بھی گوہرِ عصمت ہیں اور صدفِ صد گوہرِ عصمت بھی، اس لقب کی معنویت بہ آسانی قابلِ درک نہیں ہے۔ صرف آپؑ کے نامِ نامی فاطمہؑ کے معانی کی تفسیر میں جو روایتیں وارد ہوئی ہیں، اُن میں سے ہر روایت اپنی جگہ پر ایک گنجینۂ اسرار ہے، اسی لیے جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے ایک سوانح نگار علامہ آیۃ اللہ سید محمد کاظم قزوینیؒ نے اپنی کتاب "فاطمہ من المهد الی اللحد" کا آغاز قرآنی اسلوبِ بلاغت سے استفادہ کرتے ہوئے اس جملے سے کیا ہے:

فاطمہ وَمَا ادراکَ فَاطِمہ!

(فاطمہ: اور تم کیا سمجھو کہ فاطمہ کون ہیں!!)

حقیقت یہ ہے کہ جناب زہرا سلام اللہ علیہا کے مرتبہ کا عرفان حاصل کرنا آسان نہیں ہے لیکن یہ ایک حد تک ضروری بھی ہے، اسی لیے خود بی بیؑ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:

اِعْلَمُوا اَنِّی فَاطِمه! (جان لو کہ میں فاطمہ ہوں!)

معلوم ہے کہ بی بی کی عمرِ مبارک بے حد مختصر تھی، لیکن آپ کی عملی سیرت کے دیرپا اثرات اس قدر زیادہ ہیں کہ قابلِ قیاس نہیں ہیں!

متعدد علماء نے ذکر کیا ہے کہ فخرِ رازی، جنھوں نے مبدأ سے معاد تک ہر ہر مسئلے میں تشکیک اور اعتراض پیدا کرنے میں ایسی ضرب المثل شہرت پائی کہ لوگ انہیں ''امام المشککین'' کے لقب سے نوازتے ہیں، لیکن وہ سیدۂ کونین حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ''عصمت'' کے بارے میں سر بسر تسلیم نظر آتے ہیں کہ ''آنجناب بلا مُدافع معصوم بوده است و در عصمت و طهارتش جاي شک و تردید نیست!''

(حسن زادہ آملی، ہزار و یک نکتہ، نکتہ ۴۸۷ ص ۶۰۳)

تاریخی لحاظ سے آپؑ کی حیاتِ طیبہ کے خط و خال، حسبِ عادت و روایتِ مؤرخین، اختلافِ بیانات سے بظاہر الجھے ہوئے سے لگتے ہیں۔ مثلاً آپ کی تاریخِ ولادت، تاریخ شہادت اور نتیجۂ مدّتِ عمرِ ظاہری میں بہت گفتگو کی گنجائش ہے! لیکن جن باتوں میں تاریخی لحاظ سے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں وہی اتنی اور ایسی ہیں کہ جن سے دلوں اور دماغوں میں آپؑ کی اہمیت و عظمت کا ایک درخشاں اور ناقابلِ تشکیک تصور قائم ہو جاتا ہے۔

- آپ کا نامِ نامی فاطمہ تھا!
- آپؑ کے والد حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے!
- آپؑ کی والدۂ ماجدہ ملیکۃُ العرب، حبیبۃُ الرسول، اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ تھیں!
- آپؑ کی شادی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ سلم نے بہ امرِ الٰہی حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرمائی!
- حضرتِ ربُّ العزت نے آپؑ کو حسنؑ اور حسینؑ جیسے فرزند عطا فرمائے

جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''جوانانِ جنت کے سرداروں کی حیثیت سے پہچنوایا!

● آپؑ نے تمام مُہمّاتِ رسالت میں اپنی عظمت و حیثیت کے مطابق حصہ لیا، جنگِ اُحد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر گیری اور آپ کی مدد و موانست کا تذکرہ تاریخوں میں نسبۃً زیادہ مشہور ہے، ورنہ واقعات اور بھی ہیں، لیکن سب سے بڑا واقعہ جس میں جناب سیّدہ سلام اللہ علیہا کا وجود اور آپؑ کے وجود مبارک کا تابناک اثر ظاہر ہوا ''واقعہ مباہلہ'' ہے جس کا تذکرہ قرآنِ مجید کی آیتِ مباہلہ (سورہ آلِ عمران آیت ٦١) میں بھی موجود ہے![1]

● جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دارِ بقا میں قیام اختیار فرمایا تو آنحضرتؐ نے اِس دارِ دنیا میں سوائے حضرت فاطمہؑ کے اور کوئی یادگار نہیں چھوڑی تھی!

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرزندانِ فاطمہؑ حضرات حسنین علیہما السلام کو اپنا فرزند قرار دیا اور آپ کی نسلِ مبارک انہیں سے باقی رہی! اسی لحاظ سے جناب فاطمہؑ کو ''مصداقِ کوثر'' کہا جاتا ہے!

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ ہی میں (۷ھ) آپ کو ''فدک'' عطا فرما دیا تھا جو ۷ھ سے وفاتِ پیغمبرؐ ۱۱ھ تک حضرت سیدہؑ ہی کے قبضہ اور تصرف میں رہا۔

● بعد وفاتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے والوں نے ''فدک'' غصب کر لیا تو حضرت سیّدہ سلام اللہ علیہا نے باقاعدہ احتجاج فرمایا۔

● قضیہ فدک میں جب حضرت سیدہ سلام اللہ سے کہا گیا کہ رسولُ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے: ''نحنُ معاشرُ الانبیاءِ لا نورِّثُ ما

---

[1] واقعہ مباہلہ میں حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کی شرکت سے متعلق حضرت اعلم العلماء مولانا سید سبطِ حسین صاحب قبلہ مرحوم نے اپنے ایک قصیدہ میں ارشاد فرمایا ہے:

شرف جہاد کا مخصوص گر علیؑ سے تھا — مباہلے میں علیؑ سے بڑھی رہیں زہراؑ
اس امتحاں میں خدا کے ولی سے آگے تھیں — رسولِ پاک کے پیچھے علیؑ سے آگے تھیں

تـرکـنـاہ صـدقـہ ''تو آپؑ نے قرآنِ مجید کی آیتوں سے استدلال فرما کر اِس ''حدیث'' کا جعلی ہونا ثابت کیا، اور اپنے اس اقدام سے قرآن اور حدیثِ رسولؐ کی معنوی، علمی اور حُکمی وحدت کے ساتھ ''درایتِ حدیث'' کی بنیاد رکھی اور ''معیارِ صدقِ حدیثِ رسول'' کی وضاحت فرمائی۔ آپؑ کے لقبِ ''صدیقہ'' کے اسرار میں سے ایک بڑا ''سِرّ'' اسی واقعہ میں مضمر ہے!

• بی بی سلام اللہ علیہا نے بعدِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے والوں کی بیعت نہیں فرمائی۔ یہ ایسا واقعہ ہے جو صرف ایک سادہ سی تاریخی حقیقت نہیں بلکہ ''حدیثِ متواتر'':

''مَن ماتَ وَلَم یعرِفْ اِمَامَ زَمانِه مَاتَ مِیتَةً جَاهِلِیَّةً'' کی روشنی میں یہ واقعہ دوسرے بہت سے نہایت پیچیدہ تاریخی واقعات اور بڑے کلامی مسائل کے ''حل'' و ''فتح'' کی کلید ہے!

• آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا نے صرف ۷۵ روز ہی اِس دُنیا میں گزارے، اپنی وفات تک مسلسل رحلتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غم میں نوحہ گر و نالہ کناں رہیں۔

ناہنجار و نابکار طالبانِ دنیا سے جو کچھ رنج آپؑ کو پہونچے اور جو مصیبتیں آپؑ پر پڑیں اُن کی دلخراش داستان الگ ہے۔ اور اس پر جو مسلمان آج تک طرح طرح کی تاویلیں کرتے ہیں اُس کی افسوس ناک بحثیں الگ ہیں۔ ہم اپنے قلم پر صبر و ضبط کا پہرہ بٹھا کر صرف اردو کے مشہور معروف ادیب مترجمِ قرآن شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کے الفاظ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

''سخت افسوس ہے کہ اہلبیتِ نبوی کو پیغمبرؐ کی وفات کے بعد ہی ایسے ناملائم اتفاق پیش آئے کہ ان کا وہ ادب و لحاظ جو ہونا چاہیے تھا، اس میں ضعف آگیا اور شدہ شدہ منجر ہوا اس ناقابلِ برداشت واقعۂ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ ایسی نالائق حرکت مسلمانوں سے ہوئی ہے کہ اگر سچ پوچھو تو دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

چہ خوش فرمود شخصے ایں لطیفہ
کہ کشتہ شد حسین اندر سقیفہ"

• آپؑ کی شہادت ایک معتبر روایت کے مطابق ۳ / جمادی الثانیہ ۱۱ھ ہجری کو ہوئی۔ اور اس امر پر تمام مستند تاریخ نویسوں، راویوں اور محدثوں کا اتفاق ہے کہ آپؑ کی تدفین پردۂ شب میں ہوئی۔ تاریخوں میں یہ بھی ہے کہ آپؑ کا نشانِ قبر بھی ظاہر نہ رکھا گیا تھا۔ اِن تمام حقائق کی تفصیل اور ان کے اسباب کا بیان اس وقت مقصود نہیں ہے۔ لیکن طالبانِ حقیقت کے لیے ابوابِ علم ضرور کھلے ہوئے ہیں۔ شعورِ تاریخ اور روحِ انسانیت کا نالہ بلند ہے۔

"وَلأَيِّ الأُمُورِ تُدفَنُ لَيلاً
بَضعَةُ المُصطفیٰ وَيُعفیٰ ثراها"

(ہائے آخر کن باتوں سے دل وجانِ مصطفیٰ پردۂ شب میں دفن کی گئی اور اس کا نشانِ قبر مٹا دیا گیا!)

• حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کے معنوی کمالات، مراتبِ فضل وشرف، مناقب، فیوضات، کرامات اور معجزات کا احصا کسی بھی طرح ممکن نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آپؑ کی تعظیم کے لیے اٹھنا اور اپنی جگہ پر بٹھانا صحیح ترمذی میں مذکور ہے۔ آپ کو "اُمِّ اَبیھا" کی کنیت سے مکنّٰی فرمانا بھی استیعاب ابن عبد البر اور دوسری بہت سی مستند کتابوں میں موجود ہے۔

آپ کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد صحیح بخاری کے صفحات پر مرقوم ہے کہ:

"فَاطِمَةُ بِضعَةٌ مِنِّی فَمَنْ اَغضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِي"

"فاطمہ میرا جز ہے جس نے اُسے غضبناک کیا بس اس نے مجھے غضبناک کیا!"

سلام الله عليها وعلى ابيها وَ بَعْلِهَا وَ بَنِيهَا
وَ عِترَتِهَا و ذُرِّيَّتِهَا سلاماً كثيراً.

☆☆☆☆☆

(۲۳)

سبطینِ رحمت

یارَبِّ

اِنَّکَ تَدْعُوْنِي فَاُوَلِّي عَنْکَ

وَتَتَحَبَّبُ اِلَيَّ فَاَتَبَغَّضُ اِلَیْکَ

وَتَتَوَدَّدُ اِلَيَّ فَلاَ اَقْبَلُ مِنْکَ

کَأَنَّ لِيَ التَّطَوُّلَ عَلَیْکَ

فَلَمْ يَمْنَعْکَ ذٰلِکَ مِنَ الرَّحْمَةِ لِي وَالْاِحْسَانِ اِلَيَّ وَالتَّفَضُّلِ عَلَيَّ

بِجُوْدِکَ وَکَرَمِکَ

فَارْحَمْ عَبْدَکَ الجَاهِلَ

وَجُدْ عَلَیْهِ بِفَضْلِ اِحْسَانِکَ

اِنَّکَ جَوَادٌ کَرِیْمٌ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ مَالِکِ الْمُلْکِ

مُجْرِي الْفُلْکِ

مُسَخِّرِ الرِّيَاحِ

فَالِقِ الْاِصْبَاحِ

دَيَّانِ الدِّيْنِ

رَبِّ الْعَالَمِينَ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ

عَلیٰ عِلْمِهِ بَعْدَ حِلْمِهِ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ

عَلیٰ عَفْوِهِ بَعْدَ قُدْرَتِهِ

''وَصَلِّ عَلٰی سِبْطَيِ الرَّحْمَةِ وَ اِمَامَيِ الْهُدٰى الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ سَيِّدَيْ شَبَابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ''

... اور رحمت فرما

سبطینِ رحمت

اور رہنمایانِ ہدایت،

جوانانِ اہلِ جنت کے سرداروں حسن اور حسین پر! (علیہما الصلاۃ والسلام)۔

حضرتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ولیِ حق وَصیِ بَرحق علیِ مرتضیٰ علیہ السلام اور حضرتِ سیدۂ کونین فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کے بعد حضراتِ حسنین علیہما السلام پر درود و سلام اور اس کے بعد اہلبیتِ پیغمبر صلوٰت اللہ وسلامہ علیہ و علیہم اجمعین سے ہونے والے ائمۂ دین اور اولیائے معصومین پر بہ تفصیل یعنی نام بہ نام درود و سلام اِس دعائے مبارکہ کے خصوصیات میں سے ہے۔ اور یہ ربّ کریم کے ارشاد و عمل اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان و فعل کی پیروی ہے۔

پروردگار نے قرآن مجید میں حضرت رسولؐ اور آلِ رسولؐ پر درود و سلام بھیجا ہے۔ سورۂ مبارکۂ احزاب کی آیتِ صلوٰت و تسلیم کا ذکر پہلے آچکا ہے یہاں پر سورۂ صافات کی اس آیت کی طرف متوجہ کرنے کا مقام ہے:

﴿سَلَامٌ عَلٰىٓ اِلْ يَاسِيْنَ﴾

ائمۂ اہلبیت علیہم السلام سے اور بعض صحابہ سے مروی روایاتِ تفسیر میں اس آیت میں آلِ یٰسین (یعنی آلِ محمدؐ) ہی پر سلام نازل ہوا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی صلوٰت بھیجنے کا طریقہ تعلیم

فرمایا ہے جیسا کہ مشہور حدیث میں آیا ہے اور علامہؒ ابن حجر مکیؒ نے اس کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

''لَا تُصَلُّوا عَلَیَّ الصَّلَاۃَ الْبُتْرَاءَ''

''مجھ پر ناتمام صلوٰۃ نہ بھیجا کرو''

جب آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ کس طرح صلوٰۃ بھیجنا چاہیے تو آپؐ نے صلوٰۃ میں اپنے اہلبیت کی شمولیت کی تاکید فرمائی۔ یہ تمام مباحث مشہور ہیں اور تقریباً تمام مسلمان اس پر متفق بھی ہیں اور عمل پیرا بھی۔ فخر الدین الرازی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اُن کے اہلبیت پانچ باتوں میں شریک قرار دیے گئے ہیں۔ تشہدِ نماز کے صلوٰۃ اور سلام میں، طہارت میں، صدقہ کی حرمت میں، اور محبت میں! اُن کے اصل الفاظ رسالۂ صبّان میں (حاشیۂ کتاب نور الابصار شبلنجی پر) اس طرح نقل کیے گئے ہیں:

''وذکر الفخر الرازی أن أهل بیته صلی الله علیه و آله وسلم ساووه فی خمسة أشیاء فی الصلاة علیه و علیهم فی التشهد و فی السلام یقال فی التشهد... و فی الطهارة ... وفی تحریم الصدقة و المحبة''

ظاہر ہے یہ فخر الدین رازی کا بیان ہے، اُن کو یہی پانچ باتیں مشترک نظر آئیں، ورنہ مقامِ ختم نبوت اور خصوصیات نبوت کے علاوہ کونسی بات ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن کے اوصیائے ابرار اور ائمۂ اطہار تک نہ پہنچی ہو!

دعائے افتتاح کے اس فقرے میں کس قدر حسین اور معنی خیز ترکیبیں آئی ہیں، مثلاً ''سِبطَیِ الرَّحمۃِ''! ''سبطینِ رحمت'' کس قدر فکر انگیز ترکیب ہے۔ سبط کے معنی نواسے کے ہوتے ہیں۔ بے شک حسنین علیہما السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے تھے، لیکن یہاں پر آنحضرتؐ کے نامِ نامی کے بجائے صرف لفظِ رحمت ہے گویا اسی فقرے میں حضورؐ کی نعتِ مبارک کا بحرِ بے کراں بھی موج زن ہے کہ آپ کو عینِ رحمت کہا گیا ہے۔ حضرت رحمت للعلمینؑ کے لیے بغیر کسی قید و اضافت کے پورے عموم اور اطلاق کے ساتھ ''الرحمۃ'' کا استعمال جیسا کہ اس فقرے میں ہوا ہے اور برحق ہوا ہے، شاید ہی کہیں اور ہوا ہو۔ آپؐ کی شانِ رحمت کے جتنے بھی قصیدے کہے گئے ہیں وہ اس فقرے پر قربان کیے جاسکتے ہیں۔

لفظ ''سبط'' بھی ذرا اور غور طلب ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ اَسباط بنی اسرائیل کے ذکر میں، اور حدیث نبویؐ میں خصوصیت کے ساتھ امام حسین علیہ السلام کے لیے آیا ہے ''حُسَینٌ سِبطٌ مِنَ الاَسبَاطِ'' اور امام سجاد علیہ السلام کے خطبۂ دمشق میں آیا ہے ''وَمِنّا سِبطَا ھٰذِہِ الاُمَّۃِ'' یہ اور اسی طرح کے اور دینی، تاریخی اور ادبی مصادر میں لفظ ''سبط'' کا استعمال بے حد فکر انگیز ہے کہ یہ لفظ ہر نواسے کے لیے اس طرح استعمال نہیں ہوتا، بلکہ ایسے نواسوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو بجائے خود ایک ''امت'' ہوتے ہیں! اور تمام اُمّتوں اور امتیوں کے لیے اسوۂ کامل اور قائدِ منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسی طرح ''اِمامَیِ الھُدیٰ'' ''ہدایت کے دونوں اماموں'' کی ترکیب کس قدر حسین اور پُر معنی ہے۔ مجھے تو اس ترکیب و تعبیر پر ہمیشہ اردو کی ایک مختصر

جدید منقبتی نظم یا جدید سلام کے یہ مصرعے یاد آجاتے ہیں :

"ہدایت ان سے پاتی ہے ہدایت یہ محمد ہیں!

یہ حیدر ہیں

یہ زہرا ہیں

یہ شبّر ہیں، یہی سبطِ مُعظّم ہیں،

یہ سردارِ شہیداں یعنی شبیرِ مکرّم ہیں،

یہی سبطینِ رحمت ہیں!

ہدایت ان سے پاتی ہے ہدایت یہ محمدؐ ہیں

ہدایت ان سے چھٹ کر پھر ہدایت رہ نہیں جاتی

سیاست ہو، سفاہت ہو، سخافت ہو، شقاوت ہو،

وہ کچھ بھی ہو،

جدا ہو کر محمدؐ سے ہدایت رہ نہیں جاتی،

ہدایت صرف وہ ہے جس کا رشتہ ہو پیمبرؐ سے!

علیؑ سے!

فاطمہؑ سے

اور سبطینِ پیمبرؐ سے!"

حضرات حسنین علیہما السلام کی شان میں یہ حدیثِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعتبار وصحت اور شہرت کے لحاظ سے تمام ذخیرۂ حدیث میں بجائے خود منفرد اور امتیازی شان رکھتی ہے۔

"الحَسنُ و الحُسَینُ سیّدا شَبابِ اھلِ الجنَّة"

حسن اور حسین جوانانِ جنت کے سردار ہیں!

علمائے جمہور میں سے "اس کی تخریج احمد بن حنبلؒ نے مرفوعاً ابوسعید خدری سے کی ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے تصحیح کی ہے۔"

یہ اندراج "امام عبد الرحمن الشیبانی الاثری" صاحبِ "تمیز الطیب من الخبیث فیما یدور علی السنة الناس من الحدیث" کا ہے۔

اس عاجز و قاصر کا خیال ہے کہ صِرف اِس حدیث کے مختلف سلسلوں اور راویوں کا شمار کیا جائے تو ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے بلکہ تعجب نہیں کہ اس عنوان پر کوئی کتاب یا کئی کتابیں تالیف ہو بھی چکی ہوں۔ میں نے اس وقت فہارس کتب پر خاص اس عنوان کے تحت نظر نہیں ڈالی ہے۔

سَنَدِ حدیث سے قطع نظر متن کے الفاظ میں سیّد شبابِ اور اہل کے کلمات خاص طور پر غور طلب ہیں جو معانی و مطالب اور فضائل و مناقب کے گنجینے ہیں۔ اور اس قدر متن میں جو اوپر درج کیا گیا ہے کوئی ذرا سا بھی اختلاف نہیں ہے! بہ تواتر یہی الفاظ نقل ہوتے چلے آئے ہیں۔

"الحَسنُ و الحُسَینُ سیّدا شَبابِ اھلِ الجنَّة"

☆☆☆

اگر اور کوئی ارشادِ نبویؑ یا دلیلِ خاص حضراتِ حسنین علیہما السلام کی امامت کے بارے میں نہ پائی جاتی تو بھی صرف یہی حدیث شریف اِن کی امامت کے

اثبات کے لیے کافی تھی اس لیے کہ ''سیادت'' سرداری، سربراہی یا ''امامت'' ہی کو تو کہتے ہیں، اور جو اہلِ جنت کے امام ہوں وہ بدرجۂ اَولیٰ اہلِ دنیا کے بھی امام ہوں گے۔ تاہم اس کے علاوہ بھی اِن کی امامتوں پر اتنی دلیلیں موجود ہیں جن کے احصا کے لیے جُداگانہ کتاب تحریر کرنے کی ضرورت ہوگی اس مقام پر یہ ایک حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سماعت فرماتے جایئے جو غایت درجہ معتبر اسناد کے ساتھ نقل ہوتی آئی ہے:

''الحسن و الحسین امامانِ قاما أو قعدا''

''حسن اور حسین دونوں امام ہیں چاہے وہ کھڑے ہوں چاہے بیٹھیں''

یہ عجب ارشادِ پیغمبرؐ ہے جس کے الفاظ ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِن دونوں نواسوں کی بلا اِستثناء مکمل زندگی کا احاطہ کر رہے ہیں اور ان کے ہر ہر اقدام وعمل کو عین ہدایت وحجّت قرار دے رہے ہیں اور دوسری طرف دونوں حضرات کی زندگیوں کے خاص واقعات کی طرف بھی بطورِ تلمیح اشارہ کر رہے ہیں۔ قیام یا کھڑا ہونا ہماری زبان اور اکثر زبانوں میں کسی بڑے اقدام، کسی تحریک کے آغاز یا کسی انقلاب کے برپا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اسی طرح قُعود یا بیٹھ جانا، بیٹھ رہنا کسی اقدام سے باز رہنے یا ماحول جنگ میں صلح کر لینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس حدیث میں امام حسین علیہ السلام کے قیامِ عاشورا اور امام حسن علیہ السلام کی صُلح کی طرف واضح اشارہ موجود ہے کہ یہ دونوں بہ ہر حال امام ہیں، چاہے ان میں سے کوئی جہاد کرے چاہے صلح! نہ جہاد کرنے سے امامت ختم ہو جائے گی، نہ

صلح کر لینے سے امامت ساقط ہوجائے گی۔ یہ صلح کر کے بیٹھے رہیں گے تب بھی ''امامِ ہدیٰ'' ہی رہیں گے۔ دین کے اصول وفروع، آداب واخلاق وشریعتِ الٰہی، سیر وسلوک الی اللہ کی طریقت اور حق و حقیقت غرض تمام معارف انہیں سے ملیں گے! چاہے یہ سریر آرائے حکومت و سلطنت ہوں اور چاہے عزلت گزین و بوریہ نشیں ہوں۔

تاریخ میں سبطِ اکبر حضرت حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے بارے میں بہت دھندلکا ہے۔ اس کتاب میں بھی کسی چیز کی پوری تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اس لیے حقائق اور مطالب کا ذکر اجمالاً اور اشارۃً ہی ممکن ہے۔

☆☆☆☆☆

سبطِ اکبر حضرت امامِ حسن علیہ السلام

• حضرت امام حسنِ مجتبٰی علیہ السلام کی تاریخِ ولادت عموماً ۱۵؍رمضان المبارک ۳ھ (مطابق ۲۸؍فروری ۶۲۵ء بروز پنجشنبہ) بہ مقام مدینۂ منورہ بتائی جاتی ہے۔

• آپؑ کا شمار قرآنِ مجید کے مطابق خمسۂ نجبا یعنی آلِ عبا واصحابِ کسا میں اورابنائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں ہوتا ہے۔

اربابِ ایمان کی زبانوں پر جو ''پنجتنِ پاک'' کا ذکر رہتا ہے یہ کوئی عوام الناس کا عقیدت مندانہ تصور نہیں ہے بلکہ یہ آیتِ مُباہلہ اور آیتِ تطہیر سے ماٗخوذ اور مستند عقیدہ ہے۔ آیتِ مباہلہ یعنی سورۂ مبارکہ آلِ عمران کی ۶۱ ویں آیت :

﴿فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَکُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَکُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ﴾

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ توحیدِ باری تعالیٰ کے اثبات اور حضرتِ عیسیٰؑ کے تعلق سے مُشرکانہ شبہات کی رد کے لیے جو آپؐ پر آیتیں نازل ہو چکی ہیں اگر ان پر بھی کوئی قانع نہ ہو اور کٹ حجتی کرے تو آپؐ اُن سے فرمادیں کہ تُم اپنے بیٹوں کو لے آوٗ، ہم اپنے بیٹوں کو لے آئیں، تم اپنی عورتوں کو لے آوٗ، ہم اپنی عورتوں کو لے آئیں اور تم اپنے نفسوں کو لے آوٗ ہم اپنے نفسوں کو لے آئیں پھر ابتہال والتجا کریں (مباہلہ کریں) اور اللہ کی لعنت قرار دیں جھوٹوں پر۔

یہ آیت قرآنِ مجید میں موجود ہے اور اس کی شانِ نزول اور اس سے متعلق

واقعات حدیث وتاریخ کی مستند کتابوں میں موجود ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ واقعۂ مباہلہ نصارائے نجران کے ساتھ ۲۴ر ذی الحجہ ۱۰ ہجری میں پیش آیا تھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہمراہ صرف حضرت علی مرتضٰی، حضرت فاطمہ زہراء، حضرت حسن مجتبیٰ اور حضرت سید الشہداء امام حسین علیہم السلام کو بمنزلۂ نفس و نساء وابنا کے لے گئے تھے۔ یہی واقعہ اور قرآنی سند ابنائے رسول کی حقیقتِ ذات و بلندی شرف ومنزلت کو اور ''پنجتنِ پاک'' کے عقیدے کو سمجھنے کے لیے بہت کافی ہے۔

- حضرت امامِ حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے تقریباً آٹھ برس اپنے جدِ بزگوار حضرت سرورِ کونین خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آغوشِ رحمت ونور میں تربیت پائی آپؑ کے بارے میں آنحضرتؐ کے ارشادات اور واقعاتِ لطف وشفقت حدیث وسیرت کی کتابوں میں مندرج ہیں، خصوصیت کے ساتھ یہ حدیثِ نبویؐ بہت مشہور ہے کہ:

''اِنَّ ابنِیُ ھٰذا سِیِّدٌ وَ لَعَلَّ اللّٰہ أنْ یُصْلِحَ بِهِ بَیْنَ فِئَتَیْنِ مِنَ المُسْلِمِیْنَ'' (بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الفتن)

''میرا یہ بیٹا سردار ہے، اُمید ہے کہ اللہ اس کے وسیلہ سے مسلمانوں کے دوگروہوں کے درمیان صُلح کرائے گا۔''

یہ حدیث جس قدر مشہور ہے اسی قدر اس کے راویوں اور اس کے متن کے بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے کہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصل الفاظ کیا تھے؟!

بعض متعبر محدثین نے صِرف یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

"اِنَّ ابْنِی هٰذَا سَیِّدٌ وَ سَیُصْلِحُ اللّٰهُ بِهِ"

"میرا یہ بیٹا سردار ہے اور عن قریب اللہ اس کے ذریعہ سے صلح وسازگاری فرمائے گا۔"

• آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امام حسن علیہ السلام اپنے پدرِ بزرگوار حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے ساتھ مُہماتِ دین میں منہمک رہے۔ لوگوں کو قرآنِ مجید اور سیرتِ نبویؐ کی تعلیم دینا، تزکیۂ نفس کے لیے کوشاں رہنا، معارف دین اور حکمتِ الٰہیہ کی زیادہ سے زیادہ تبلیغ فرمانا اور اپنی ایک ایک سانس کو توحیدِ حقّہ کے اثبات کے لیے وقف رکھنا آپؑ کا اور تمام ائمۂ اہلبیت کا شیوۂ زندگی تھا۔

• امام حسن علیہ السلام نے حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کتنی حدیثیں سنی ہوں گی اور نقل فرمائی ہوں گی؟ اسی طرح اخلاق وسیرتِ نبویؐ کے کتنے واقعات اور نکات آپ نے لوگوں کو تعلیم فرمائے ہوں گے؟ اس کا کوئی احصا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اِسے مسلمانوں کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ خاص آپؑ کے حوالے سے صرف چند ہی حدیثیں جمہورِ مسلمین کی کتبِ حدیث میں درج کی گئی ہیں۔ جن میں سے ایک روایت یہ ہے:

"روی الحسن بن علی (علیهما السلام) قال سمعت جدّی رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم یقول: یا مُسْلِم! اِضمن لي ثلاثاً أضمن لک الجنة؛ اِن عملتَ بما فرض الله علیک فی القرآن فانت أعبد الناس، واِن اتقیتَ ما حرم الله علیک فی القرآن فانت أورع الناس، واِن

اے پالنے والے!

تو مجھے بلاتا ہے اور میں تیری طرف سے روگردانی کرتا ہوں

تو مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں

تو مجھ پر مہربانیاں فرماتا ہے اور میں قبول نہیں کرتا

جیسے میرا تجھ پر کوئی احسان ہو

تب بھی تیری فیاضی اور کرم گستری تجھ کو مجھ پر رحمت کرنے، احسان فرمانے اور مہربانیوں سے روکتی نہیں

بس اپنے اس جاہل بندے پر احسان فرما

اور اپنے احسان سے اس پر فیاضی کر

یقیناً تو ہی فیاض اور کرم گستر ہے!

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے جو تمام مُلکِ ہستی کا بادشاہ ہے

(بے کراں، پُر تلاطم اور گہرے سمندروں میں) کشتیوں کا چلانے والا ہے

ہواؤں کو زنجیر پہنانے والا ہے

صبح کو نمودار کرنے والا ہے

روزِ جزا بھرپور جزائیں دینے والا ہے

تمام جہانوں کا پالنے والا ہے!

تمام حمد ہے اسی معبود کی

کہ وہ (اپنے بندوں کی نافرمانیاں) جانتے ہوئے بھی بردبار ہے

تمام حمد ہے اسی معبود کی

جو (انتقام و سرزنش کی) قدرت رکھتے ہوئے معاف کرتا ہے

قنعتَ بما رزقکَ اللہ فَأنت أغنی الناس"

امام حسنؑ نے فرمایا کہ میں نے اپنے نانا کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

اے مسلمان! مجھے تین باتوں کی ضمانت دے دے میں تیرے لیے جنت کا ضامن ہوں گا۔ اگر تو اللہ نے جو کچھ قرآن میں فرض کیا ہے اُس پر عمل کرے تو سب لوگوں سے زیادہ عبادت گزار ہوگا، اور اگر اللہ نے جو کچھ قرآن میں حرام قرار دیا ہے اُس سے بچے تو سب سے زیادہ پرہیز گار ہوگا، اور اگر اللہ نے جو کچھ رزق تجھے عطا کردیا ہے اس پر قناعت کرے تو تُو سب سے زیادہ غنی ہوگا!

بلاغت کی قسم کیا جامع کلمات ہیں!

● امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی زندگی میں روحانی اور علمی افادات کے ساتھ ساتھ عملی اور جہادی پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔

آپؑ نے حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے ساتھ جنگِ جمل، جنگِ صفین اور جنگ نہروان میں یادگار کارنامے انجام دیے۔ سفارتی امور کے لحاظ سے بھی اور میدانِ جنگ میں شجاعانہ قیادت اور جرأت مندانہ محاربت کے لحاظ سے بھی۔ جس طرح آپ کے والد ماجد امیر المؤمنین علیہ السلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بدر واحد وغیرہ کے معرکوں میں قوتِ بازو بنے تھے اُسی طرح آپؑ جمل وصفین میں اپنے والد حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی طاقتِ دل بنے رہے۔

● حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپؑ مستقل طور پر امامت کے ذمہ دار ہوئے، ساتھ ہی تمام مسلمانوں نے آپؑ کے ہاتھوں پر بیعت

کی۔ اور آپؑ نے امرِ امامت کے ساتھ ساتھ کچھ دنوں کے لیے خلافتِ ظاہری بھی قبول فرمائی، لیکن ''باغیِ شام'' جس کی ریشہ دوانیوں نے حضرت امیر المؤمنین کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا تھا، آپ کے لیے بھی درپے آزار رہا۔

'باغیِ شام' کی ریشہ دوانیاں تاریخ میں نہایت درشت حرفوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ ایک طرف وہ، اور دوسری طرف اہلِ عراق کا بزدلانہ اور اکثریت کا دُنیا پرستانہ رویہ، نتیجۂ اسباب ایسے ہوئے کہ امام حسن مجتبیٰ نے چند شرطوں کے ساتھ ''حکومتِ ظاہری'' سے کنارہ کشی فرمالی۔ اور اپنے ساتھ بچے کھچے صلحائے امت کا خون بے موقع ضایع ہونے سے بچالیا۔ (ح)

• حکومت ظاہری سے کنارہ کشی فرمالینے کے بعد حضرت امام حسن علیہ السلام اپنے بھائی، اپنے بعد ہونے والے امام، حضرت امام حسین علیہ السلام اور اپنے پورے کنبہ کے ساتھ کوفہ سے اپنے جدّ حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوارِ مقدس مدینہ منورہ میں جاکر مقیم ہوگئے۔ اور اسی طرح لوگوں کی ہدایت و تربیت میں مشغول و مصروف رہے، جس طرح امیر المؤمنین علیہ السلام ''حکومتِ ظاہری'' پر متمکن ہونے سے پہلے اسی مدینہ منورہ میں وصیِ رسولؐ کی حیثیت سے امورِ دین اور تربیتِ مسلمین میں مشغول و مصروف رہتے تھے۔

• امامِ حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو ''باغیِ شام'' کی طرف سے کئی مرتبہ زہر دیا گیا۔ یہاں تک کہ ماہِ صفر ۵۰ھ کی آخری تاریخ کو آپ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ اور مدینۂ منورہ میں روزِ وفاتِ پیغمبرؐ کی طرح کہرام برپا ہوا۔ آپؑ کی آرزو

(ح) امام حسن علیہ السلام کا یہی اقدام تاریخ میں ''صلح حسن'' یا امام حسن کے معاہدۂ جنگ بندی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس صلح کے اسباب و علل، پس منظر اور شرائط کے بیان میں مؤرخین کی عبارتیں مختلف ہیں پھر بھی حقیقتیں ظاہر و باہر ہیں۔ اس موضوع پر بہت سے علماء نے مستقل کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ جن میں اردو کی حد تک علامہ بے عدیل مولانا سید عدیل اختر صاحب مرحوم سابق پرنسپل مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کا رسالہ ''صلح حسن'' بجا طور پر قابلِ حوالہ رسالہ ہے۔

تھی کہ اگر ہو سکے تو جدِ بزرگوار حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں دفن کیا جائے لیکن یہ بھی وصیت فرمائی تھی کہ اگر لوگ وہاں دفن کرنے سے منع کریں تو پھر بقیع میں سپر دِ لحد کیا جائے۔ اَور یہی ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہیتے نواسے، امام المسلمین، سید شبابِ اہلِ جنت حضرت امام حسنِ مجتبیٰ علیہ السلام کو جوارِ پیغمبرؐ میں دفن نہیں ہونے دیا گیا اور آپؑ بقیع میں دفن کیے گئے۔

رسولِ خدا اور آپؐ کے اہلِ بیت صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کے چاہنے والوں اور جاں نثاروں کے لیے قیامت تک یہ سوانح غم انگیز اور المناک جراحتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان سوانح کے اسباب وعلل اور ان میں کار پرداز افراد سے بیزاری ہی تزکیۂ باطن اور قرب الی اللہ کا ذریعہ رہ جاتا ہے!

حضرتِ امامِ حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے مدائح میں بہت سے قابلِ حوالہ اور شایانِ ذکر قصائد، منقبتیں، سلام اور قطعات اردو، فارسی، عربی اور بعض دوسری زبانوں میں بڑے نامی شعرا نے تخلیق کیے ہیں لیکن مجھے مرحوم محسن نقوی کے یہ دو قطعات بہت پسند ہیں جنہیں یہاں نقل کر رہا ہوں: ۲۷۲

چھٹے گی کذب کی گردِ کہن آہستہ آہستہ
مٹے گی فکر انساں کی تھکن آہستہ آہستہ
ابھی تاریخ کو بچپن کی سرحد سے گزرنے دو
کُھلیں گے اس پہ اوصافِ حَسَن آہستہ آہستہ

میزانِ عدل میں ہیں برابر کے دو امام
اک سرخرو چمن ہے مقدس چمن کے بعد
لوحِ جبینِ عظمتِ آدم پہ حشر تک
نامِ حسینؑ ثبت ہے لیکن حسنؑ کے بعد

☆☆☆☆☆

سبطِ اصغر و شہیدِ اکبر حضرت سید الشہدا امامِ حسین علیہ السلام

سبطِ رسولؐ حضرت سید الشہدا امام حسین علیہ السلام اور آپ کے قیام و جہادِ عاشورا اور سانحۂ کربلا سے متعلق اتنا لکھا اور بولا گیا ہے کہ شاید ہی دُنیا کے کسی اور موضوع پر اس قدر لکھا اور بولا گیا ہوگا۔ لیکن پھر بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔ جو نامِ خدا کو باقی رکھنے کے لیے ایسی عظیم قربانیاں پیش کر دے اُس کے ذکر کو باقی رکھنے کے لیے خود پروردگار کیا کچھ تدبیریں نہ فرمائے گا!

- مشہور ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی ولادت ۳ر شعبان المعظم ۴ر ہجری (مطابق ۷ر جون ۶۲۶ء) کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔

- آپ کے ابتدائی حالات برادرِ بزرگ سبطِ اکبر حضرت امام مجتبیٰ علیہ السلام کے حالات سے بڑی حد تک مشابہ بلکہ متحد ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ربّانی وملکوتی تربیت میں رہنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امیر المؤمنین علیہ السلام اور اُن کے بعد امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ مہمّاتِ دین میں مُنہمک رہنا، قرآن وسیرت نبوی کے تحفظ کا ہر ممکن سر و سامان کرنا اور دین و شریعت میں کسی بھی طرح کا رخنہ نہ پڑنے دینا، آپ کی حیاتِ طیبہ کے نمایاں ترین خصوصیات تھے۔

- معارفِ توحید اور تمام حقائق و معالمِ دین کے بارے میں امام حسین علیہ السلام اور دوسرے ائمۂ اہلبیت علیہم السلام کے گرانبہا ارشادات واسباق تاریخ و حدیث کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ توحیدِ صمدی کے بیان میں ہم آپؑ کا ایک خط اسی کتاب میں نقل کر چکے ہیں۔

- خاص آپؑ کے متعلق حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد

حدیث وتاریخ کی دنیا میں ایک مستقل گونج رکھتا ہے:

"حُسَیْنٌ مِنِّي وَ اَنَا مِن حُسَیْن"

اِسے ترمذی نے مُعلی بن مُرہ الثقفی سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، اوراسی طرح احمد بن حنبل اور ابن ماجہ وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے۔

● جس طرح جناب سبطِ اکبر علیہ السلام کے تذکرے میں عرض کیا گیا کہ آپؑ نے کتنی ہی حدیثیں اپنے نانا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرمائی ہوں گی اور کتنے ہی واقعاتِ سیرت واخلاق نبویؐ اور نکاتِ علم ومعرفت لوگوں کو تعلیم فرمائے ہوں گے لیکن یہ جَورِ تاریخ ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے ایسے اہلبیتؑ کی زبانی روایت کرنے سے جمہورِ مسلمین نے اتنی ہی بے اعتنائی برتی کہ اُن کی کتابوں میں صرف چند، غالباً سات یا آٹھ ہی حدیثیں خاص ان کے حوالے سے جگہ پاسکیں۔ یہی صورت امامِ حسین علیہ السلام کے ساتھ ہے۔آپؑ کی زبانی نقل شدہ ارشادات پیغمبرؐ میں سے چند یہ ہیں:

١۔اَلصَّبرُ مِفْتَاحُ الْفَرَجِ وَالزُّهدُ غِنَی الْاَبَدِ

"صبر (تحمل اور ثباتِ قدم) کشایش کی کلید ہے اور پرہیز گاری لازوال تونگری ہے۔"

اسے دیلمیؒ نے مرفوعاً نقل کیا ہے۔

٢. اَلبَخِیلُ مَنْ ذُکِرْتُ عِندَهُ فَلَمْ یُصَلِّ عليّ.

"بخیل وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔"

اسے احمد بن حنبل، نسائی، بیہقی اور طبرانی وغیرہ نے نقل کیا ہے اور ابن حبان وحاکم وغیرہ نے اس نقل کو صحیح قرار دیا ہے!

۳۔ طبرانی نے معجم کبیر میں یہ حدیثِ صحیح بھی امام حسین علیہ السلام سے مرفوعاً نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''انَّ اللهَ يُحبُّ مَعَالِيَ الأُمورِ وَ اَشْرَافها و يكرهُ سَفْسَافَها''

''پروردگار بلند اور بہترین امور کو پسند فرماتا ہے اور پست ورکیک باتوں کو ناپسند فرماتا ہے۔''

۴۔ اسی کتاب (چراغِ راہ) میں مباحثِ توحید میں امام حسینؑ کے ایک خط کا تذکرہ آچکا ہے جس میں آپؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث نقل فرمائی ہے۔

''مَنْ قَالَ في القرآنِ بغيرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوّأْ مَقْعدهُ مِنَ النَّارِ''

''جس نے بھی قرآن مجید (کی تفسیر) کے بارے میں آگہی کے بغیر کلام کیا وہ دوزخی ہے''

۵۔ تحف العقول میں امام حسین علیہ السلام سے ''جہاد کے اقسام'' پر ایک موعظہ نقل کیا گیا ہے۔ اس میں بھی آپؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشاد مبارک نقل فرمایا ہے :

وَقَدْ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عليه و آله وسلم:

''مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أجرُها وَ اَجْرُ مَنْ عَمِلَ بهَا اِلیٰ يَومِ القِيامه مِنْ غَيْرِ أن يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئاً''

''جس نے بھی کسی اچھے طور طریق کی بنیاد ڈالی اسے اس کا اپنا اجر بھی ملے گا اور تا قیامت جتنے لوگ بھی اس پر عمل کریں گے اُن کے اجروں میں کسی کمی کے بغیر اُسے بھی اجر ملتا رہے گا۔''

• انبیاء اور ائمہٴ دین علیہم السلام کا بنیادی کام انسانوں کو معبودِ برحق کی اِطاعت کا پابند بنانا اور سرکشوں کی بندگی سے بیزاری سکھانا ہے۔ جب جب معاشرہٴ انسانی میں کوئی بڑا سرکش پیدا ہوا ہے انبیا اور ائمہ دین نے خدا کی اطاعت کا پرچم بلند رکھتے ہوے اُس کا ہر طرح سے مقابلہ کیا ہے۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرتِ عیسیٰ اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہم اجمعین کے واقعاتِ سیرت اِس حقیقت کے لازوال، زندہ اور بولتے ہوے ترجمان ہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی زندگی میں بھی یہ حقیقت اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ آپ نے اپنے پدرِ بزرگوار حضرت امیر المومنین علیہ السلام اور ان کے بعد امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ تمام مہماتِ دین میں منہمک رہنے، نیز قرآن وسنتِ نبوی کی ترویج وحفاظت کا ہر ممکن سامان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ قرار دیا تھا کہ دین وشریعت میں کسی بھی طرح کا رخنہ نہ پڑنے پائے۔ چنانچہ جب ۲۲/رجب ۶۰ھ کو ''باغیِ شام'' کی موت واقع ہوئی اور اس کی جگہ اس کا وہ بیٹا تختِ حکومت پر بیٹھا جس کی سرکشی اس کے باپ سے بھی بڑھی ہوئی تھی اور جس کے چہرے پر دین داری کی کوئی خفیف سی نقاب بھی نہ تھی، اس وقت امامِ حسین علیہ السلام نے حضرت موسیٰ کی طرح اس بدترین فرعون وقت سے مقابلہ میں حِکمت ومشیت الٰہی اور ''تدبُّرِ دینی'' کا کوئی تقاضہ فروگزاشت نہیں فرمایا۔

• حضرت امامِ حسین علیہ السلام ''طاغوتِ وقت'' سے مقابلے اور اس کے شر سے دین وشرافتِ انسانی کو بچانے کے لیے ۲۸/رجب ۶۰ھ کو مدینہ منورہ سے نکلے۔ تاریخ، تذکرے اور مقاتل کی کتابوں میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے سفر وقیام کی ایک ایک تفصیل موجود ہے۔ بیشتر تاریخوں نے لکھا ہے کہ جب آپ مدینہ سے

نکل رہے تھے تو آپؑ کی زبانِ مبارک پر قرآن مجید کی یہ آیت تھی جس میں حضرت موسیٰ کی وقتِ ہجرت کی دُعا نقل ہوئی ہے:

"وَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔" (سورۂ قصص آیت ۲۱)

• امامؑ تین شعبان ۶۰ھ بروز جمعہ مکّہ میں وارد ہوئے۔ مکۂ مکرمہ میں داخلے کے وقت بھی آپؑ کی زبانِ مبارک پر یہ آیت قرآنی تھی جو حضرت موسیٰ کے "مدین" میں داخلے کی قرآنی محاکات ہے۔

﴿وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَنْ يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ﴾ (سورۂ قصص آیت ۲۲)

• ۳ر شعبان سے ۸ر ذی الحجہ تک امامِ حسین علیہ السلام نے مکۂ مکرمہ میں قیام فرمایا۔ اس عرصہ میں آپؑ نے ملّت اسلامیہ کے تمام طبقات اور مملکتِ مسلمین کے تمام اطراف واکناف میں امرِ حق کی اشاعت اور وضاحت فرمائی۔ اسی دوران جب اہلِ کوفہ کو یہ معلوم ہوا کہ آپ نے "طاغوت" کی بیعت سے انکار فرمادیا ہے اور مدینہ منورہ سے نکل مکہ مکرمہ میں اقامت فرما ہیں تو اُن میں سے بعض صالحینِ امت نے آپؑ کو پورے خلوص و جوشِ ایمانی کے ساتھ کوفہ تشریف لانے اور سیرت و سنت نبویؐ کے مطابق تدبیرِ نظام فرمانے کی درخواستیں بھیجیں۔ لیکن اسی کے ساتھ بے شمار خطوط ان لوگوں نے بھی روانہ کیے جو مخلص نہ تھے بلکہ مُغرِض تھے۔ بہرحال، امام علیہ السلام کے پاس فی الجملہ اہلِ کوفہ کے اتنے خطوط پہنچے کہ حسبِ ظاہر آپؑ پر ان کی ہدایت ودستگیری فرمانے کے لیے تشریف لانا ایک لازمی امر بن گیا۔ دوسری طرف "حکومتِ شام" نے ایامِ حج اور مراسم ومناسکِ حج کے دوران ہی امام علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ بنایا اور پیشہ ور قاتلوں کو حاجیوں کے لباس میں مکہ روانہ

کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ایک تو حُرمتِ حَرمِ الٰہی کو بچانے اور دوسرے خود اپنے بے موقع قتل ہو جانے کے خطرے کو دفع کرنے کی غرض سے امامِ حسین علیہ السلام نے ۸/ ذی الحجہ ہی کو، بنا بر مشہور، حج کو عمرے سے بدل کر مکۂ مکرمہ سے کوفہ کی جانب سفر اختیار فرمایا۔ (۱)

- مکہ۔ دنہ تک کا سرنوشتِ اسلام اور تقدیرِ انسانیت بدل دینے والا یہ سفر ۱۶/ منزلوں اور ۲۳/ یا ۲۴/ دنوں میں طے ہوا۔ (۲)

- ۲/ محرم کو امام حسین علیہ السلام کربلا میں وارد ہوے۔ جہاں صرف آٹھ روز کے قیام کے بعد ۱۰/ محرم ۶۱ھ کو آپ نے چند جوانانِ بنی ہاشم اور اپنے منتخبِ روزگار اصحاب کے ساتھ تین دن کی بھوک اور پیاس میں وہ یادگار جہاد فرمایا جسے تاریخ قیامِ قیامت تک بھُلا نہیں سکتی۔ بلکہ جس کی گونج عرصۂ محشر میں بھی سنائی دے گی۔ جب سیدۂ کونین سلام اللہ علیہا ربّ اکبر سے اپنے فرزند پر ہونے والے ظلم وستم کی فریاد کریں گی۔ اور وہ عادل وکریم ظالمین کو دوزخ اور امام علیہ السلام کو اجرِ شہادت میں حقِ شفاعت عطا فرمائے گا!

---

(۱) مؤرخ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ امام حسین علیہ السلام جب مکہ سے روانہ ہوے ہیں تو آپؑ کے ساتھ پانچ سو افراد کا قافلہ تھا۔ جبکہ ابوطلحہ شافعی نے لکھا ہے کہ یہ قافلہ صرف ۸۲ مردوں پر مشتمل تھا۔

(۲) استاذ مکرم حضرت آیۃ اللہ سید ابراہیم زنجانی نے اپنی تالیف وسیلۃ الدارین فی انصار الحسینؑ میں منازل کی ترتیب اس طرح تحریر فرمائی ہے کہ امام علیہ السلام نے شہر مکہ سے نکل کر سب سے پہلے منزلِ تنعیم پر توقف فرمایا اس کے بعد منزل صفاح پر، جہاں مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی، صفاح کے بعد ذاتِ عرق میں یا وادیِ عقیق میں قیام ہوا اس کے بعد حاجز او بطن الرمہ میں، جہاں سے امامؑ نے اہلِ کوفہ کے نام ایک خط قیس بن مسہر صیداوی کے ہاتھوں روانہ فرمایا۔ اس کے بعد ایک چشمہ پر اترے جہاں عبد اللہ بن مطیع سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد منزلِ خزعیہ پر زُہیر بن القین البجلی کو دعوتِ حق دے کر اپنے ہم رکاب وہم منزل بناتے ہوے زرود پر قیام کیا، اس کے بعد ثعلبیہ پر ٹھہرے۔ یہاں آپ کو اپنے سفیر باوفا اور برادرِ عم زاد حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر ملی۔ ثعلبیہ کے بعد زبالہ، بطنِ عقبہ، اور شراف میں منزلیں ہوئیں۔ اس کے بعد ذوحسم پہاڑی کے دامن میں قرار لیا جہاں حرابن یزید ریاحی کے لشکر سے سامنا ہوا اور آپؑ نے اس تشنۂ آب وایماں اور جاں بہ لب لشکر کو سیرد سیراب فرمایا۔ ذوحسم (یا ذوحشم) کے بعد عذیب الہجانات، قصرِ بنی مقاتل اور بیصہ کے مقامات ومنازل سے گزرتے ہوئے کربلا وارد ہوے!

آپ کے ساتھ شہید ہونے والوں کے اسمائے گرامی کسی بھی صحیفہ کی زینت بنیں تو وہ صحیفہ یقیناً صحیفۂ ہدایت ونور کہلانے کا مستحق ہوگا۔ اگرچہ اس کتاب میں خود مرکزِ دائرۂ امکان سید المرسلین خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اہل بیتِ اطہار سے ہونے والے ائمۂ معصومین کا تذکرہ موجود ہے اور وہی شرفِ کتاب کے لیے کافی ہے تاہم تذکرۂ شہدا یقیناً نورٌ علیٰ نور کا مصداق ہوگا۔

مشہور ہے کہ روزِ عاشور امام حسین علیہ السلام کے ساتھ شہید ہونے والے اصحاب کی تعداد صرف ۷۲ تھی۔ لیکن نگاہِ تحقیق کو اس میں بہت تأمل ہے۔ بعض علماء نے اس موضوع پر مستقل اور مفصل کتابیں تحریر فرمائیں ہیں اور (۲۰۰) دوسو سے زائد شہداء کا تذکرہ قلم بند فرمایا ہے۔ اس باب میں کوئی تحقیقی بیان یا قولِ فیصل پیش کرنا یہاں پر میرے موضوع اور مقصدِ کتاب سے خارج ہے۔ سردست صرف اُستاذِ مکرّم علامہ آیۃ اللہ سید ابراہیم زنجانی ؒ کی کتاب وسیلۃ الدارین فی انصارِ الحسینؑ میں شامل شہداء کے نام نقل کرنے پر اکتفا کی جارہی ہے۔

ہاں! یہ وہی اصحاب باوفا ہیں جن کے متعلق امام حسین علیہ السلام کا یہ ارشادِ مبارک فوزِ عظیم اور سعادتِ کبریٰ کی سب سے بڑی سند ہے۔

"اِنّی لا اَعلَمُ اَصحاباً اَوفٰی وَلا خَیراً من اَصحابی وَلااَهلَ بَیتٍ اَبرَّ وَلا اَوصَلَ مِنْ اَهلِ بَیتِی فَجَزاکُمُ اللّٰهُ عَنّی خَیرَ الجَزاءِ."

"یقیناً میں اپنے اصحاب سے زیادہ باوفا اور بہتر اصحاب کا علم نہیں رکھتا اور نہ اپنے اہلِ بیت سے زیادہ نیکی اور صلۂ رحم کرنے والے اہلِ بیت سے واقف ہوں، اللہ تمہیں میری طرف سے بہترین جزا کرامت فرمائے!"

اصحابِ امامِ حسین علیہ السلام کی اس فہرست میں سب سے مقدم اُن کا ذکر ہے جنہیں صُحبتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شرف بھی حاصل تھا۔ اس کے بعد

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

عَلىٰ طُوْلِ أَنٰاتِهِ فِي غَضَبِهِ

وَهُوَ قٰادِرٌ عَلىٰ مٰايُرِيدُ!

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

خٰالِقِ الْخَلْقِ بٰاسِطِ الرِّزْقِ

فٰالِقِ الْاِصْبٰاحِ

ذِي الْجَلٰالِ وَالْاِكْرٰامِ

وَالْفَضْلِ وَالْاِنْعٰامِ

اَلَّذِي بَعُدَ فَلاٰ يُرىٰ

وَقَرُبَ فَشَهِدَ النَّجْوىٰ

تَبٰارَكَ وَ تَعٰالىٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَيْسَ لَهُ مُنٰازِعٌ يُعٰادِلُهُ

وَلاٰ شَبِيْهٌ يُشٰاكِلُهُ وَلاٰ ظَهِيْرٌ يُعٰاضِدُهُ

قَهَرَ بِعِزَّتِهِ الْاَعِزّٰاءَ

وَتَوٰاضَعَ لِعَظَمَتِهِ الْعُظَمٰاءُ

فَبَلَغَ بِقُدْرَتِهِ مٰايَشٰاءُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي يُجِيْبُنِي حِيْنَ اُنٰادِيْهِ

وَيَسْتُرُ عَلَيَّ كُلَّ عَوْرَةٍ وَاَنَا اَعْصِيْهِ

وَيُعَظِّمُ النِّعْمَةَ عَلَيَّ فَلاٰ اُجٰازِيهِ

فَكَمْ مِنْ مَوْهِبَةٍ هَنِيئَةٍ قَدْ اَعْطٰانِي

تمام اصحاب کے نام ان کے خاندانوں کے حوالوں کے ساتھ ثبت کیے جارہے ہیں۔

- وہ اصحابِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کربلا میں شہید ہوئے:

حضرتِ انس بن الحرث اسدی۔ تاریخ ورجال کی تمام کتابوں میں ان کا ذکر موجود ہے۔ اوران سے یہ حدیث نبوی بھی مروی ہے:

''اِنَّ ابْنِي هٰذَا يُقْتَلُ بِاَرْضٍ يُقَالُ لَهَا كَرْبَلَاءُ فَمَنْ شَهِدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَلْيَنْصُرْهُ''

''میرا یہ بیٹا (حسینؑ) اس سرزمین پر قتل کیا جائے گا جسے کربلا کہتے ہیں، بس تم میں سے جو اس وقت موجود ہو وہ اس کی نصرت ضرور کرے!''

(اسد الغابہ ج ا ص ۱۲۳ و ص ۳۴۹، اصابہ ج ا ص ۶۸، کنز العمال ج ۶ ص ۲۲۳، ذخائر العقبیٰ محب طبری ص ۱۴۶)

- حضرت حبیب بن مظاہر اسدی۔ (ابن حجر)
- حضرت مسلم بن عوسجہ اسدی۔ (ابن سعد طبقات)
- حضرت ہانی بن عروہ مرادی۔ (یہ نصرتِ امام حسینؑ ہی میں کوفہ میں شہید ہوئے)
- حضرت عبداللہ بن یقطر الحمیری۔ (ابن حجر)
- مجمع بن زیاد بن عمرو الجہینی۔ (استیعاب ابن عبد البر)

یہ بدر و احد میں بھی شریکِ پیغمبرؐ رہے تھے۔

● شہدائے بنی ہاشم یا اولادِ حضرتِ ابوطالب علیہ السلام:

- خود سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے علاوہ مندرجہ ذیل شہدائے بنی ہاشم نے کربلا میں اپنی جانی قربانیاں پیش کیں۔

۱۔ حضرت علی اکبرؑ، ۲۔ حضرت علی اصغرؑ، ۳۔ حضرت عباسؑ، ۴۔ حضرت

عبداللہ بن علیؑ، ۵-حضرت عثمان بن علیؑ ۶-حضرت جعفر بن علیؑ، ۷-حضرت ابوبکر بن علیؑ، ۸-حضرت ابوبکر بن حسین بن علیؑ، ۹-حضرت قاسم بن حسینؑ، ۱۰-حضرت عبداللہ بن حسنؑ، ۱۱-حضرت عون و۱۲-محمدؑ بن عبداللہ بن جعفرؑ، ۱۳-حضرت عبداللہ بن مسلم بن عقیلؑ، ۱۴-حضرت مسلم بن مسلمؑ، ۱۵-حضرت محمد بن سعید بن عقیلؑ، ۱۶-حضرت عبدالرحمن بن عقیلؑ، ۱۷-حضرت جعفر بن عقیل۔

• شہدائے بنی اسد:

۱۸-انس بن حرث اسدی، ۱۹-حبیب بن مظاہر اسدی، ۲۰-مسلم بن عوسجہ اسدی، ۲۱-قیس بن مسہر اسدی۔

• شہدائے آلِ ہمدان

۲۲-ابوثمامہ عمرو بن عبداللہ، ۲۳-بُریر ہمدانی، ۲۴-عابس شاکری، ۲۵-حنظلہ بن اسد، ۲۶-عبدالرحمن رجبی، ۲۷-سیف بن حرث، ۲۸-عمرو بن عبداللہ ہمدانی۔

• مذحجی شہداء

۲۹-جنادہ بن حرث، ۳۰-مجمع بن عبداللہ، ۳۱-نافع بن ہلال، ۳۲-حجاج بن مسروق۔

• انصاری شہداء

۳۳-عمرو بن قرظہ، ۳۴-عبدالرحمن بن عبدِ رب، ۳۵-جنادہ بن کعب، ۳۶-عمرو بن جنادہ، ۳۷-نُعیم بن عجلان، ۳۸-سعد بن حرث۔

• بجلی اور خثعمی شہداء

۳۹-زہیر بن قین، ۴۰-سلمان بن مضارب، ۴۱-سدید بن عمر، ۴۲-عبداللہ بن بشیر۔

• کِندی اور غِفاری شہداء

۴۳-یزید بن زیاد کندی، ۴۴-حرب بن امرؤالقیس، ۴۵-زاہر بن عمر، ۴۶-بشر بن عمرو، ۴۷-عبداللہ بن عروہ غفاری، ۴۸-جون غلام ابوذر غفاری۔

• کلبی شہداء

۴۹-عبداللہ بن عمیر، ۵۰-عبدالاعلیٰ بن یزید۔ ۵۱-سالم بن عمرو۔

• ازدی شہداء

۵۲-قاسم بن حبیب ۵۳-زہیر بن سلیم، ۵۴-نعمان بن حسان طائی۔

• عبدی شہداء

۵۵-یزید بن شبیط، ۵۶-عامر بن مسلم، ۵۷-سیف بن مالک

• تمیمی وطائی شہداء

۵۸-جابر بن حجاج، ۵۹-مسعود بن حجاج، ۶۰-عبدالرحمٰن بن مسعود، ۶۱-بکر بن حی، ۶۲-عمار بن حسان الطائی،

•-تغلبی شہداء

۶۳-ضرغامہ بن مالک، ۶۴-کنانہ بن عتیق۔

• جہینی وتمیمی شہداء

۶۵-عقبہ بن صلت، ۶۶-حر بن یزید تمیمی، ۶۷-عقبہ بن صلت۔

متفرق شہداء

۶۸-جبلہ بن شیبانی، ۶۹-قعنب بن عمر، ۷۰-عبداللہ بن یقطر۔

☆☆☆☆☆

(۲۴)

کوثرِ تسلیم

وَصَلِّ عَلَىٰ اَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ وَمُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ وَجَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ وَمُوسَىٰ بْنِ جَعْفَرٍ وَعَلِيِّ بْنِ مُوسَىٰ وَمُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ وَعَلِيِّ بْنِ مُحَمَّدٍ وَالْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ وَالْخَلَفِ الْهَادِي الْمَهْدِيِّ.

اور رحمت فرما مُسلمانوں کے پیشواؤں علی بن الحسین (امام زین العابدین)، محمد بن علی (امام باقر)، جعفر بن محمد (امام صادق)، موسیٰ بن جعفر (امام کاظم)، علی بن موسیٰ (امام رضا)، محمد بن علی (امام تقی)، علی بن محمد (امام نقی)، حسن بن علی (امام عسکری)، اور فرزند ہادیِ مہدی (امام زمانہ، امام مہدیِ منتظر) پر۔

سبطین رحمت، سردارانِ جوانانِ جنّت، امامینِ ہُمامین حضراتِ حسنین علیہما السلام پر درود وسلام کے بعد اب اہلِ بیتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہونے والے بقیہ ائمہؑ دین اور ہادیانِ اربابِ یقین پر شخصاً شخصاً، فرداً فرداً درود و سلام بھیجا جارہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی ائمہؑ دین، ائمہؑ کافۂ مسلمین بلکہ ائمہ بشریت ہیں۔ ماننے نہ ماننے کی بات علیحدہ ہے۔ ائمہ دین یا اولیاء اللہ، خلفائے حق اور اوصیائے مرسلین کا فیض ہدایت اور فیضانِ لطف ورحمت سبھی انسانوں کے لیے عام ہوتا ہے۔ خودساختہ رہنماؤں اور خُدا ساختہ اماموں میں ایک بڑا امتیاز یہی ہوتا ہے کہ خودساختہ افراد صرف اپنے ہم خیال یا اپنے ماننے والوں کی فکر رکھتے ہیں بلکہ کبھی وہ بھی نہیں ہوتی، انہیں اپنی ہی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ جبکہ خدا کے نمائندے ہمیشہ ساری خلقتِ خدا کے لیے فکرمند رہتے ہیں۔

ائمہؑ اہلِ بیت علیہم السلام کی اِمامتِ دینی اور امارتِ روحانی پر تو سبھی مسلمانوں کا اعتقاد مسلّم ہے۔ صرف چند خصوصیات کے بارے میں اختلاف یا تفرقہ واقع ہوا ہے۔ جس میں سب سے اہم خصوصیت عِصمت کی ہے اور دوسری

خصوصیت ۱۲ کی تعداد میں حصر کی ہے۔ ایک فرقہ کے لوگ اہلِ بیتِ پیغمبرؐ سے ہونے والے اماموں کو دوسرے ائمہ فقہ و حدیث اور علماء و عباد یا مجتہدین اور نساک کے زمرے میں قرار دیتے ہیں۔ ان کی عصمت اور کسی خصوصیت کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن دوسرا فرقہ اِن کی عصمت اور امتیازی خصوصیت کا قائل ہے۔

''ائمۂ مسلمین'' کی ترکیب بھی بے حد فکر انگیز اور معنیٰ خیز ہے۔ اس میں اگر لفظِ مُسلمین کے ظاہری اور اصطلاحی معنی مراد لیے جائیں تو بھی درست ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلبیت اور آپؐ کی ذریت و عترت سے ہونے والے یہ ائمۂ دین ہی حقیقۃً ائمۂ مسلمین ہیں۔ یہ بات بہت غور طلب ہے کہ جمہورِ مسلمین کے بیشتر محدثین اور مصنفین نے جو اہلبیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونے والے ائمہ کی تاریخ و سوانح کے باب میں مستقل کتابیں تالیف کی ہیں تو اسی لیے کہ وہ سربراہانِ سیاست کی تاریخ سے ان سربراہانِ دین کو یقیناً ایک امتیازی حیثیت دیا کرتے تھے۔ یعنی اکثر مسلمان فکری، قلبی اور عملی اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روحانی فیوض و برکات کے حصول کا وسلیہ انہیں ائمۂ اہلبیت کو قرار دیتے تھے۔ اس امر کی توضیح کے لیے اہلِ عرفان و تصوف کے سلسلوں پر بھی نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ اور مجامعِ حدیث و کتبِ تفسیر وغیرہ کا دقیق مطالعہ بھی اسی نتیجہ تک رہنمائی کرتا ہے۔

لفظِ ''مُسلمین'' کے ظاہری اور اصطلاحی معنی مراد نہ لیے جائیں بلکہ صرف اس کے لغوی معنیٰ پر نظر رکھی جائے، جو کہ خلافِ ظاہر ہونے کے باوجود بھی ممکن ضرور ہے، تو اس فقرے کے معنی حقیقتِ امر کی ترجمانی کے لحاظ سے اور بھی رسا اور پردہ کشا نظر آئیں گے۔ ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام عام کلمہ گویوں اور مسلمانوں کے

امام ہوں یا نہ ہوں، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عشق وعرفان کے تقاضوں اوراس کے جملہ اَحکام کے آگے مکمل خودسپردگی کو اپنا شعار بنانے والوں کے امام بے شک یہی اورصرف یہی ہیں! زیرِ خنجر سجدہ کرنے والوں، صلیب ودار پر ذکر کرنے والوں اور نوکِ نیزہ پر تلاوت کرنے والوں کی امامت صرف اورصرف اسی گھرانے میں منحصر رہی ہے کہ جسے ''خانوادۂ نبوت'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اصولی طور پر لفظِ ''مسلمین'' کے دونوں ہی معانی اس ترکیب میں ملحوظ رکھے جائیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ اَنسب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن ائمۂ اثناعشر کا ذکر یہاں پر درودوسلام کا جزو ہے، یہی ائمۂ اسلام اورائمۂ مسلمین ہیں!

اسلام کی طرف رہنمائی اور مسلمانوں کی پیشوائی انہیں نے فرمائی ہے۔ اگرکوئی نص، کوئی وصیت، کوئی دلیلِ نقلی اِن کی امامت پر موجود نہ ہوتب بھی تاریخ ان کے علاوہ کسی اورکو پیش نہیں کرسکتی! تاریخ کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا جائے۔ تاریخی بیانات میں سے تضادات کو دور کیا جائے ،اورتمام مجعولہ روایات کو حذف کردیا جائے تو یہ حقیقت اوربھی روشن ہوکرسامنے آئے گی۔ اور بحمد للہ رفتہ رفتہ دنیا اس منزل تک آرہی ہے!

یہ ائمۂ اثناعشر (بارہ امام) جن میں سے تین اماموں کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے، یعنی امیر المؤمنین امام علی مرتضیٰ علیہ السلام، سبطِ رسولؐ حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور سبطِ رسولؐ وسید الشہداء امام حسین علیہ السلام اب کے بقیہ ۹ اماموں کے مختصر مختصر تذکرے تحریر کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر اصلِ امامت سے متعلق بعض نکات کا ذکر بھی کردیا جائے۔

''امامت'' ایک فطری ضرورت اور انسان کی طبعِ حق شناسی وحقیقت جُو کا لازمی تقاضا ہے! اس کی قرآنی اساس ربّ کریم کی جانب سے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو منصبِ امامت پر فائز کیے جانے کے واقعے کے ضمن میں بیان ہوئی ہے اس کے علاوہ بھی مختلف آیتوں میں ''حقیقتِ امامت'' پر حسبِ ضرورت روشنی ڈالی گئی ہے۔

امامت کی ضرورت اس کے شرائط پر عقلی و نقلی دونوں براہین اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں بہ تفصیل پیش کیے گئے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں نظریۂ امامت و رہبری کس قدر اہمیت و عظمت کا حامل ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا اِس کی اساس و برہان قرآنی ہے۔ قرآنِ حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پروردگار کی جانب سے عہدۂ امامت پر فائز کیے جانے کا تذکرہ موجود ہے اور اسی ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دُعا کا ذکر ہے کہ ''پروردگار یہ امرِ امامت میری ذریّت میں بھی قرار دے'' جس دُعا کی اجابت میں پروردگار کی جانب سے فرمایا گیا ہے کہ ''اے ابراہم یہ عہدہ آپ کی ذریت میں ہونے والے خطا کاروں کو نہیں ملے گا''۔ واضح مفہوم یہ ہے کہ ''البتہ جو معصوم ہوں گے انہیں ضرور یہ عہدہ عطا کیا جائے گا۔'' قرآنی بلاغت نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

﴿وَاِذِابْتَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴾

(سورۂ بقرہ آیت ۱۲۴)

''اور جب ابراہیم کا ان کے پروردگار نے چند باتوں میں امتحان لیا،

اور انہوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا تو ارشاد ہوا کہ تمہیں تمام لوگوں کا امام بناتا ہوں۔ انہوں نے کہا ''میری اولاد میں سے؟'' ارشاد ہوا کہ میرا عہدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا''

اِس آیت کے علاوہ اور بھی متعدد آیتوں میں امامت کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور امامت کے لیے عدالت و عصمت کی بنیادی شرط بھی، جس طرح اس آیت سے ظاہر ہے اسی طرح اور آیتوں میں بھی موجود ہے۔

قرآنِ مجید کے علاوہ احادیثِ نبوی اور سیرت و سنّتِ مبارکہ سے امامت کی حقیقت پر مستند روایات کا بڑا ذخیرہ ہے جسے اس موضوع پر لکھی جانے والی مستقل کتابوں میں جمع کیا گیا ہے۔ یہاں پر ہم صرف ایک روایت کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم اور تقریباً دوسری تمام مشہور اور مستند عند الجمہور کتبِ حدیث میں درج ہے۔ صحیح مسلم میں کتابُ الامارہ کے تقریباً شروع ہی میں متعدد روایتیں ہیں جو سب کی سب جابر بن سمرہ پر منتہی ہوتی ہیں۔ اور مضمون کے اعتبار سے تمام کی تمام روایتیں تقریباً متحد ہیں۔ ہم ان میں سے صرف ایک روایت نقل کرتے ہیں:

''عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رضی الله تعالیٰ عنه قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صلی الله علیه و آله وسلم: لَا یَزَالُ هٰذَا الاَمْرُ عَزِیْزاً اِلیٰ اثنیٰ عَشَرَ خَلِیْفَةً، قَالَ ثُمَّ تَکَلَّمَ بِشَیْءٍ لَمْ اَفْهَمْهُ فَقُلْتُ لأبی مَا قَالَ؟ فَقَالَ کُلُّهُمْ مِنْ قُرَیْشٍ''

جابر بن سمرہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا: فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، یہ امر بارہ خلفا تک سرفراز رہے گا، انہوں نے کہا، پھر آنحضرتؐ نے کچھ

فرمایا جسے میں سمجھ نہ سکا تو میں نے اپنے والد سے کہا، کیا فرمایا؟ انہوں نے کہا: فرمایا ''وہ سب کے سب قریش سے ہوں گے''!

اِس حدیث کی جتنی روایتیں ہم تک پہنچی ہیں اُن میں کہیں ''امیراً'' کا لفظ ہے کہیں ''خلیفۃً'' کا لفظ ہے، کہیں ''اماماً'' کا لفظ ہے اور کہیں ''رجلاً'' کا لفظ ہے۔ اسی طرح شروع کے الفاظ میں لایزال ھٰذا الامر ہے، کہیں لایزال ھٰذا الدین ہے کہیں لایزال الاسلام ہے اور کہیں لایزال امرُ الناس ہے۔ لیکن ''اثنا عشر'' کے الفاظ بلا استثناء تمام روایتوں میں موجود ہیں۔

اس طرح یہ حدیث بعدِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اماموں کو بارہ کی تعداد میں منحصر قرار دیتی ہے۔ اَب وہ بارہ امام کون ہیں۔ اس سلسلے میں دوسری مستند حدیثیں توضیح وتشریح کرتی ہیں ان میں اکثر حدیثیں محدثِ جلیل علامہ حمویؒ نے فرائد السمطین میں نقل فرمائی ہیں، لیکن قبل اس کے کہ ہم اُن احادیث کا تذکرہ کریں کشکول علامہ بہائی سے ایک اہم اقتباس نقل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ بارہ اماموں کی طرف توریت میں بھی ارشارہ موجود ہے۔ توریت کی عبارت یہ ہے:

''ولیشمعئل شمعتیخا هینه برختی اوتو وهفریتی اوتو وهربیتی اوتو بمئید مئد شنیم عاسار نسیئیم یولید ونتیتو لغوی کادول''
(کشکول بہائی ج ۳ ص ۲۷۲)

اس کا ترجمہ ہے کہ ''اے ابراہیم اسماعیل کے حق میں تمہاری فریاد اور تمہارا نالہ ہم نے سنا اور اسے برکت دی اور باور کیا اور اس کو اپنی عنایت سے بے انتہا بزرگواری اور بلندی مقام عطا کیا اور اس سے بارہ سردار پیدا کریں گے اور اسے عظیم امت قرار دیں گے۔''

تمام حمد ہے اسی معبود کے لیے

جو بہت دیر میں غضب فرماتا ہے

جبکہ وہ جو چاہے کرسکتا ہے

تمام حمد ہے اسی معبود کے لیے

جو تمام خلقت کا پیدکرنے والا ہے، روزی رساں ہے

سویرے کا نور کاڑھنے والا ہے

بزرگ ہے اور بزرگی عطا کرنے والا ہے

پرفیض ہے اور نعمتیں بانٹنے والا ہے

جس نے ایسی دوری اختیار کی ہے کہ نظر نہیں آتا

اور جو ایسا نزدیک ہے کہ سرگوشیاں بھی سنتا ہے

بابرکت ہے اور بلند ہے

تمام حمد ہے اسی معبود کی جس کے برابر کا اس سے کوئی جھگڑنے والا نہیں ہے

نہ کوئی اس کا جیسا اُس کا مثل ونظیر ہے نہ اس کو سہارا دینے والا کوئی پشت پناہ!

اس نے اپنی شان سے تمام عزیزانِ دہر کو زیر کیا

اور تمام بزرگانِ دہر نے اس کی بزرگی کے سامنے فروتنی اختیار کی

اور اس نے اپنی قدرت سے جو چاہا کیا!

حمد ہے اس معبود کی! جسے میں پکارتا ہوں تو وہ میرا جواب دیتا ہے

اور میری ہر برائی کو چھپاتا ہے جبکہ میں اس کی نافرمانی کرتا ہوں

اور مجھ پر نعمتوں کی فراوانی کرتا ہے جبکہ میں اس کا صلہ نہیں دیتا

نہ جانے کتنی خوشگوار نعمتیں اس نے مجھے عطا کیں ہیں

توریت کی یہ آیت، قرآن مجید کی آیت سے کس قدر نزدیک مفہوم اور مضمون کی حامل ہے، یہ پوشیدہ نہیں۔

اب یہ روایت ملاحظہ فرمائیے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد ہونے والے بارہ اماموں کا نام بہ نام ذکر فرمایا ہے۔

عن جابر بن یزید الجعفی قال سمعت جابر بن عبداللہ الانصاری یقول قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یا جابر ان اوصیائی و ائمۃ المسلمین من بعدی اولھم علیٌ ثم الحسنُ ثم الحسین ثم علی بن الحسین ثم محمد بن علی المعروف بالباقرِ ستدرکہُ یا جابر فاذا لقیتہُ فاقرأہُ منی السلام ثم جعفربن محمد ثم موسیٰ بن جعفرثم علی بن موسیٰ ثم محمدبن علی ثم علی بن محمد ثم الحسن بن علی ثم القائم اسمہ اسمی و کنیتہُ کنیتی ابن الحسین بن علی ذاک الذی یفتح اللہ تبارک وتعالیٰ علی یدیہِ مَشارق الارضِ و مغاربَھا ذاک الذی یغیب عن اولیاء ہ غیبۃ لا یثبت علی القول بِامامَتِہ الامن امتحن اللہُ قَلبَہُ لِلایمان قالَ جابر فقلت یا رسول اللہ فھل للناس الانتفاع بہ فی غیبتہ فَقالَ ای وَالذیٰ بعثني بالنبُوّ ۃِ انھم یَستضیئوُنَ بِنورِہِ وِلایۃ فِي غَیبتِھِکانتفاع الناس بالشمس و ان سترھا سحاب ھذا من مکنون سرّ اللہ و مخزون عِلمِہِ فاکتمہ الامن اھلہ.

"(بقدر الحاجہ) جابر بن یزید جعفی سے روایت ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہ انصاری سے سنا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اے

جابر میرے اوصیاء اور مسلمانوں کے ائمہ میرے بعد بارہ ہیں جن کے پہلے علی ہیں پھر حسن پھر حسین پھر علی بن حسین پھر محمد بن علی ہیں جو باقر کے لقب سے معروف ہوں گے۔ اے جابر تم انہیں دیکھو گے تو جب تمہاری ان سے ملاقات ہو تو میرا اسلام انہیں پہنچا دینا۔ پھر جعفر بن محمد ہیں پھر موسیٰ بن جعفر ہیں پھر علی بن موسیٰ ہیں پھر محمد بن علی ہیں پھر علی بن محمد ہیں پھر حسن بن علی ہیں پھر قائم ہیں۔ ان کا نام میرا نام اور ان کی کنیت میری کنیت ہوگی۔ وہ حسین بن علی کے بیٹے ہیں۔ یہ وہی ہیں کہ خداوندِ تبارک وتعالیٰ ان کے ہاتھ پر زمین کے مشارق ومغارب فتح کرے گا۔ یہ وہی ہیں کہ جو اپنے چاہنے والوں سے غائب ہو جائیں گے۔ جس کے دل کو خدا نے ایمان سے آزمایا ہوگا صرف وہی اس غیبت پر ثابت قدم رہے گا۔ جابر کہتے ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ کیا ان کی غیبت میں ان سے لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچے گا؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں خدا کی قسم جس نے مجھے نبوت۔ سے سرفراز کیا لوگ اس کے نورِ ولایت سے اس طرح مستفید ہوں گے جیسے بادل میں چھپے ہوئے سورج سے ہوتے ہیں، یہ اللہ کے چھپے ہوئے اسرار اور اللہ کے خزانۂ علم سے ہے۔ اسے اہل افراد کے علاوہ سب سے پوشیدہ رکھنا۔" [1]

روایتیں اور بھی ہیں لیکن ہم اسی ایک روایت پر اکتفا کرتے ہیں اور اَب اہلِ بیت نبویؐ سے ہونے والے بقیہ ائمہ اطہار علیہم السلام کے تذکرے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

[1] خلفائے اثنا عشر از علامہ طالب جوہری ص ۲۷۱-۲۷۰، بحوالہ ینابیع المودۃ ج ۳ ص ۳۹۸۔

آدمِ آلِ عبا حضرت علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام

• آپ کا نامِ نامی 'علی' تھا، کنیت ابو محمد اور ابو الحسن تھی، زین العابدین، سید العابدین، آدمِ آلِ عبا، سجاد، عابد، ذوالثفنات آپ کے مشہور القاب تھے۔

کفایۃ الطالب میں ''امام حافظ ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن محمد قریشی شافعی م ۶۵۸ھ'' نے انتہائی معتبر سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے یہ حدیث روایت کی ہے:

''كنتُ عندَ رسولِ اللهِ صلى الله عليه و آله و سلم فدخَلَ عليه الحسينُ بن على عليه السلام فَضَمَّهُ الىٰ صدْرِهٖ وَ قَبَّلَهُ و أَقْعَدَهُ اِلىٰ جَنْبِهٖ، ثُمَّ قَالَ: يُولَدُ لابْنِي هٰذا ابْنٌ يقَالُ لَهُ عَليٌّ اِذا كَانَ يومَ القِيامَةِ نادىٰ مُنادٍ مِنْ بُطْنَانِ العرشِ لِيَقُمْ سَيِّدُ العَابِدِيْنَ فَيَقُومُ هُوَ'' (کفایۃ الطالب ص ۴۴۸)

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں تھا کہ حسین بن علی علیہما السلام داخل ہوئے، آنحضرتؐ نے انہیں اپنے سینے سے لگایا، پیار کیا اور اپنے پہلو میں بٹھایا پھر فرمایا ''میرے اس بیٹے کے یہاں ایک بیٹا ہوگا جس کا نام علی رکھا جائے گا جب روزِ قیامت ہوگا تو ایک آواز دینے والا عرش کی بلندیوں سے آواز دے گا کہ ''سید العابدین'' کھڑے ہو جائیں تو وہی اٹھے گا۔''

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یہ لقب خطابِ الٰہی ہے جس کی خبر مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہے۔

اسی طرح آپ کے اور القاب کے لیے مختلف روایتیں وارد ہوئیں ہیں۔ جو آپ کی مفصل سوانح عمریوں میں مذکور ہیں۔

• معلوم ہے کہ آپ کی امامت کا پہلا دن وہ قیامت خیز دن تھا جسے روزِ

عاشور کہتے ہیں۔ بقولِ علامہ جمیل مظہری:

وہ گرجتا ہوا تپتا ہوا عاشور کا دن
غلبۂ نار کا دن خاتمۂ نور کا دن
نور کا مظہرِ مطلق جو دمِ عصر بجھا
ہو گیا ایک نمونہ شبِ دیجور کا دن
بحرِ آفاق میں تنویر کے دھارے ٹکرائیں
وقت وہ تھا کہ ستاروں سے ستارے ٹکرائیں

لیکن:

خیریت گذری کہ موجود تھا اِک نورِ ہدیٰ
جس کی آواز پہ زینب کا اٹھا ہاتھ گرا
ان کے منھ سے جو نکلتا کوئی حرف فریاد
ٹوٹ جاتا یہ نظامِ کششِ ارض و سما
نہ سحر پھر کوئی ہوتی نہ سویرا ہوتا!
تا ابد دہر میں اک گھور اندھیرا ہوتا!
تم کو اے عابدِ بیمار اَب و جد کا سلام
اُن کی امّت پہ کیا رحم محمدؐ کا سلام
تم کو اسلام کی ہر زندہ علامت کی دعا
مسجد و مدرسہ و منبر و مسند کا سلام
تم نہ ہوتے تو نہ مسجد نہ یہ منبر ہوتے
تم نہ ہوتے تو خدا خانوں میں پتھر ہوتے!

حقیقت بالکل یہی ہے۔

۱۰ محرم ۶۱ھ (۹؍اکتوبر ۶۷۹ء) کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپؑ کی امامت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ آپؑ نے جس صبر و استقامت کے ساتھ سانحۂ کربلا کے بعد ''اسیری'' کا زمانہ گزارا، کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک کا اذیت ناک سفر طے کیا، کوفہ اور شام کے قید خانوں کے آلام سہے، وہ تاریخ کا ایسا المناک باب ہے جس پر کسی بھی صاحبِ احساس کی آنکھیں خشک نہیں رہ سکتیں۔ مرزا غالب دہلوی کے چند شعر مجھے بہت اچھے لگتے ہیں، ربّ کریم انہیں فرزدقؔ کے ساتھ شریکِ اجر قرار دے!

ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو
ہمارا مُنھ ہے کہ دیں اُس کے حسنِ صبر کی داد
مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اس کو
وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اس کو
امام وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد
پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اس کو

☆☆☆

• امامِ سجاد علیہ السلام نے اصول و فروعِ دین کے استحکام، اشاعت احکام، تعلیم فرائض، بیانِ اسرارِ قیامت، اور فی الجملہ امرِ امامت کا حق کس کس طرح سے اور کیسے کیسے حالات میں ادا کیا ہے تاریخ کے صفحات میں جلی حرفوں سے لکھا ہوا ہے۔

مثال کے طور پر یہ روایت ملاحظہ فرمائیے:

امام سجادؑ کربلا کے لٹے ہوئے قافلہ کی سار بانی فرماتے ہوئے اسیری کے عالم

میں دمشق میں لائے جا رہے ہیں۔ ابراہیم بن ابی طلحہ نامی شخص آپؑ سے مخاطب ہو کر یہ نشتر زنی کرتا ہے کہ علی بن حسین فتح کس کی ہوئی؟ امام نے بہ کمالِ صبر و متانت جواب دیا: ''ذرا ٹھہر جاؤ، ابھی اذان ہوگی تو معلوم ہو جائے گا کہ فتح کس کی ہوئی!'' اللہ اکبر! اس مختصر سی روایت میں کتنی باتیں الم نشرح ہو رہی ہیں!

- یہ آپ کی ذاتِ گرامی تھی جس نے بعد حوادثِ کربلا، مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حُرمت ومَعنویت کو دوبارہ بحال فرمایا اور اپنے چونتیس برس کے عہدِ امامت میں ایسے اسلام شناس افراد کی تربیت فرمائی جنہوں نے قرآنِ مجید اور سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق اصیل ورصین علوم و معارف اہلِ دنیا تک پہنچائے!

سوچا جا سکتا ہے کہ اگر اصولِ دین و احکامِ دین، آدابِ اسلامی و تہذیبِ محمدیؐ کی تعلیم و تربیت اور ترویج و اشاعت میں حضرتِ سید سجاد علیہ السلام کی محنتیں نہ ہوتیں تو آج دنیا کے دامن میں اسلام جیسی نعمت موجود نہ ہوتی۔ دَربارِ سیاست و سرمایہ داری اور نظامِ جبر وظلم سے وابستہ اصحابِ قول و قلم کیا بولتے اور کیا لکھتے؟ قرآن وسنت کے نام پر نہ جانے کیسی کتاب اور کیسے کردار کی ترویج ہوتی؟ جس طرح یہود و نصاریٰ کی تاریخوں میں ہوا! یہ تو صرف حضرت سید سجاد امام علی بن الحسین علیہ السلام کی ذاتِ گرامی تھی جنہوں نے واقعۂ کربلا کی حقیقت کو بھی اہلِ دُنیا کے سامنے پیش کیا اور حقیقتِ اسلام کو بھی محفوظ فرمایا!

- آپؑ کے علم و شجاعت کا اعجاز، وہ خطبہ جسے آپؑ نے دربارِ شام میں دیا تھا، تاریخ وادب کی کتابوں میں بے نظیر شہرت رکھتا ہے اور اپنے دامن میں حقائق و معارف کا ایک عالَم سمیٹے ہوئے ہے۔

- آپ سے مروی احادیث نبویؐ، اصولِ احکام و اخلاقِ اسلامی پر آپؑ

کے مواعظ اور ملفوظات کے جواہر پارے تمام اسلامی مآخذ میں جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔

- آپ کی دعاؤں کا مجموعہ ''صحیفۂ کاملہ'' کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ جسے صحیفۂ سجادیہ، ''زبورِ آلِ محمد'' اور ''انجیلِ اہلبیت'' کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بجائے خود الٰہیات واخلاقیات کا ایک دائرۃ المعارف ہے۔

- رسالۃ الحقوق کے نام سے ایک مستقل اور انتہائی اہم منشورِ حقوق بھی آپؑ سے روایت کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے صحیفۂ مبارکۂ سجادیہ اور رسالۃ الحقوق کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن یہ علم وعرفان کے وہ سرچشمے ہیں جن سے مسلسل استفادہ کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

- اگرچہ ہم نے آپؑ کے خطبۂ دمشق کی مفصل شرح، سند ومتن کی حتی الامکان تحقیق وتصحیح کے ساتھ، علیحدہ لکھی ہے۔ لیکن یہاں پر بغیر کسی شرح وبیان کے اسے اپنے اس صحیفہ کی زینت بنانا بھی اپنے لیے مزید سعادت سمجھتے ہیں۔

مختلف مصادر میں اس خطبے کے مختلف اجزا نقل کیے گئے ہیں۔ لیکن، بیشتر روایتوں میں جو کلمات مشترک ہیں اور جن کے تطابق اور تواتر سے فی الجملہ اُن کے امام علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے صادر ہونے کا یقین حاصل ہوتا ہے وہ بروایتِ ابنِ شہر آشوب یہ کلمات ہیں۔ آپ نے حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا:

مَعَاشِرَ النَّاس مَنْ عَرَفَنِي فَقَدْ عَرَفَنِي، وَ مَنْ لَمْ يَعْرِفْنِي أُعَرِّفُهُ نَفْسِي. أَنَابْنُ مَكَّةَ وَ مِنا، اَنا ابن زَمْزَمَ وَالصَّفا، انا ابنُ محمدٍ المصطفىٰ. اَنَا ابنُ مَنْ لا يَخفىٰ. اَنَابْنُ مَنْ عَلىٰ فَاسْتَعْلىٰ فَجازَ سِدْرَةَ الْمُنتَهىٰ. وَكَانَ مِنْ رَبِّهِ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ اَدْنىٰ. أَنَابْنُ مَنْ صلى بِمَلائِكَةِ السَّمَاءِ مَثْنىٰ مَثْنىٰ. اَنَا ابنُ مَنْ اُسرِىَ بِهِ مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى

٢٩٦

الْمَسْجِدِ الاَقْصیٰ.

اَنَا ابْنُ عَلِیِّ الْمُرْتَضیٰ، اَنَا ابْنُ فَاطِمَةَ الزَّهْرَاء، اَنَا ابْنُ خَدِیْجَةِ الْكُبْریٰ، اَنَا ابْنُ الْمَقْتُوْلِ ظُلْماً، اَنَا ابْنُ الْمَقْطُوْعِ الرَّأْسِ مِنَ الْقَفَا. اَنَا ابْنُ الْعَطْشَانِ حَتّٰی قَضیٰ. اَنَا ابْنُ طَرِیْحِ كَرْبَلاء. اَنَا ابْنُ الْمَسْلُوْبِ الْعِمَامَةِ وَ الرِّدَاءِ، اَنَا ابْنُ مَنْ بَكَتْ عَلَیْهِ مَلَائِكَةُ السَّمَاءِ، اَنَا ابْنُ مَنْ نَاحَتْ عَلَیْهِ الْجِنُّ فِی الْاَرْضِ وَالطَّیْرُ فِی الْهَوَاءِ. اَنَا ابْنُ مَنْ رَأْسُهُ عَلَی السِّنَانِ یُهْدیٰ اَنَا ابْنُ مَنْ حَرَمُهُ مِنَ الْعِرَاقِ اِلَی الشَّامِ تُسْبیٰ. اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللهَ تَعَالیٰ وَ لَهُ الْحَمْدُ ابْتَلَانَا اَهْلَ الْبَیْتِ بِبَلَاءٍ حَسَنٍ حَیْثُ جَعَلَ رَایَةَ الْهُدیٰ وَالْعَدْلِ وَالتُّقیٰ فِیْنَا وَجَعَلَ رَایَةَ الضَّلَالَةِ وَالرَّدیٰ فِیْ غَیْرِنَا وَ فَضَّلَنَا اَهْلَ الْبَیْتِ بِسِتَّةِ خِصَالٍ: فَضَّلَنَا بِالْعِلْمِ وَالْحِلْمِ وَالشَّجَاعَةِ وَالسَّمَاحَةِ وَ الْمَحَبَّةِ وَ الْمَحَلَّةِ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاٰتَانَا مَا لَمْ یُؤْتَ اَحَداً مِنَ الْعٰلَمِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا فِیْنَا نُزُوْلُ الْمَلَائِكَةِ وَ تَنْزِیْلُ الْكُتُبِ.

''لوگو! جس نے مجھے پہچان لیا، پہچان ہی لیا اور جس نے مجھے نہیں پہچانا اس کو میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔ میں مکّہ اور مِنا کا فرزند ہوں، میں زمزم اور صفا کا فرزند ہوں۔ میں محمد مصطفےٰؐ کا فرزند ہوں۔ میں اس کا بیٹا ہوں جو انتہائے شہرت سے محتاجِ تعارف نہیں۔ میں اس کا بیٹا ہوں جو بلندی پر پہنچا تو اتنا بلند ہوا کہ سدرۃ المنتہیٰ سے گزر گیا۔ اور اپنے پروردگار سے اتنا قریب ہُوا کہ دو کمانوں یا اس سے بھی کمتر فاصلہ رہ گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس نے ملائکۂ سماوات کو دو دو بار نماز پڑھائی، میں اس کا بیٹا ہوں جسے مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک سیر کرائی گئی، میں علی

مرتضیٰ کا بیٹا ہوں۔ میں فاطمہ زہرا کا بیٹا ہوں۔ میں خدیجۂ کبریٰ کا بیٹا ہوں۔ میں اس کا بیٹا ہوں جسے ظلم سے شہید کیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا سر پسِ گردن سے کاٹا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جسے مرتے مرتے پانی نہ دیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کی لاش کربلا میں بے گوروکفن پڑی رہی۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا عمامہ اور کمر کا پٹکا تک (لاشے سے) اتار لیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جسے آسمان کے فرشتے روے۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کے لیے زمین پر جنوں نے اور فضا میں پرندوں نے گریا کیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا سر نوکِ نیزہ پر شہر بہ شہر پھرایا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کے حرم عراق سے شام تک قیدی بنا کر لائے گئے۔ لوگو! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم اہلِ بیت کو اچھی آزمائش میں مبتلا کیا، کیوں کہ اس نے ہدایت، انصاف اور تقویٰ کا پرچم ہمیں میں بلند کیا ہے اور گمراہی اور ہلاکت کا جھنڈا ہمارے حریفوں سے مختص کیا ہے۔ اور اُس نے ہم اہلِ بیت کو چھ خصلتوں کے باعث فضیلت عطا فرمائی ہے۔ یعنی علم، بردباری، شجاعت، سخاوت اور مؤمنین کے دلوں میں محبت اور مقام اور ہم کو وہ (مرتبہ) دیا جو کائنات میں ہم سے پہلے کسی کو نہیں دیا۔ ہم ہی پر ملائکہ اور آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔

روایتوں میں ہے کہ حضرت سجاد علیہ السلام کا یہ خطبہ مکمل نہ ہوسکا۔ حقیقتوں کے انکشاف کی بنا پر دربار میں تلاطم پیدا ہوگیا اور کفر وستم شعار حاکم نے اذان کا سہارا لے کر امام کے سلسلۂ کلام کو منقطع کر دیا۔

☆☆☆☆☆

حضرت امام باقر علیہ السلام

- آپ کا نامِ نامی محمد، کنیت ابو جعفر اور مشہور ترین لقب الباقر ہے۔ اس کے علاوہ شاکر اور ہادی بھی آپ کے القاب تھے۔
- اشاعتِ علومِ دین آپ کا اور آپ کے فرزند و جانشین امام جعفر صادق علیہ السلام کا خاص کارنامہ ہے۔

اردو کے نامور مصنفین میں مولانا ابوالکلام آزاد نے، جو ہندوستان کے بڑے سیاسی رہنماؤں میں بھی شمار ہوتے ہیں اور بڑے مفکرین، علماء اور ادباء میں بھی، اپنی مشہور کتاب ''تذکرہ'' میں ایک مقام پر لکھا ہے:

''آج قرآن و علومِ انبیائے کرام کے خلاف کوئی ایک چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ایسی نہیں کہی جاتی اور نہیں کہی جا سکتی، جو اصولاً پہلے نہیں کہی جا چکی ہو، بلکہ عین قرآنِ حکیم کے نزول اور اُس کے ۲۳ رسالہ زمانے میں نہ کہی گئی ہو اور خود قُرآن وسنت نے اس کا جواب نہ دے دیا ہو...... علی الخصوص جن اربابِ نظر نے صرف حضرات ائمۂ اربعہ ہی کے مناظرات مُسکِتہ اور ائمۂ اہلِ بیت کرام علی الخصوص حضرت امام باقر و امام جعفر الصادق علیہما وعلیٰ آبائہما واجدادھما الصلوٰۃ والسلام کی احادیثِ مُفصلہ حِکَمِیّہ بمقابلۂ مشککینِ ملاحدہ وزندقہ مطالعہ کی ہیں، جن کا گھر وحی و نبوت کا گھر اور جن کا دروازہ بابِ مدینۂ علم، اور جن کے اطفال واحداث تک علمِ نبوت و فیضانِ رسالت کی گود میں پرورش پانے والے تھے، وہ بھلا آج کل کے غلغلۂ الحاد کو کب خاطر میں لا سکتے ہیں،...''

(ابوالکلام آزاد، تذکرہ، صفحات ۲۲۸، ۲۲۹)

حضرت امام باقر علیہ السلام کا ایک خصوصی شرف و امتیاز حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کی اس روایت سے سامنے آتا ہے جسے اکثر محدثین نے قابلِ

وَعَظِيمَةٍ مَخُوفَةٍ قَدْ كَفانِي

وَبَهْجَةٍ مُونِقَةٍ قَدْ أَرانِي

فَأُثْنِي عَلَيْهِ حامِداً

وَاذْكُرُهُ مُسَبِّحاً

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي

لَايُهْتَكُ حِجابُهُ وَلَايُغْلَقُ بابُهُ

وَلَايُرَدُّ سائِلُهُ

وَلَايُخَيَّبُ آمِلُهُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي يُؤْمِنُ الْخائِفِينَ

وَيُنَجِّي الصَّالِحِينَ

وَيَرْفَعُ الْمُسْتَضْعَفِينَ

وَيَضَعُ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ

وَيُهْلِكُ مُلُوكاًوَيَسْتَخْلِفُ آخَرِيْنَ

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ قاصِمِ الْجَبَّارِينَ

مُبِيرِ الظَّالِمِينَ

مُدْرِكِ الْهارِبِينَ

نَكالِ الظَّالِمِينَ

صَرِيْخِ الْمُسْتَصْرِخِينَ

مَوْضِعِ حاجاتِ الطَّالِبِينَ

مُعْتَمَدِ الْمُؤْمِنِينَ

وثوق اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ہم یہاں پر امالیِ صدوقؒ کی وہ روایت نقل کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں جسے علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں بھی نقل فرمایا ہے:

[ابن الوليدِ، عن الحميرى، عَنْ ابنِ يَزِيدٍ، عن ابن أبِى عميرٍ عنْ ابانِ بن عُثمانٍ، عن الصادقِ جعفربن محمدٍ عليهماالسلام قال: اِنَّ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه و آله وسلم قَال ذاتَ يومٍ لجابرِ بن عبد الله الانصارى: اِنَّکَ سَتَبقىٰ حتّىٰ تلقى وَلدِىْ محمدَ بن عليٍّ بن الحسينِ بن على بنِ ابىْ طالبِ المعروفِ فِى التَّوراتِ بالبَاقِرِ فاِذا لَقِيتَهُ فاقرأهُ منّى السَّلامَ فدخلَ جابر اِلىٰ على بن الحسين عليه السلام فوَجدَ محمدَبنَ عليٍّ (عليهماالسلام) عندهُ غلاماً فقالَ لَهُ :ياغلام أقبِلْ فأقبلَ ثُمَّ قالَ لَهُ أدْبِرْ فأدْبَرَ فقَالَ جابرٌ : شَمَايلُ رسوُلِ اللهِ صلى الله عليه و آله وسلم وَرَبِّ الكَعْبةِ. ثُمَّ علىٰ على بنُ الحسَيْنِ فقالَ لهُ : مَنْ هٰذا؟ قالَ هٰذا اِبْنِىْ و صَاحِبُ الامْرِ بَعْدِىْ محمدٌ الباقِر. فقام جابرٌ فَوقَعَ علىٰ قدَمَيهِ يُقبِّلُها وَيقُولُ نَفسِىْ لِنفسِکَ الفِداءُ ياابن رسولِ اللهِ، اِقْبلْ سَلامَ أبِيکَ، اِنَّ رَسُولَ اللهِ صلى الله عليه و آله وسلم يُقرِءُ عَلَيکَ السَّلامَ، قالَ: فَدَمَعَتْ عَيْنا أبِىْ جعفرٍ عليه السلام ثمَّ قالَ: يَاجابر عَلىٰ أبِىْ السَّلامُ مَادامَتِ السَّماواتُ وَ الارْضُ وَعَلَيکَ يَاجابِر بِمَا بَلَّغتَ السَّلامَ"۔

(بحار، ج۴۶،ص۲۲۴، بحوالہ امالی ص۳۵۳)

اس روایت کی کئی لحاظ سے اہمیت ہے۔ اوّلاً سند قابلِ اعتبار ہے۔ ثانیاً اس کے متن سے کئی اہم نکات منکشف ہوتے ہیں۔

- سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ ان روایتوں کے زمرے میں آتی ہے جن میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ائمہ اثنا عشر کی تعداد اور ان کے اسماء کی نشاندہی اور تعیین فرمائی ہے۔
- ایک لحاظ سے یہ روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزاتِ اخبار بالمغیّبات سے متعلق روایتوں میں بھی شمار کی جاسکتی ہے۔
- یہ نکتہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ پانچویں امام حضرت ابوجعفر محمد بن علی بن الحسین علیہ السلام کو ''الباقر'' کا لقب ربّ کریم ہی کی جانب سے عطا ہوا ہے اور اسی بناپر اس کا ذکر توراۃ میں پایا جاتا ہے۔

تہذیبی نقطۂ نظر سے یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ مجالسِ ائمہ اطہار علیہم السلام میں اُن کے صحابہ کی حاضری کا انداز، گفتگو کا سلیقہ، اُن کے آدابِ محبت اور مراتبِ احترام کیا ہوا کرتے تھے۔ مثلاً حضرت جابر بن عبداللہ جیسے بزرگ صحابیِ رسول کا حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے قدموں کو چومنا اور ''اے فرزندِ رسول'' کہہ کر مخاطب کرنا۔

عرصہ ہوا میں نے اس روایت کو ذہن میں رکھ کر ایک رباعی کہی تھی اسے یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا:

حق نے جسے تا حدِّ وصیؑ پہنچایا
تا مسند و منبرِ علیؑ پہنچایا
میرا بھی سلامِ شوق پہنچے جس کو
جابرؓ نے سلامِ نبویؐ پہنچایا

• حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانے میں تاریخِ دنیوی سے متعلق بھی ایک اہم واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ آپؑ ہی کے مشورے سے مسلمانوں کی حکومت کا "سکہ" تیار ہوا۔ ورنہ اس وقت تک رومی سکّے مسلمانوں کی معیشت واقتصاد کی بنیاد بنے ہوئے تھے۔

• حضرت امام باقر علیہ السلام سے مروی اصول وفروعِ دین سے متعلق علوم ومعارف کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا اجمالی اعتراف تو اوپر نقل کیا گیا، لیکن اس کی تفصیل کے لیے صدہا جلدوں پر مشتمل دائرۃ المعارف کی تالیف درکار ہوگی۔ یہاں پر ہم آپؑ کا صرف ایک ارشادِ گرامی نقل کرنے پر اکتفا کررہے ہیں۔

بحارالانوار، کتاب العلم (ج ۱، باب ۷ ص ۲۲۲ حدیث نمبر ۵) میں ارشاد باقریؑ ہے:

"اِذاجَلَسْتَ اِلیٰ عَالِمٍ فَکُنْ عَلیٰ اَنْ تَسْمَعَ اَحْرَصَ مِنکَ عَلیٰ اَنْ تَقُوْلَ، وَتَعَلَّمْ حُسْنَ الاسْتِمَاعِ کَمَا تَتَعَلَّمُ حُسْنَ الْقَوْلِ، وَلَا تَقْطَعْ عَلیٰ اَحَدٍ حَدِیْثَهُ".

تعلیم یہ ہے کہ "جب تم کسی عالم کی مجلس میں بیٹھو تو اُس کے سامنے زیادہ بولنے کے بجائے زیادہ سُننے کی کوشش کرو۔ اور جس طرح حسنِ تقریر وتکلم سیکھتے ہو اُسی طرح "حُسنِ سماعت" بھی سیکھو۔ اور کبھی کسی کی بات نہ کاٹو۔"

• حضرت امام باقر علیہ السلام کی تاریخ ولادت وشہادت بنا بر مشہور درج ذیل ہے:

ولادت: ۱/رجب ۵۷ھ مطابق ۹/مئی ۶۷۷ء بروز شنبہ بمقام مدینہ منورہ۔

شہادت: ۷/ذی الحجہ ۱۱۴ھ مطابق ۲۸/جنوری ۷۳۳ء بروز چہارشنبہ بمقام مدینہ منورہ۔

☆☆☆☆☆

حضرت امامِ صادق علیہ السلام

بارہ اماموں میں سے چھٹے امام حضرت جعفر صادق علیہ السلام تھے۔ آپ کا نامِ نامی جعفر، مشہور ترین کنیت ابوعبداللہ، اور معروف ترین لقب صادق ہے۔

آپ کی ولادت ۱۷/ربیع الاول ۸۳ھ مطابق ۲۰/اپریل ۷۰۲ء مدینہ منورہ میں ہوئی۔ روایاتِ اہلِ بیتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ۱۷/ربیع الاول ہی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخِ ولادت بھی ہے۔ یہ ذکر گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے۔ اسی مناسبت سے اس روز کا بڑا اشرف ہے، اصحابِ ذکر و عبادات نے اس روز خصوصی اعمال، اوراد، وظائف اور عبادات وزیارت کا تذکرہ کیا ہے۔ اِس تاریخ کو روزہ رکھنے کا ثواب ایک سال کے روزوں کے برابر نقل کیا گیا ہے۔

آپ کے بارے میں حضرت امام باقر علیہ السلام کا یہ ارشادِ گرامی ہے کہ ''میرا یہ فرزند اُن چند مخصوص افراد میں سے ہے جن کے وجود سے خدا نے اپنے بندوں پر احسان فرمایا ہے اور یہی میرا جانشین ہوگا۔''

آپ کی شہادت حاکمِ جور و طاغوتِ وقت کی جانب سے زہر خورانی کے سبب واقع ہوئی۔ تاریخ وصال ۱۵/شوال ۱۴۸ھ اور (بقولے ۲۵/شوال ۱۴۸ھ) مطابق ۳ دسمبر ۷۶۵ء بروز سہ شنبہ یا ۱۳ دسمبر ۷۶۵ء بروز جمعہ ہے۔

حضرت امامِ باقر علیہ السلام کی تاریخ وفات ۷/ذی الحجہ ۱۱۴ء سے آپ کا عہدِ امامت شروع ہوتا ہے۔ آپ کے تقریباً ۳۴/برس کے عہدِ امامت میں آپ کی زیرِ سرپرستی بہت سے علوم وفنون پر بہت گراں قدر کام ہوا۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد بطورِ محاورہ چار ہزار مشہور ہے۔ مُراد یہ ہے کہ ہزارہا تشنہ گانِ علم آپ کے

فیضانِ ہدایت و حکمت سے سیر و سیراب ہوے اور آپ کے اصحاب و تلامذہ کے ہاتھوں بکثرت کتابیں تالیف ہوئیں۔ جنھیں کتبِ رجال و فہارس میں اصولِ اَربعمائۃ (چارسو اَصلوں یا کتابوں) کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔

عہدِ حاضر میں آپ کے حالاتِ زندگی اور آپ سے مروی علوم و معارف کی تدوین کے سلسلہ میں کچھ عرصہ قبل علامہ سید کاظم قزوینیؒ نے ''موسوعۃ الامام الصادقؑ'' (امام صادق انسائکلوپیڈیا) کی تالیف کی داغ بیل ڈالی تھی۔ جس کی کچھ جلدیں اُن کی زندگی میں شایع ہوئیں، اب اس منصوبہ پر اُن کے فرزند اور تلامذہ کام کررہے ہیں اور ابھی بہت کام باقی ہے۔

● امام صادق علیہ السلام کے خصوصیات میں جو معجزات و کرامات نقل کیے جاتے ہیں، وہ بھی بے شمار ہیں۔ لیکن ہم عصرِ حاضر کے اذہان کو آپ کے اور دیگر ائمۂ اہل بیت علیہم السلام کے صرف علمی اور قولی معجزات کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہی سبیلِ علم بھی ہے سلسبیلِ نجات بھی!

● امام صادقؑ سے مروی علوم اور آداب میں جنھیں آپ کے اصحاب اور تلامذہ نے مدون فرمایا خصوصیت کے ساتھ علمِ فقہ، اصولِ فقہ، علومِ تفسیر، علوم و آدابِ عرفانِ اسلامی یا تصوف اسلامی، علومِ حدیث و درایت اور علمِ کیمیا وغیرہ کا بطورِ خاص تذکرہ کیا جاسکتا ہے کہ ان علوم کی کوئی بھی تاریخ آپؑ کے نام نامی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ لیکن امامِ صادق علیہ السلام کے زندہ علمی معجزات میں جتنے بھی علوم کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے ان سب کے درمیان اس مقام پر ہم بطورِ خاص علمِ فقہ کا تذکرہ قدرے وضاحت کے ساتھ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس لیے کہ یہ علم عالمِ بشریت کی عظمت و سعادتِ دائمی اور انسانیت کے معیارِ شرافت کا بنیادی قاعدہ، اصولی ضابطہ اور عملی دستور فراہم کرتا ہے۔

علمِ فقہ(۱) اور اسی طرح علم اصولِ فقہ کو دینِ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی علمی اور تہذیبی میراث کے اہم ترین خصوصیات میں شمار کیا جانا چاہیے۔ کسی مذہب میں ''قانون سازی'' پر اصولاً اور عملاً اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا اسلام نے اس کا اہتمام کیا اور اس سے بہت کچھ براہِ راست اور بہت کچھ بالواسطہ تمام انسانیت کو فائدہ پہنچا اور آج بھی پہنچ رہا ہے۔ اسی لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ ''فقہ'' وہ علم ہے جس میں ''ختمِ نبوت'' کا ایک تہائی راز پوشیدہ سمجھا جاسکتا ہے۔ دوسرے تمام علومِ اسلامی کی نسبت سے اِسے ''جوہرِ علم'' بھی کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ تمام علومِ قرآن و حدیث اور علومِ ادب کو علم فقہ کی نسبت سے مبادی و مقدمات کی حیثیت حاصل ہے۔ عرفانی زاویۂ نظر سے عارفِ الٰہی شیخ محمد بہاری کا یہ جملہ بہت معنی خیز ہے کہ ''فقہ مقدمۂ تہذیبِ اخلاق ہے اور تہذیبِ اخلاق مقدمۂ توحید ہے!''

---

(۱) فنی اعتبار سے فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ یہ احکامِ دین کو ان کے دلائل سے تفصیلی استدلال کے ساتھ حاصل کرنے کا علم ہے۔

علمِ فقہ کے بنیادی مآخذ صرف دو ہیں: قرآن اور سنت۔ البتہ فنی تقاضوں کے تحت ادلۂ فقہیہ کو چار قسموں پر منقسم کیا جاتا ہے۔ (۱) قرآن (۲) سنت (۳) اجماع (۴) عقل۔

مکاتبِ اہلِ سنت والجماعت میں عقل کے بجائے قیاس کو ادلۂ فقہیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ وہ بھی قیاس منطقی نہیں بلکہ وہ قیاس جسے منطق کی اصطلاح میں تمثیل کہا جاتا ہے۔

فقہ جعفری کی چند بنیادی کتابوں میں تبصرۃ المتعلمین، لمعہ، شرح لمعہ، شرائع الاسلام، عروۃ الوثقیٰ، منہاج الصالحین اور تحریر الوسیلہ چند متداول اور قابلِ حوالہ کتابیں ہیں۔ یہ تمام کتابیں فقہ سازج کی ہیں۔ فقہ استدلالی کی کتابوں میں شرح لمعہ، مکاسب، مصباح الفقیہ، ریاض، مستمسک عروۃ الوثقیٰ، التنقیح اور الفقہ وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ابوابِ فقہ کا دائرہ ابوابِ زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ بعض ماہرین نے اسے دو بڑے حصوں میں منقسم کیا ہے: (۱) عبادات (۲) معاملات۔

بعض ماہرین نے چار قسموں پر منقسم کیا ہے: (۱) عبادات (۲) احکام (۳) عقود (۴) ایقاعات۔

فی الجملہ علمِ فقہ کے مشہور ابواب و کتب حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ کتاب الطہارۃ، صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کے احکام۔ (۲)۔ کتاب الصلاۃ، نماز کے احکام (۳) کتاب الزکاۃ، زکاۃ کے احکام۔ (۴) کتاب الخمس، خمس کے احکام (۵) کتاب الصوم، روزہ کے احکام۔ (۶) کتاب الاعتکاف، اعتکاف کے احکام (۷) کتاب الحج۔ (۸) کتاب العمرہ۔ (۹) کتاب الجہاد (۱۰) کتاب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر (۱۱) کتاب التجارۃ (۱۲) کتاب الرہن (۱۳) کتاب الضمان (۱۴) کتاب الصلح (۱۵) کتاب الشرکۃ (۱۶) کتاب المضاربۃ (۱۷) کتاب المزارعۃ (۱۸) کتاب المساقاۃ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت امام جعفرِ صادق علیہ السلام کا فیضانِ علم و عصمت علم فقہ کے استحکام، اس کی ترقی اور توسیع میں کس قدر کارفرما رہا اس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ آج فقہ اسلامی یا ''فقہ مصطفویؐ'' کے لیے فقہ جعفری کا نام بھی رائج ہو چکا ہے۔ یوں تو فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی کے مکاتب بھی موجود ہیں لیکن ان تمام مکاتب کے سربراہان یا تو براہِ راست یا ایک دو واسطوں سے حضرت امامِ جعفرِ صادق علیہ السلام کے تلامذہ ہی میں شمار ہوتے ہیں۔ اس تاریخی حقیقت کے پیشِ نظر بھی کہ دوسرے تمام مکاتبِ فقہ و کلام کے سرگزاران امام صادق علیہ السلام کے شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں میں ہی قرار پاتے ہیں اور خود امام جعفر صادق علیہ السلام کے مخصوص امتیازات کے پیشِ نظر بھی فقہ جعفری کی اہمیت اپنی جگہ ہر دور میں مسلم رہی ہے۔

فقہ جعفری کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں عقل کی اہمیت، اصالت اور ''حُجیّت''، یعنی عقل کی آئین و قانون ساز حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے بالمقابل جن مکاتب کو پروان چڑھایا گیا ان میں ''عقل'' کی جگہ ''قیاس'' کو دی گئی، اور قیاس بھی قیاسِ منطقی یا قیاسِ برہانی نہیں، بلکہ ''قیاسِ شعری'' یا ''تمثیل''! اسی

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) (۱۹) کتاب الودیعہ (۲۰) کتاب العاریۃ (۲۱) کتاب الاجارۃ (۲۲) کتاب الوکالۃ (۲۳) کتاب الوقف (۳۴) کتاب الصدقات (۳۵) کتاب السکنیٰ والحبس (۳۶) کتاب الهبات (۳۷) کتاب السبق والرمایۃ (۳۸) کتاب الوصایا (۳۹) کتاب النکاح (۴۰) کتاب الطلاق (۴۱) کتاب الخلع والمبارأۃ (۴۲) کتاب الظہار (۴۳) کتاب الایلاء (۴۴) کتاب اللعان (۴۵) کتاب العتق (۴۶) کتاب التدبیر (۴۷) کتاب المکاتبۃ (۴۸) کتاب الاستیلاد (۴۹) کتاب الاقرار (۵۰) کتاب الجعالۃ (۵۱) کتاب الایمان (۵۲) کتاب النذر (۵۳) کتاب الصید (۵۴) کتاب الذباحۃ (۵۵) کتاب الاطعمۃ والاشربۃ (۵۶) کتاب الغصب (۵۷) کتاب الشفعۃ (۵۸) کتاب الاحیاء الموات (۵۹) کتاب اللقطۃ (۶۰) کتاب الفرائض (۶۱) کتاب الفرائض (۶۲) کتاب القضاء (۶۳) کتاب الشہادات (۶۴) کتاب الحدود والتعزیرات (۶۵) کتاب القصاص (۶۶) کتاب الدیات۔

طرح ''حسن وقبح عقلی'' کے انکار کے باوصف ''استحسان'' کا طریقِ کار بھی داخل کیا گیا، جو کوئی منطقی یا علمی قانونی اساس ہونے کے بجائے صرف ایک ''ذوقی پیمانہ تجویز وتجاوز'' کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

''قانون سازی'' کے بنیادی قاعدے میں اگر منطقی اور علمی لحاظ سے خلل واقع ہوجائے اور اس کے عملی اطلاقات اور نفاذ کے مراحل میں بھی صرف ظاہری مماثلتوں اور ذوقی ترجیحات کا دخل ہوجائے تو پھر نظامِ قانون کی کیا صورت بن سکتی ہے؟! اس کا اندازہ کوئی بھی سنجیدہ ذہن بخوبی کرسکتا ہے۔ پھر جب ماٴخذِ قانون میں سماعی دلیلوں اور نظیروں کو پیش کرنے والے بھی ''دربار وسرکار وخزانہ'' کی سیاستوں اور دنیوی مصلحتوں کے پاسدار ہوں تو اس نظام میں مزید کتنی خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں اس کا شمار بھی کسی عدل وانصاف پسند اور خدا ترس انسان کو لرزہ براندام کردینے کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے آج بھی دُنیا میں فقہ جعفری کی ساکھ قائم ہے کہ اُس کے بنیادی قواعد علم وعقل ومنطق کے ناقابِل تزلزل اَرکان پر قائم ہیں اور اس کے ''سماعی دلائل'' اہلِ بیتِ رسالت کے معصوم اماموں اور اُن اصحابِ ابرار کے سلسلوں سے نقل ہوتے آئے ہیں جو کبھی بھی سیاستِ وقت یا دربار وسرکار سے وابستہ نہ ہوئے بلکہ ہر دور میں اور ہمیشہ صرف اور صرف کتابِ خدا اور میراثِ نبوت کی پاسداری ہی جن کا واحد، والہانہ اور سرفروشانہ شوق وشغف رہا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرتِ امام جعفرِ صادق علیہ السلام کی مدح میں یہ رباعی شاعری نہیں خالص حقیقت نگاری کی ایک مثال ہے:

تہذیبِ الٰہی کا قرینہ بخشا
مِلّت کو معارف کا سَفینہ بخشا
تھا شرح طلب فقہ و شریعت کا باب
اِس باب کو جعفرؑ نے مدینہ بخشا!

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

بخشا چمنِ خَلق کو اِک رنگِ ثبات
تلخی کو گوارہ کیا مانندِ نبات
دُنیا کے ستم سہ کے دیا حق کو فروغ
اعجاز ہے خود آپ کی پاکیزہ حیات

☆☆☆

الطاف و عنایات کا محور بھی رہے
فیضانِ رُبوبیت کا مظہر بھی رہے
برسوں رہے زندانِ ستم میں لیکن
احرارِ حق آگاہ کے سَرورَ بھی رہے

• ساتویں امام حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام تھے۔ نام نامی موسیٰ، کاظم لقب ہے، حدیث و روایات میں آپ کی زیادہ مشہور کنیتیں ابوالحسن اور ابو ابراہیم ہیں۔ کہیں کہیں 'العبد الصالح'' یا صرف 'العالم' کے لقب سے بھی آپ سے روایتوں کا استناد کیا گیا ہے!

آپ کی تاریخ ولادت ۷/صفر ۱۲۸ھ مطابق ۶/نومبر ۷۴۵ء اور تاریخ شہادت، ۲۵/رجب ۱۸۳ھ مطابق ۳۱/اگست ۷۹۹ء ہے۔ اس لحاظ سے آپ کی کل عمرِ ظاہری ۵۴ برس کی قرار پاتی ہے جس میں ۲۵ برس آپ کے عہدِ امامت کے ہیں۔ اور اسی میں ۱۴/برس ہارون الرشید کے زندانِ ستم میں گزرے ہیں۔ اردو کے عظیم المرتبت مرثیہ نگار مرزا دبیرؔ نے ایک مرثیے میں کہا ہے۔

مولا! یہ انتہائے اسیری گزر گئی
زندان میں جوانی و پیری گزر گئی!

لیکن اس کے باوجود آپ نے علم وعرفان وفقہ اسلامی کی جو خدمت انجام دی وہ تاریخِ علومِ اسلامی میں زرّیں حرفوں سے لکھی ہوئی ہے۔

• آپ کی شخصیت میں جمال وجلالِ انبیاء واوصیاء اس قدر پُر فروغ تھا کہ ذاتِ گرامی سراپا سرِطور تھی! اربابِ معرفت نے آپ سے طریقت وحقیقت کی راہیں پائیں۔ دوسری طرف جمہورِ مسلمین میں بھی آپ کی محبوبیت اِس قدر تھی کہ حکومتِ وقت ہر لحظہ آپ کی توہین اور اذیت میں کوشاں رہتی تھی۔ متعدد بار قید وبند کا سبب بھی یہی تھا۔ اور جب زہر دلوا کر آپ کو شہید کر دیا گیا تو آپ کی نعش مبارک کی جو بے حرمتی کی گئی اس کا بھی یہی سبب تھا۔ قُرآنِ عظیم کا فرمان برحق ہے:

﴿سَیَعلَمُ الَّذِینَ ظَلَمُوٓا اَیَّ مُنقَلَبٍ یَنقَلِبُونَ﴾

''ظلم کرنے والے بہت جلد جان لیں گے کہ وہ کس ٹھکانہ پر پہنچنے والے ہیں!''

• آپ کے عہدِ امامت میں حاکمِ جور نے حج کیا اور مدینۂ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی تو اپنے حواشی اور اطرافیوں کے درمیان مفاخرت کی غرض سے قبرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑے ہوکر اس طرح خطاب کیا: **السلام علیک یا رسول اللہ یا ابن عم!** ''سلام ہو آپ پر اے اللہ کے رسول اے میرے چچا کے فرزند!'' اس وقت امام موسیٰ الکاظم علیہ السلام بھی قبرِ رسولؐ کے پاس ہی موجود تھے۔ آپؑ نے قبر کے نزدیک جا کر فرمایا: السلام علیک یا ابہ'' سلام ہو آپ پر اے بابا! حاکم نے سن کر کہا کہ ''اے ابوالحسن حق یہ ہے کہ یہ آپ ہی کا شرف ہے!''

• امام علیہ السلام کے تعلیمات سے اصحابِ علم وار بابِ معرفت کے دفتر بھرے ہوئے ہیں۔ اُن سب کو مدون کرنا اور اس کی ترجمانی کا حق ادا کرنا ایک بڑا

اور نہ جانے کتنے خوفناک مہلکوں میں اس نے مجھے بچایا

اور مجھے نرالی خوشیاں دکھائیں

بس میں شکرگزاری کرتے ہوئے اس کی نیکیاں دہراتا ہوں

اور تسبیح پڑھ کر اس کو یاد کرتا ہوں!

تمام تعریف اس معبود کی

جس کا نہ پردہ چاک ہوتا ہے نہ اس کا دروازہ بند ہوتا ہے

نہ اس کا سوالی پھیرا جاتا ہے

نہ اس سے امید لگانے والا مایوس ہوتا ہے

تمام تعریف اس معبود کی جو ڈرنے والوں کو پناہ دیتا ہے

نیکوکاروں کو نجات دیتا ہے

کمزور بنائے گئے لوگوں کو اٹھاتا ہے

بڑا بننے والوں کو زیر کرتا ہے

بادشاہوں کو ہلاک کرتا ہے اور ان کی جگہ دوسروں کو عطا کرتا ہے

تمام تعریف ہے اس اللہ کی جو جباروں کو توڑنے والا ہے

ظالموں کو ہلاک کرنے والا ہے

بھاگنے والوں کو پکڑنے والا ہے

ظلم کرنے والوں کی سزا ہے

فریاد کرنے والوں کی فریاد ہے

چاہنے والوں کی حاجتوں کا مرکز ہے!

ایمان داروں کا بھروسہ ہے!!

کام ہے جو اصحابِ قول وقلم پر فرض بھی ہے اور قرض بھی۔ ہم یہاں پر ''بابِ توحید'' میں آپؑ کا ایک انتہائی مختصر لیکن معنی ومحتویٰ کے لحاظ سے انتہائی پُر اثر و پرثمر قول نقل کرتے ہیں۔

میدانِ علم وعرفان کے مشہور یکّہ تاز ابن اَبی عُمیر کہتے ہیں کہ میں حضرتِ امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجھے توحید تعلیم فرمایئے!

آپ نے فرمایا ''اے ابو احمد توحید کے بارے میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں بیان فرمایا ہے اُس سے تجاوُز نہ کرو ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے!''

- فرزندانِ سیر وسلوک کے درمیان آپؑ کا ایک ''ذکرِ سجدہ'' بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے: ''عظم الذنب من عبدِکَ فَلْیَحْسُنِ العَفْوُ مِنْ عِنْدِکَ یَا اَهْلَ التَّقْوىٰ یَا اَهْلَ المَغْفِرَةِ!''

حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام

حضرت علی بن موسیٰ علیہ السلام سلسلۂ اہلِ بیتِ عصمت سے ہونے والے آٹھویں امام تھے۔ آپ کا مشہور ترین لقب ''الرضا'' تھا۔

بروایتے آپ کی ولادت ۱۱/ذی القعدہ ۱۵۳ھ (مطابق ۴/نومبر ۷۷۰ء بروز یکشنبہ) اور وفات ۲۳/ذیقعدہ ۲۰۳ھ (مطابق ۲۱/مئی ۸۱۹ء) بروز شنبہ ہوئی اور آپ نے کُل ۴۹/برس اِس دنیا میں زندگی بسر فرمائی۔ جس وقت حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت ہوئی (۲۵/رجب ۱۸۳ھ) آپ کا سن مبارک ۳۰/برس تھا۔ چنانچہ آپ کی امامت کا کل عرصہ تقریباً ۱۹/برسوں کو محیط ہوتا ہے۔

آپ کے عہد امامت کا عظیم ترین واقعہ ''امرِ ولایت'' سے متعلق ہے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سے مسلمانوں میں جس سیاست کی بنیاد پڑ گئی تھی اُس میں اَمرِ خلافت یا ادارۂ حکومت وسلطنت کو اہلبیتِ پیغمبرؐ سے دُور رکھنا سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے لے کر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام تک اور اُن کے بعد سے گیارہویں امام حضرت حسن عسکری علیہ السلام تک، ہر امام کو امرِ خلافت سے دُور رکھنے کے لیے جو جو طریقے اختیار کیے گئے وہ تاریخ کے صفحات پر نہایت دُرشت الفاظ میں تحریر ہیں۔ خود امیر المؤمنین علیہ السلام کو پہلے سقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت سے محروم رکھا گیا۔ پھر استخلاف اور شوریٰ کے طریقوں کو اختیار کر کے آپؑ کا حق ضایع اور پامال کیا گیا، خلیفۂ سوم نے اپنے دَورِ اقتدار میں حضرت علیؑ کو دو مرتبہ مدینۂ منورہ چھوڑ دینے کا حکم صادر کیا۔

حضرت امامِ حسن علیہ السلام کی حیات طیبہ میں اگرچہ قید یا جلاوطنی کا کوئی واقعہ نظر نہیں آتا، لیکن ''باغیِ شام'' کے مکمل تسلّط واقتدار کے بعد آپؑ کی بقیہ زندگی مکمل طور

پر حکومتِ وقت کی نگرانی ہی میں بسر ہوئی۔ امام حسین علیہ السلام کے سوانحِ حیات سے کون باخبر نہیں کہ آپ کو کن حالات میں مدینۃ الرسولؐ سے ہجرت کرنی پڑی اور میدانِ کربلا میں شہادت تک آپ پر کیا کیا قیامتیں گزریں اور شہادتِ عظمیٰ کے بعد بھی آپ کے اہلِ بیت کرام کے ساتھ حکومتِ وقت نے کیا کیا ظلم و ستم روا رکھے۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی حیات طیبہ سے لے کر امام جعفر صادق علیہ السلام تک ہر امام کے ساتھ سیاست کارانِ وقت کی براہِ راست نگرانی، نظر بندی، تفتیش و تفحص، ظالمین کے دارالخلافہ میں بار بار طلبی، توہین اور سخت گیری غرض اِسائتِ ادب کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا تا کہ عوام الناس اِن رہنمایانِ معصوم سے آزادانہ طور پر استفادہ نہ کرسکیں، یہ ائمۂ دین امورِ سیاست میں داخل نہ ہوں اور اقتدار سے دور رہیں۔ اسی سلسلہ میں گزشتہ اوراق میں تذکرہ آچکا ہے کہ امام موسیٰ الکاظم علیہ السلام کی زندگی کے ۱۴ برس قید و بند میں گزرے۔ لیکن یہ ائمۂ اہلبیت علیہم السلام کے معصومانہ کردار، عوام الناس خصوصاً محروم و مقہور طبقوں کے ساتھ اُن کی سچی ہمدردی اور حسنِ سلوک، اُن کے عِلم اور اُن کی خداداد وراثتِ نبوت، ولایت و عصمت کا کرشمہ اور دوسری طرف سیاہ کاران سیاست کے مسلسل ظلم و ستم، سرمایہ پرستی، عیش کوشی، صاحبانِ حقوق کی حق تلفیوں اور فرائض حکومت سے چشم پوشیوں کا قہری نتیجہ تھا کہ ائمہ اہل بیت کے لیے ساری مملکت اسلامی میں عزت و احترام اور محبت و میلان بڑھتا جا رہا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام رضا علیہ السلام کے عہدِ حیات و دورِ امامت میں، حکومتِ وقت مجبور ہوئی کہ آپؑ کے حق کو تسلیم کرے اور آپؑ کو ''ولی عہدِ حکومت'' نامزد کر کے عوام الناس کی خوشنودی حاصل کرے اور پھر زہر دلوا کر اپنے راستے سے ہٹائے۔ چنانچہ سیاست کارانِ وقت نے یہی طریقہ

اختیار کیا۔ اُن کی سیاست کا اہلِ بیت پیغمبر کو حکومت سے علیحدہ رکھنے کا بنیادی فار مولا بھی محفوظ رہا اور بظاہر امام کی ولی عہدی کا اعلان کر کے حکومت نے اپنی پیشانی پر محبت ومودتِ آلِ محمد کا سہرا بھی سجالیا!

• امام رضا علیہ السلام کے بعض علمی ترشحات جو زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ گئے انہیں علامہ صدوق نے ''عیونِ اخبار الرضا'' کے نام سے ایک مجموعے میں جمع فرمایا ہے۔ جس میں آپؑ کے مختلف مناظرات، مواعظ، ملفوظات اور آپؑ کی زبان مبارک سے مروی آپؑ کے جدِّ بزرگوار حضرتِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث وارشادات شامل ہیں۔

• امام رضا علیہ السلام سے منسوب ایک رسالہ بعض مسائلِ طب وصحت کے بارے میں بھی پایا جاتا ہے جو ''الرسالة الذهبیه'' (نامۂ زرّیں) کے نام سے شہرت رکھتا ہے اور بعض اہلِ فن حضرات نے اس کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔

☆☆☆☆☆

حضرت امامِ جوادؑ علیہ السلام

سلسلۂ امامتِ اہلِ بیتؑ کی نویں کڑی حضرت امام رضا علیہ السلام کے فرزند امام محمد تقی علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ جن کا ایک لقب جواد بھی ہے۔

آپ کی ولادت بنا بر مشہور ۱۰/ رجب ۱۹۵ھ (مطابق ۸/ اپریل ۸۱۱ء بروز سہ شنبہ۔ بمقام مدینہ منورہ) اور وفات ۲۹/ ذیقعدہ ۲۲۰ھ (مطابق ۲۴/ نومبر ۸۳۵ء بروز چہار شنبہ) بمقام کاظمین (بغداد) عراق ہوئی۔ اور اِس دارِ فانی میں آپ کی کل مدت زندگانی صرف ۲۵/ برس قرار پائی۔

● آپ کے ذاتی احوال وکوائف میں سیاست مدارِ وقت کی بیٹی سے آپ کا عقد اربابِ تاریخ نے خصوصی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ یہ عقد آپ کے مرتبۂ امامت اور مقامِ علم وعصمت کی ایک بڑی دنیوی آزمائش کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ جس سے آپ بکمالِ متانت کامیابی کے ساتھ گزرے۔

● جو امور براہِ راست شانِ امامت وامرِ ہدایت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں نہایت کم سنی میں کمالِ علم وجلال و جمالِ عصمت کا اظہار خاص طور پر شایانِ ذکر ہے۔ اس سلسلے میں حاکمِ وقت کے دربار میں منعقد ہونے والے مُناظروں کی روداد یں معتبر سندوں کے ساتھ کتب عامہ وخاصہ میں بہ تفصیل پائی جاتی ہیں۔ ان مناظروں میں آپ کے جوابات اور ان کے علاوہ آپ کے اقوال وارشادات کی شرح ابوابِ علم میں اضافوں کا سرچشمہ ہوسکتی ہے۔ تبرکاً اس مقام پر ہم آپ کے چند ارشادات نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

آپ نے فرمایا:

ـــ بعض روایات میں تاریخ ولادت کے ساتھ روز جمعہ کی صراحت بھی پائی جاتی ہے ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے ۸/ اپریل درست نہ ہوگی۔

اَلدِّیۡنُ عِزٌ وَالْعِلْمُ کَنْزٌ وَالصَّمۡتُ نُورٌ

''دین عزت ہے اور علم خزانہ ہے اور ایسی خاموشی جس سے باطل کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے نور ہے۔''(۱)

''مَنْ اسۡتَغۡنیٰ بِاللّٰهِ اِفۡتَقَرَ النَّاسُ اِلَیۡهِ وَمَنۡ اِتَّقَی اللّٰهَ اَحَبَّهُ النَّاسُ''

''جو معبودِ برحق کے سہارے پر غنی ہوگا سب لوگ اس کے محتاج ہوں گے، اور جو تقوائے الٰہی رکھے گا لوگ اس سے محبت رکھیں گے۔''

''عِزُّ الْمُؤۡمِنِ فِیۡ غِنَاهُ عَنِ النَّاسِ''

''مومن کی عزت، عام لوگوں سے اس کی بے نیازی میں ہے۔''

اور حضرتِ امامِ جواد علیہ السلام کا یہ جملہ بھی حرزِ جان بنانے کے قابل ہے کہ آج ساری دنیا میں جو وحشت خیزیاں اور دہشت گردیاں ہیں اس کا راز یہی ہے، آپؑ نے فرمایا:

''مَنْ عَمِلَ عَلیٰ غَیۡرِ عِلۡمٍ، مَا یُفۡسِدُ اَکۡثَرَ مِمَّا یُصۡلِحُ''

''جو علم کے بغیر عمل کرے گا وہ اصلاح کرنے سے زیادہ تباہی مچائے گا۔''

☆☆☆☆☆

(۱) دقیقہ سنج و رقیقہ شناسِ زبانِ تازی امین ناصری (الامیر امین آل ناصر الدین) نے ''دقائق العربیہ'' میں لکھا ہے:

''الصمت و السکوت: ترک التکلم مع القدرۃِ علیہِ... وَ قِیۡلَ اِنَّ السکوتَ اِمساکٌ عَنۡ قَوۡلِ الحَقِّ و الصمتُ اِمساکٌ عَنۡ قَوۡلِ البَاطِلِ'' (ص ۲۵)

حضرت امام ہادی علیہ السلام

دسویں امام حضرت امام علی نقی علیہ السلام تھے۔ جن کا ایک لقب الہادی بھی ہے۔

• آپ کی ولادت اور شہادت کی تاریخیں معتبر مآخذ کے مطابق درج ذیل ہیں:

ولادت: ۵/رجب ۲۱۴ھ مطابق ۷/ستمبر ۸۲۹ء بروز سہ شنبہ

شہادت: ۳/رجب ۲۵۴ھ مطابق ۲۷/جون ۸۶۸ء بروز یکشنبہ بمقام سامراء۔

• آپ کی عمر مبارک تقریباً ۴۰/برس ہوئی اور عہد امامت ظاہری طور پر ۳۴/برسوں پر محیط رہا، یعنی صرف چھ یا سات برس کی عمر میں آپ نے امرِ امامت و بارِ امانت سنبھالا۔

• اپنے والد بزرگوار کی طرح آپؑ کی حیاتِ طیبہ کا بھی سب سے نمایاں وصف نہایت کم سنی میں علم و آگہی کا ظہور تھا۔ جس کے بہت سے واقعات تذکروں اور تاریخوں میں درج ہیں۔

• آپ کے عہدِ امامت میں عملاً غیر حکومتی سطح پر محروم اور مقہور عوام کی خبر گیری اور ان کی رفاہ کا کام بہت منظم ہوا۔

• آپ نے مختلف شہروں میں اپنے ''وکیل'' معین فرمائے جو آپ کی طرف سے ''امورِ حسبیہ'' کو انجام دیتے، زکاۃ و خمس و صدقات جمع کر کے امام تک پہنچاتے یا امام کے فرمان کے بموجب ان اموال کو دین و ملت کے کاموں میں خرچ کرتے۔

• آپ سے منقول دین و حکمت کا ادب بہت وافر اور وقیع ہے خصوصاً آپ سے مروی ''زیارت جامعہ'' عرفانِ امرِ امامت کا ایک مکمل نصاب ہے!

حضرت امامِ حسن عسکری علیہ السلام

گیارہویں امام حضرت حسن بن علی العسکری تھے۔

آپ کے اسمِ گرامی کی دوسرے امام جناب سبطِ اکبر حضرت حسن بن علی علیہما السلام کے نامِ نامی سے مطابقت کی وجہ سے آپؑ کے فرزند حضرت امام مہدیِ منتظر علیہ السلام کے بارے میں وارِد احادیث کی تطبیق میں علمائے اسلام میں سے ایک گروہ کو خاصا اشتباہ لاحق ہوا جس کی وضاحت آئندہ صفحات میں آئے گی۔

گیارہویں امام کی ولادت مشہور تذکرہ نگاروں کے مطابق: ۱۰ر ربیع الثانی ۲۳۲ھ مطابق ۴ر دسمبر ۸۴۶ء بروز شنبہ بمقام مدینہ منورہ، اور وفات، ۸ر ربیع الاول ۲۶۰ھ مطابق ار جنوری بروز جمعہ ۸۷۴ء بمقام سامراء ہوئی۔ یعنی آپؑ کی کل عمر مبارک صرف ۲۸ر برس ہوئی اور مدّتِ امامتِ ظاہری کل ۶ر برس رہی۔ لیکن اصولِ کافی کی ایک روایت سے جسے شیخ مفید نے ارشاد میں بھی نقل فرمایا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کے والد ماجد نے جب آپ کی عمر چار ماہ کی تھی تبھی آپ کے حق میں وصیت فرمادی تھی اور اپنے اصحاب سے آپ کی امامت کا تذکرہ فرمادیا تھا۔

- کم سنی میں علم و اعجاز، عبادت و عصمت اور حکمت و ہدایت کے مظاہر ائمہ دین کے مشترک خصوصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ سے متعلق روایات میں بھی ایسے متعدد واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔
- آپ سے مروی احکام و آدابِ اسلامی علمی مآخذ میں جابجا بکھرے ہوے ہیں جنہیں یکجا کرنے اور ان کی تشریح و تفسیر کرنے کی ضرورت باقی ہے۔

- آپ کی عملی سیرت میں محروم اور ستم رسیدہ عوام الناس کے لیے رفاہی امور کی تدبیر و تنظیم بہت اہمیت رکھتی ہے۔ آپؑ نے محروم طبقوں کے لیے فلاحی کاموں کے طریق کار کو اپنے آبائے کرام خصوصاً اپنے والد بزرگوار کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مزید استحکام بخشا۔ مختلف شہروں میں اپنے نمائندے مقرر فرمائے۔ انہیں اخذ و صرفِ اموال کی ہدایتیں دیں اور آئندہ کا لائحۂ عمل بھی عطا فرمایا۔

- آپؑ نے اپنے فرزند اور اپنے بعد ہونے والے امام، حضرت مہدیِ منتظر علیہ السلام کے کوائف، اُن کی غیبت اور زمانۂ غیبت میں امورِ دین کے نظم و نسق سے متعلق بھی اپنے اصحاب کو باخبر فرمایا۔ اس سلسلے کی ایک روایت جس کے باعتبار سند معتبر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے یہاں درج کی جارہی ہے:

علامہ مجلسی نے بحار الانوار (ج ا ص ۱۶۰) میں نقل فرمایا ہے:

[الطالقانی، عن ابی علی بن الھمام قال: سمعت محمد بن عثمان العمری قدس اللہ روحہ یقول: سمعت ابی یقول: سئل ابو محمد الحسن بن علی علیہ السلام وأنا عندہ عند الخبر الذی روی عن آبائہ علیہم علیہم السلام أن الارض لاتخلو من حجۃ الاسلام خلقہ اِلی یوم القیامۃ وأن من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃ جاھلیۃ. فقال علیہ السلام: اِنّ ھذا حق کما اَنّ النھارَ حقّ. فقیل لہ: یابن رسول اللہِ فمن الحجۃ و الامام بعدک؟ فقال ابنی محمد وھو الامام و الحجۃُ بعدي مَن مَاتَ ولم یعرِفُہُ ماتَ میتۃً جاھلیۃ. أما اِنّ لہ غیبۃ یحار فیھا الجاھلون و یھلک فیھا المبطلون ویکون فیھا الوقاتون ثم یخرج فکانّی انظر الیٰ الاَعلام البیض تخفق فوق رأسہ بنجف الکوفۃ]

خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ امام حسن عسکری علیہ السلام سے اُن کے آبائے معصومین علیہم السلام کی اس حدیث کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ زمین حجتِ خدا سے کبھی خالی نہیں رہ سکتی اور یہ کہ جو اپنے امام زمانہ کی معرفت حاصل کیے بغیر

مرجائے وہ جاہلیت یا کفر کی موت مرتا ہے۔تو آپ نے فرمایا: یہ حدیث روزِ روشن کی طرح برحق ہے! آپؑ سے پوچھا گیا کہ پھر آپؑ کے بعد حجت و امام کون ہے؟ آپؑ نے فرمایا میرا بیٹا محمد وہی میرے بعد امام اور حجت ہے۔ جو اس کی معرفت حاصل کیے بغیر مرجائے وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ ہاں! اس کے لیے غیبت ہے! جس میں جاہل مبتلائے حیرت رہیں گے، باطل پرست ہلاک ہوں گے، اس کے ظہور کا وقت معین کرنے والے جھوٹے ہوں گے۔ پھر وہ ظاہر ہوگا۔ جیسے میں نجفِ کوفہ میں اس کے سر پر سفید پرچموں کو دیکھ رہا ہوں۔

اپنے بعد ہونے والے امام، اس دنیا میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی آخری حجت اور حضرتِ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری وصی و خلیفہ حضرت امامِ مہدیِ منتظر علیہ السلام کی غیبت کے زمانے میں امتِ مسلمہ کا عملی وظیفہ بیان کرتے ہوئے امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا:

"فَاَمَّا مَنْ كَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ صَائِناً لِنَفْسِهِ ، حَافِظاً لِدِيْنِهِ ، مُخَالِفاً عَلٰى هَوَاهُ، مُطِيْعاً لِاَمْرِ مَوْلَاهُ فَلِلْعَوَامِ اَنْ يُقَلِّدُوْهُ" (وسائل، باب ۱۰ احدیث ۲۰/۳۳۳۸۵)

اور فقہا میں سے جو اپنے نفس کو بچانے والا، اپنے دین کی حفاظت کرنے والا، اپنی ہوا و ہوس کی مخالفت کرنے والا اور اپنے رب کی اطاعت کرنے والا ہو تو عوام کے لیے اُس کی تقلید جائز ہے"۔

یہیں سے نظامِ اجتہاد و تفقہ کی بنیاد استوار ہوئی اور عام افرادِ امت کے لیے جہالت کی تاریکیوں میں اپنی قوتِ عمل کو برباد کرنے کی بجائے "علمائے دین" یا فقہائے مجتہدین کی تقلید کا سلسلہ شروع ہوا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي

مِنْ خَشْيَتِهِ تَرْعَدُ السَّماءُ وَ سُكّانُها

وَتَرْجُفُ الْاَرْضُ وَعُمَّارُها

وَتَمُوْجُ الْبِحارُ وَمَنْ يَسْبَحُ فِي غَمَراتِها

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدانا لِهٰذا

وَما كُنّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلا اَنْ هَدانا اللّٰهُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي

يَخْلُقُ وَلَمْ يُخْلَقْ

وَيَرْزُقُ وَلايُرْزَقُ

وَيُطْعِمُ وَلايُطْعَمُ

وَيُمِيْتُ الْأَحْياءَ وَيُحْيِي الْمَوْتىٰ

وَهُوَ حَيٌّ لايَمُوْتُ

بِيَدِهِ الْخَيْرُ

وَهُوَ عَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ وَ اَمِيْنِكَ وَ صَفِيِّكَ وَ حَبِيْبِكَ وَخِيَرَتِكَ مِنْ خَلْقِكَ وَحافِظِ سِرِّكَ وَمُبَلِّغِ رِسالاتِكَ

اَفْضَلَ وَاَحْسَنَ وَاَجْمَلَ وَاَكْمَلَ

وَاَزْكىٰ وَ اَنْمىٰ

اَطْيَبَ وَاَطْهَرَ وَاَسْنىٰ

حضرت امام مہدی علیہ السلام

...والخلف الهادی المهدی...

حضرات ائمہ اثنا عشر علیہم السلام میں پہلے امام حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اور آخری امام حضرت مہدیِ منتظر علیہ السلام ہیں۔ جنہیں دعائے افتتاح کے اس فقرے میں ''والخلف الهادی المهدی'' کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔

باب امامت وخلافت میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی متعدد روایتوں میں عدد اثنا عشر (بارہ) کے حصر کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ اُن میں کے پہلے علیؑ اور آخری مہدی ہوں گے! اس مضمون کی ایک روایت صاحبِ فرائد السمطین نے اِن الفاظ میں نقل کی ہے: ۳۲۰

عن عبد الله بن عباس قال قال رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم انا سید المرسلین و علی بن ابی طالب سید الوصیین و ان اوصیائی بعدی اثنا عشر اولهم علی ابن ابی طالب و آخرهم القائم المهدی''

(فرائد السمطین ج ۲ باب ۶۱ ص ۳۱۳)

''حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں رسولوں کا سردار ہوں اور علی بن ابی طالب وَصِیّوں کے سردار ہیں اور میرے بعد میرے بارہ وصی ہیں جن کے پہلے علی بن ابی طالب اور آخری قائم

مہدی ہیں!"

حضرت امام مہدی علیہ السلام کی ولادت پر تاریخ کی شہادت موجود ہے۔اور آپ کی غیبت پر زمانہ چشمِ حیرت بناہُوا ہے۔آپؑ کی ولادت کی تاریخ ۱۵/ شعبان المعظم ۲۵۵ھ (مطابق ۲۸/جولائی ۸۶۹ء) بتائی جاتی ہے بعض روایتوں میں یہ تاریخ ۱۵/شعبان ۲۵۶ھ ذکر کی گئی ہے۔اور لفظ نور کے اعداد کو اس سے تطبیق دی گئی ہے۔

گزشتہ صفحات میں آپ کے والدِ بزرگوار حضرتِ امام حسن عسکری علیہ السلام کے تذکرے میں اِس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بارہویں امام حضرت مہدیِ منتظر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے بارے میں منقول احادیثِ نبویہؐ کی تطبیق یا تشریح و توضیح میں علمائے اسلام کے ایک گروہ کو خاصا اشتباہ صرف آپ کے والد کے اسم گرامی "حسن بن علی" ہونے کی بنا پر ہوا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یوں تو آپ کی ذات مبارک پر یقین بلاریب ضروریاتِ دین میں سے ہے۔اور یہ عقیدہ تمام ملتِ اسلامیہ کا مشترکہ اور قطعاً غیر مختلف فیہ عقیدہ ہے کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل مبارک سے ایک "امام" آخری زمانہ میں یعنی قُربِ قیامت قیام فرمائیں گے، جو ظلم و جور سے پُر اس دنیا کو عدل وانصاف کی دنیا سے بدل دیں گے۔اور بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں یہ "ایقان" ایک عظیم اعتقادی اور ایمانی

قوت ہے۔ پھر بھی علمائے اسلام کے درمیان اِن احادیث کی تطبیق میں دو اہم نقاط پر اختلاف واقع ہوا ہے۔

ایک اس امر میں کہ یہ حضرت امام مہدی سبط اکبر حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام (حسن بن علی بن ابی طالب) کی ذریت سے ہوں گے یا سبطِ اصغر حضرت امام حسین علیہ السلام کی نسل مبارک سے۔

دوسرے اس امر میں کہ آیا آپؑ متولد ہو چکے ہیں حکمِ خدا سے نظروں سے غائب ہیں اور باذنِ خدا قربِ قیامت قیام فرمائیں گے یا آپ قربِ قیامت ہی متولد ہوں گے؟

ان دونوں امور پر بالاستیعاب اور بہت تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے تو بجائے خود ایک مُستقل تالیف وجود میں آجائے گی۔ لیکن اصحابِ فکر ونظر کے لیے حسبِ ذیل مختصر سی بحث ہی انشا اللہ درکِ حقیقت اور واقعیت تک رسائی کے لیے کافی ہوگی۔

پہلا امر کہ حضرت قائم آلِ محمدؑ یعنی امام مہدی منتظرؑ حضرت امام حسنؑ کی ذُرِّیت سے ہوں گے یا حضرت امام حسینؑ کی؟ اِس بنا پر کوئی ما بہ النزاع امر نہیں رہ جاتا کہ حضرت بنی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ سلم سے مروی صحیح روایات میں پوری صراحت موجود ہے کہ آپؑ امام حسین علیہ السلام ہی کی نسل مبارک سے ہوں گے۔ البتہ آپ کے والدِ بزرگوار کا نامِ نامی ''حسن بن علی'' ہوگا، یعنی محض تھوڑے سے غور و

تامل اور تفحص کے بعد یہ حقیقت مُنکشف ہو سکتی ہے اور اس اشتباہ یا نزاع کو مکمل طور پر برطرف کیا جا سکتا ہے کہ بعض علما کے حضرت ''ابوالقاسم محمد (المہدی) بن حسن بن علی بن محمد تقی ...... بن حسین بن علی بن ابی طالب'' کو ''ابوالقاسم محمد (المہدی) بن حسن بن علی بن ابی طالب'' سمجھ لینے کے نتیجہ میں یہ اشتباہ ہوا ہے۔

اس باب میں وارد روایات کو بہت سے علمائے اعلام نے جمع فرمایا ہے۔ لیکن اس سلسلۂ تالیفات میں ''القول المختصر فی علامات المہدی المنتظر'' مؤلفہ ''ابی العباس احمد بن محمد بن حجر المکی الہیتمی'' اور کتاب ''البیان فی اخبار صاحب الزمان'' مولفہ امام الحافظ ابی عبداللہ محمد بن یوسف القرشی الگنجی الشافعی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

دوسرے اَمر میں بھی ___ کہ آنجناب متولد ہو چکے ہیں یا قربِ قیامت متولد ہوں گے ___ محض بعض اہم روایات کو نظر انداز کر دینے یا بعض الفاظ کی تفہیم میں کوتاہی واقع ہو جانے کی بنا پر اختلاف ونزاع کی صورت بن گئی ہے۔ اس لیے کہ صریح احادیث مبارکہ میں ''وقوعِ غیبت'' کی صریح پیشین گوئی موجود ہے۔ اور ''طولِ غیبت'' کی کیفیت بھی بیان کی گئی ہے۔ منجملہ ان روایات کے وہ بھی ہے جسے ہم ائمہ مسلمین کی بارہ کی تعداد اور ان کے ناموں کی تعین کے سلسلے میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے گزشتہ فصل میں نقل کر چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ذاک الذي يغيبُ عَنْ اولیَائِہ غیبة لَا یثبت علی القولِ بامَامته الا من امتحن اللهُ قلبَهُ للایمانِ''

''یہ وہی ہیں جو اپنے چاہنے والوں سے غائب ہو جائیں گے اور جس کے دل کو خدا نے ایمان کے لیے آزمایا ہو گا صرف وہی اس غیبت میں ان کی امامت کے قول پر ثابت قدم رہے گا۔''

اس امر کے تصفیہ کے لیے یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جن حدیثوں میں صراحۃً غیبت کی پیشین گوئی نہیں پائی جاتی اُن میں بھی ''حتّیٰ یملکَ'' __ ''حتّیٰ یبعثَ اللّٰہ'' __ حتی یخرجَ __ کے الفاظ ہی مکرر آئے ہیں جو سب کے سب ظہور و قیام پر دلالت کرتے ہیں نہ کہ ولادت پر۔

اب چونکہ بارہویں امام حضرت ولیِ عصر علیہ السلام پر ایک مستقل فقرے میں بھی صلوٰۃ وسلام وارد ہوا ہے اس لیے آپؑ سے متعلق بعض نکات اس فقرے کے ذیل میں بھی ذکر کیے جائیں گے۔

☆☆☆

گزشتہ سطور وصفحات میں حضراتِ ائمہؑ اہلبیت علیہم السلام کے بارے میں محض تبرکاً وتیمناً چند نکات تحریر کر دیے گئے ہیں۔ وقت اور کتاب کی محدودیّت کے تقاضے کچھ ایسے ہی تھے۔ کسی ایک معصوم کے بارے میں بھی کوئی سیر حاصل بحث ممکن نہ ہو سکی۔ جس کے لیے اظہارِ ندامت، اعترافِ قصور اور طلبِ عفو کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

یہی ائمہؑ اثنا عشر، اللہ کے بندوں پر اس کی حجت اور اس کے احکام واسرار

کے امانت دار ہیں۔اس موضوع پر آیات واحادیث کی روشنی میں گفتگو کی جائے تو یہ ظرفِ زندگی ناکافی ہوگا۔

ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام کی معصومانہ، ربّانی اور پیمبرانہ زندگیوں کی ایک ایک بات، ایک ایک جزئیات ہمارے لیے قابلِ غوراور سرچشمۂ ہدایت ونور ہے۔

اُتنا ہی سعادت مند ہے وہ جو اُن کے ارشادات اور واقعاتِ سیرت سے جتنا زیادہ مستفید ہو سکے!

ہاں! اس مقام پر جب کہ رسولِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلبیت سے ہونے والے حضراتِ ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کا یہ مختصر تذکرہ ایک لحاظ سے اختتام تک پہنچ رہا ہے۔ اِس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ نبی خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فوراً بعد ایک طرف پیغام وآثارِ نبوت کو مٹانے یا بدل ڈالنے کا شیطانی اور طاغوتی مکرو منصوبہ پورے زور وشور کے ساتھ شروع ہوا تو دوسری طرف اِن حضرات اَئمہ اثنا عشر کی شکل میں ایک کے بعد ایک محافظینِ کتاب وسنت اور بہ اصطلاحِ قرآنی ''علمائے قائمین بالقسط'' یعنی معارفِ توحید ومعالمِ نبوت ومقامِ ختمِ نبوت اور دین وشریعت کے معصوم امانت داروں کا سلسلہ قائم رہا۔ ۱۱ہجری سے لے کر ۲۶۰ھ تک اِن بارہ اماموں نے ہر طرح کی قُربانیاں دے کر دین وشریعت کے خلاف اٹھنے والے ہر ہر فتنے کو کچل ڈالا۔ اَب کتاب اور دین و شریعت محفوظ ہے۔ اِسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لیے ظاہری طور پر امامت کا

سلسلہ ختم ہوگیا۔لیکن ابھی اُس کے عالم گیر نفاذ کا کام باقی ہے اسی لیے ایک امام بھی پردۂ غیب میں ''مہدی منتظر'' کی شکل میں باقی ہے۔جس کا فیض وجود بادلوں کی اوٹ میں چُھپے ہوے سورج کی ضیا پاشیوں اور فیض رسانیوں کی طرح جاری وساری ہے اور جس کا ظہور وقیام اِعلائے کلمہ اور دینِ کے ظہورِ اکمل واتم کا باعث ہوگا۔

﴿وَ اللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ﴾

''اور اللہ اپنے نور کو ''پورا پھیلا کر رہے گا''

خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو!''

(سورۂ صف ٦١، آیت ٨)

ہماری زبان میں چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں سیرت و سوانحِ معصومین علیہم السلام کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔جن میں واقعات اور حوالوں کی جامعیت اور کثرت کے باوجود ایجاز واختصار کے لحاظ سے مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ کراروی مرحوم کی کتاب چودہ ستارے عمومی فائدے کے لحاظ سے بجا طور پر شہرت اور مقبولیت رکھتی ہے۔لیکن حق وانصاف کی بات یہ ہے کہ رہنمایانِ الٰہی کی لامتناہی زندگیوں کے احوال وآثار کو سمیٹنے کے لیے اور ساتھ ہی ساتھ نگاہِ تحقیق کی خیرگیوں کو دور کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے بلکہ اس باب میں مسلسل لکھا جانا حیات ونجات کی ناگزیر ضرورت ہے!

(۲۵)

عدلِ مُنتظَر

اَللّٰھُمَّ وَ صَلِّ عَلٰی وَلِیِّ اَمْرِکَ الْقَائِمِ الْمُؤَمَّلِ وَ الْعَدْلِ الْمُنْتَظِرِ وَ حُفَّہٗ بِمَلَائِکَتِکَ الْمُقَرَّبِیْنَ وَ اَیِّدْہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ۔

''اے معبود! رحمت فرما اپنے ''ذمہ دارِ نظام'' پر (جو اس وقت اپنے منصب پر) قائم (کارفرما، حاجت روا) اور امید گاہِ خلائق ہیں! وہی عادلِ زمانہ جن کا انتظار ہو رہا ہے!! اور انہیں مقرب فرشتوں کی جھرمٹ میں رکھ اور ''روح القدس'' کے ذریعہ ان کی تائید فرما! اے تمام جہانوں کے پروردگار! اے معبود!''

اِس فقرے کو بیت الغزل سمجھنا چاہیے۔ حقیقۃً یہی خلاصۂ دعا اور حرفِ مدعا ہے۔ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپؐ کے اہلبیت سے ہونے والے ائمۂ دین پر فرداً فرداً صلوٰت وسلام کا سلسلہ اَب اُس ذات تک پہنچا ہے جسے استعارۂ قرآنی میں ''بقیۃ اللہ الاعظم'' اور احادیث نبویہ کی صراحت کے بموجب ''مہدیِ منتظر'' کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آج اس پندرھویں صدی ہجری یا اکیسویں صدی عیسوی میں، جبکہ مقامِ ختم نبوت کے ظہور کو پندرہ صدیاں گزر چکی ہیں، اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلبیت سے ہونے والے بارہ اماموں میں سے گیارہ کا زمانہ بھی گزر چکا ہے، اس لحاظ سے کہ گیارہ امام ظاہری طور پر اس دنیا میں حقیقتِ توحید اور ختمِ نبوت پر اپنی اپنی شہادتیں قائم کر کے وفات پا چکے ہیں، ورنہ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ اِن میں سے ہر ایک بالکل یکساں حیثیت سے اِس امت کے امام ہیں اور حجت ہیں! اُن کے گزر جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جیسے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے پر گزشتہ تمام انبیاء کی شریعتیں منسوخ ہو گئیں، اُسی طرح اِن اماموں کے احکامات منسوخ ہو گئے، تاہم یہ تو ہے ہی

کہ ظاہری طور پر یہ اپنا اپنا عہد پورا کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بہر حال اب آج کے اُمتی کے لیے مرکزِ امید، رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری فرزندِ معصوم یعنی بنت رسولؐ حضرت زہرائے مَرضِیہ سلام اللہ علیہا کی خنکیِ چشم ___ جُملہ انبیاء و ائمہ کے آخری وارث ___ الخلف الہادی المہدی ___ الخلف الصالح ___ مہدیِ موعود و مہدِ برحق ___ امام منتظر ___ بقیۃ اللہ الاعظم ___ حضرت ابولقاسم م ح م د بن الحسن ___ ابن الحسین ___ ابن علی بن ابی طالب ___ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف ہی کی ذاتِ گرامی ہے! اور اس فقرے میں انہیں کی ذاتِ بابرکات پر افاضۂ رحمت کی درخواست ہے۔

اس فقرے کی شرح یا حضرت مہدیِ منتظر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے تعلق سے کچھ بھی عرض کرنے سے پہلے یہ صراحت پھر ضروری معلوم ہوتی ہے کہ حقیقۃً آپ کی ذات مبارک پر یقین بلا ریب ضروریاتِ دین میں سے ہے اور یہ عقیدہ تمام ملتِ اسلامیہ کا مشترک اور قطعاً غیر مختلف فیہ عقیدہ ہے اور ایک عظیم اعتقادی اور ایمانی قوت ہے، جسے اَب ادھر بعض سیاسی اور مادّی اغراض کے تحت کچھ لوگ اختلافی بنا رہے ہیں اور اسے صرف ایک مسلک سے وابستہ لوگوں کا عقیدہ قرار دے رہے ہیں۔

آپؑ کی ذات وہ مرکزِ امید، موعودِ مشیّت اور امانت دارِ عدلِ الٰہی ہے جس کے متعلق قرآنِ مجید میں بھی متعدد مقامات پر واضح اشارات پائے جاتے ہیں۔ اَحادیثِ صحیحہ اور روایاتِ معتبرہ میں بھی صَریح پیشین گوئیاں موجود ہیں اور تاریخ بھی اپنے مشاہدہ کی بنا پر اس وجودِ مقدس کی تصدیق پر مجبور ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلی مباحث اور دلائل، اِس عاجز و قاصر نے ''الباب الثانی عشر'' کے عنوان سے

تمام حمد ہے اس معبود کی

جس کی ہیبت سے آسمان اور آسمانوں میں بسنے والے کانپتے ہیں

زمین اور اس پر زندگی بسر کرنے والے لرزتے ہیں

سمندروں اور اس کی گہرائیوں میں پیرنے والے لرزہ بجاں ہیں

تمام تعریفیں اسی معبود کی ہیں جس نے ہماری اِس تک رہنمائی فرمائی

جبکہ اگر معبود برحق رہنمائی نہ فرماتا تو ہم ہدایت پانے والے نہ تھے

حمد ہے اس معبود کی!

جو پیدا کرتا ہے خود پیدا نہیں کیا گیا!

جو رزق دیتا ہے اسے رزق نہیں دیا جاتا

جو کھلاتا ہے کھاتا نہیں،

جو زندوں کو مارتا ہے، اور مردوں کو جلاتا ہے

اور وہ خود ایسا زندہ ہے جسے موت نہیں،

اسی کے ہاتھ میں نیکی ہے

اور وہی ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے

اے معبود! رحمت فرما اپنے بندۂ خاص، اپنے پیمبر، اپنے امانت دار، اپنے برگزیدہ، اپنے چہیتے، اپنی تمام خلقت میں سب سے بہتر، اپنے رازدار اور اپنے پیغامات کے پہنچانے والے محمدؐ پر

سب سے بہتر، سب سے برتر، سب سے حسین، سب سے کامل

سب سے زیادہ نفیس، سب سے زیادہ پر فروغ،

سب سے زیادہ پر نکہت، سب سے زیادہ پاکیزہ اور سب سے بلند رحمت!

علیٰحدہ کتابی صورت میں تحریر کیے ہیں۔ اس مقام پر صرف چند آیات و روایات کے تذکرے پر اکتفا مناسب معلوم ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید میں حضرت مہدیِ آخر الزماں یا قائم آل محمد علیہ وعلیہم الصلاۃ والسلام کے وجودِ مبارک، غیبت، طولِ عمر، ظہور اور قیامِ سلطنت وغیرہ مباحث پر کہیں تشبیہ و تمثیل و تنظیر کے پیرایہ میں اور کہیں استعاراتی اسلوب میں جو قرآنِ مجید کے مخصوص اسالیب ہیں، کافی ووافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض علماء نے اِس موضوع پر مستقل رسالے تالیف فرمائے ہیں۔ مثلاً حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید صادق الحسینی الشیرازی کا مشہور رسالہ ہے ''المہدی فی القرآن'' اسی طرح اور بھی متعدد تالیفات ہیں جن کے نام کتبِ فہارس میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

اس باب میں تمام تفسیری روایات اور ''تاویلاتِ ماثورہ'' پر نظر ڈالنے کے بعد راقم کا معروضہ یہ ہے کہ اس موضوع سے متعلق جتنی آیتوں کی نشاندھی روایتوں میں پائی جاتی ہے ان کو تین قسموں میں منقسم کرسکتے ہیں۔

۱۔ وہ آیتیں جو براہِ راست اِس موضوع پر روشنی ڈالتی ہیں۔

۲۔ وہ آیتیں جو بطورِ التزام یا تضمّن اس موضوع پر روشنی ڈالتی ہیں۔

۳۔ وہ آیتیں جو کسی نہ کسی جہت سے واقعاتی ربط و مناسبت رکھتی ہیں۔

مثلاً :

(۱) سورۂ مبارکۂ زخرف (۴۳ ویں سورہ) کی اکسٹھویں آیت اپنے مضمون کے لحاظ سے براہِ راست اِس موضوع پر روشنی ڈالتی :

﴿وَ اِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾

''اور وہ یقیناً قیامت کی نشانی ہیں، تم ان میں ہرگز شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہی صراطِ مستقیم ہے۔''

سورے میں اس آیت سے قبل حضرت عیسیٰؑ کا تذکرہ ہے۔ اس لیے اس آیت میں بھی ''قیامت کی نشانی'' اُنہیں کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ صحیح بخاری کی یہ حدیث شریف بھی سامنے رکھنی چاہیے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے:

''وَ كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ فِيْكُمْ وَ اِمَامُكُمْ مِنْكُمْ''

''اور تمہارا حال کیا ہوگا جب تمہارے درمیان عیسیٰؑ بن مریم نازل ہوں گے اور تمہارا امام تمہیں میں سے ہوگا!''

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل تو ہوں گے۔ مگر ''اَمرِ اِمامت'' حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ''اُمّتی'' کے ہاتھوں میں ہوگا۔ اور دوسری ''صدہا'' صحیح السند احادیث کی روشنی میں یہ بھی ثابت ہے کہ وہ ''امّتی'' کوئی عامی نہیں بلکہ عترت و ذرّیتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے ہوگا۔ مثلاً علامہ ابنِ حجر مکّی صواعق محرقہ (ص ۹۶) میں اسی آیت کریمہ ﴿وَ اِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ﴾ کے بارے میں مقاتل بن سلیمان وغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت مہدیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یا فرائد السمطین (ص ۴۴۷) میں شیخ ابو اسحاق ابراہیم بن یعقوب کی سند سے حضرت جابر بن عبد اللہ انصاریؓ سے یہ ارشاد پیغمبرؐ نقل ہوا ہے:

”مَنْ اَنْکَرَ خُرُوْجَ الْمَھْدِي فَقَدْ کَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی محمد وَ مَنْ اَنْکَرَ نُزُوْلَ عِیسیٰ فَقَدْ کَفَرَ“

”جو مہدی کے خروج کا انکار کرے وہ منکر، کافر ہے اس بات کا جو محمدؐ پر نازل ہوئی، اور جو نزولِ عیسیٰؑ کا انکار کرے وہ بھی کافر ہے۔“

اس کے علاوہ ان الفاظ میں وارد ارشادِ نبویؐ کے سلاسل وطُرُقِ روایت کا احصا کرنے کے لیے تو ایک دفتر درکار ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

”لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یَمْلِکَ رَجُلٌ مِنْ اَھْلِ بَیْتِي“

”اس وقت تک قیامت برپا نہیں ہوگی جب تک کہ میرے اہلِ بیت میں سے ایک مرد سلطنت قائم نہ کرلے گا۔“

”لَوْ لَمْ یَبْقَ مِنَ الدُّنیا اِلَّا یَوْمٌ لَبَعَثَ اللّٰہُ تعالیٰ رَجُلٌ مِنْ اَھْلِ بَیْتِي“

”اگر اس دنیا کی مدت میں کچھ بھی باقی نہ رہے سوائے ایک روز کے تب بھی یقیناً اللہ تعالیٰ میرے اہلِ بیت میں سے ایک فرد کو ضرور مبعوث فرمائے گا۔“

(۲) سورۂ مبارکہ قصص (۲۸ویں سورے) کی پانچویں آیت بھی اس موضوع پر خوب روشنی ڈالتی ہے۔ تاویلی جہت سے تو یہ آیت براہِ راست اسی موضوع سے متعلق ہے ہی۔ اگر ”تاویلِ ماثور“ __ یعنی امام معصوم سے مروی تفسیر وتاویل موجود نہ ہو تب بھی التزامی طور پر یہ آیت ”قیامِ قائم آلِ محمدؐ“ کے عقیدے کی ہر لحاظ سے تائید کرتی ہے۔

﴿وَنُرِیْدُ اَنْ نَمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوا فِی الْاَرْضِ وَنَجْعَلَھُمْ اَئِمَّۃً وَ نَجْعَلَھُمُ الْوَارِثِیْنَ﴾

''اور ہم ارادہ رکھتے ہیں کہ جولوگ روے زمین پر کمزور بنادیے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور انہیں کو امام بنائیں اور انہیں کو (اس زمین کا) وارث قرار دیں''۔

اہلِ فقہ وفہم کے لیے تو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ یہاں کمالِ صراحت وحسن بیان بھی قابلِ توجہ ہے، بہ شہادتِ کربلا، حضرات آلِ محمد علیہم السلام سے زیادہ اس روے زمین پر کسے کمزور بنایا گیا اور کس کی حق تلفی ہوئی۔ چنانچہ جب ارادۂ الٰہیہ یہی ہے کہ جنہیں روے زمین پر کمزور بنایا گیا ہو اُنہیں کو امامت یا امارت اور زمین کی وراثت عطا فرمائی جائے تو پھر اس ارداہ کا اپنے نمایاں ترین اور قطعاً غیر مشتبہ مصداق کے شامل حال ہونا کیا لازمی نہ ہوگا؟ جو کہ حضرات آل محمد علیہم السلام کی ذوات مقدسہ ہیں۔ اور جن کی حق تلفیوں کا مداوا حضرتِ قائم آلِ محمد کی سلطنت کے قیام کے علاوہ کسی اور صورت سے متصور نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ ائمہ دین علیہم السلام سے مأثور تفسیر میں اس آیت کو حضرتِ ''مہدیِ منتظر'' عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف ہی سے متعلق قرار دیا گیا ہے۔

(۳) سورۂ مبارکہ ق کی یہ آیت کریمہ: ﴿بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ حضرت ''مہدیِ منتظر'' علیہ السلام کے ظہور سے واقعاتی مناسبت رکھتی ہے۔ روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جب آپؑ کا ظہور ہوگا تو آپ لوگوں کے سامنے خطاب کرتے ہوے اس آیت کی تلاوت فرمائیں گے۔ اس ''شانِ تلاوت'' میں ''بقیۃ اللہ'' کے قرآنی الفاظ میں پائے جانے والے مفہوم کا روشن ترین مصداق آپؑ کی ذاتِ گرامی قرار پائے گی!

☆☆☆

دُعائے افتتاح کے زیرِ غور فقرے میں ایک ایک لفظ ابوابِ معرفت کی کلید ہے۔

ولی امرِ ک، القائم المؤمّل، العدل المنتظر، یہ تمام القابِ امام مہدیِ آخرالزمان علیہ السلام کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔اور ساتھ ہی بہت سے اسرارِ مشیت سے بھی پردے اٹھاتے ہیں۔

"ولیِ امرِکَ" کا فقرہ کس قدر معنی خیز اور اسرار کشا ہے اس کا کچھ اندازہ اس کی ترکیب پر غور کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے۔یعنی غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس میں اُمر کی اضافت مؤمنین، مسلمین یا انسانوں کی طرف نہیں ہے، یعنی ولیِ امرِ مؤمنین یا ولیِ اُمرِ مسلمین یا ولیِ امرِ عالمین نہیں کہا جارہا ہے، "ولیِ امرِک" یعنی "ولیِ امرِ خدا" _ ذمہ دارِ کارِ بشر نہیں ذمہ دارِ کارِ خدا!! اللہ اکبر!

یہ فقرہ قرآنِ مجید کی آیت ﴿وَاُولِی الاَمْرِمِنْکُمْ﴾ کی وضاحت بھی کردیتا ہے۔کہ وہاں بھی اُولی امرِ کُمْ نہیں "اُولِي الاَمْرِ مِنكُمْ" ہے۔تم میں سے جو "اس خاص امر کے حامل ہیں" نہ کہ جنہیں تم اپنا امر سپرد کردو ___ یہ امرِ الٰہی ہے امانتِ الٰہی ہے، خلافتِ ناس نہیں خلافتِ الٰہیہ ہے!!

"القائم المؤمّل"

مہدیِ آخرالزماں، خلیفۃ الرحمان، امام مُنتَظَر علیہ السلام کا یہ لقب (القائم المؤمّل) بھی بجائے خود حشر بداماں، جہانِ اسرار و معانی کا حامل وصف و لقب ہے!

مشہور فلسفی، عارف اور فقیہ ملا ہادی سبزواری نے لفظ و لقبِ قائم سے متعلق ایک اہم نکتہ "اسرارالحکم" میں تحریر فرمایا ہے جو قابلِ نقل و بیان ہے۔

"صیغِ قیوم و قائم و قیامہ از یک مادّہ مأخوذ ند، و قیوم مُبالغۂ قائم است

وقائم اسمِ فاعل است وقیامہ مصدرِ قائم است، وچوں مبدأ غنی باشد خود علتِ غائیہ فِعل خود است! وقیامہ قیام عنداللہ است بعد از آنکہ قیام عندالنفس بودہ، پس قیامتِ کبریٰ کہ نہایتِ سلسلۂ طولیۂ صعودیہ غایتِ ظہورِ قائم باشد وتا قیام قائم بالحق نشود قیامت قیام نکند۔"

حضرت مولانا سبزواریؒ نے جو کچھ فرمایا اس کی تشریح وتوضیح ایک مستقل دفتر کی طلب گار ہے۔ فہمِ عوام کے لیے اِس کا خلاصہ بس اسی قدر عرض کیا جاسکتا ہے کہ لفظی اعتبار سے بھی قیام، قیامت، قیوم اور قائم وغیرہ کلمات ایک ہی مادّے سے ہیں۔ اور معنوی لحاظ سے بھی، واقعاتی حقائق کے اعتبار سے بھی اور اسرارِ مشیت کے تعلق سے بھی حضرت قائم آلِ محمدؑ کے وجود وظہور میں اور قیامِ قیامت میں ایک گہرا تعلق ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معروف حدیث شریف میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ:

"لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰی یَمْلِکَ رَجُلٌ مِنْ اَھْلِ بَیْتِیْ"

"اس وقت تک قیامت برپا نہیں ہوگی جب تک کہ میرے اہلِ بیت میں سے ایک مرد سلطنت قائم نہ کرلے گا۔"

اسی مقام پر جی چاہتا ہے کہ ملا ہادی سبزواریؒ کا یہ گرانبہا جملہ بھی نقل کردیا جائے انہوں نے لکھا ہے:

"شھودُہُ للّٰہِ ذِکریٰ وَ قِیامُہُ لِلقیامَہِ بُشریٰ"۔

"ان کا شہود اللہ کی یاد دلاتا ہے اور ان کا قیام قیامت کی بشارت دیتا ہے"۔

اس جملہ کی لطافتِ ظاہری وباطنی کے پیشِ نظر اسے "احادیثِ برزخیہ" میں شمار کرنا تجاوز نہ ہوگا۔ جس طرح محقق طوسیؒ کا یہ جملہ کلامی نقطۂ نظر سے ایک

دیوانِ مطالب ہے کہ:

”وجودهٗ لطفٌ وَ تصرفهٗ لطفٌ آخر و عدمهٗ مِنّا“۔

”ان کا وجود سراسر لطفِ ربّانی ہے، ان کا فیضانِ تصرف یا لطفِ ہدایت، لطفِ مزید ہے اور ان کا عالمِ شہود میں نہ ہونا ہماری ہی بے بصری کی بنا پر ہے۔“

اسی طرح ملا ھادیؒ کا یہ جملہ عرفانی زاویۂ نظر سے ایک مکمل دفترِ دل سمیٹے ہوے ہے۔

☆☆☆

”والعدل المنتظر“ کا جملہ واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس مشہور ارشادِ گرامی کی طرف ناظر ہے:

”وَیَمْلَأُ الارْضَ قِسطاً وَ عَدلاً کَما مُلِئَتْ ظُلْماً وَجُوراً“

”اور وہ زمین کو عدل وانصاف سے اُسی طرح پُر کر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے پُر ہو چکی ہوگی!

اس کے بعد جو دعا کے جملے ہیں وہ گویا حضرت قائمِ آلِ محمدؑ سے وفاداری کے عہد و پیمان ہیں، اُن سے وابستگی کا اِعلان ہیں!

☆☆☆☆☆

(٢٦)

کتابِ رحمت

قرآن کریم یا آئینِ دین و دستورِ خلافت

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ الدَّاعِيَ اِلىٰ كِتَابِكَ وَالْقَائِمَ بِدِيْنِكَ اِسْتَخْلِفْهُ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفْتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِ مَكِّنْ لَهُ دِيْنَهُ الَّذِي ارْتَضَيْتَهُ لَهُ اَبْدِلْهُ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِ اَمْناً يَعْبُدُكَ وَلَا يُشْرِكُ بِكَ شَيْئاً.

''اے معبود! انہیں اپنی کتاب کی طرف بلانے والا، اور اپنے دین کے ساتھ ''قیام'' کرنے والا قرار دے! اور انہیں زمین پر اسی طرح خلافت عطا فرما جس طرح ان سے پہلے والوں کو عطا فرمائی، اور ان کے لیے اسی دین کو مقتدر بنا دے جس کو تو نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے! تو ان کے خوف کو امن سے بدل دے کہ وہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کسی شے کو وہ تیرا شریک نہیں بناتے!!''

دُعائے افتتاح کا یہ فقرہ کئی مطالب اور موضوعات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جن میں سے پہلا موضوع کتابِ رحمت و کتابِ حق کی عظمت و اہمیت یعنی قُرآن شناسی کا موضوع ہے۔

- قرآن کریم جو ربّ اکبر کا لطفِ عمیم اور احسانِ عظیم ہے، جو سراسر کتابِ رحمت ہے اور حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سَندِ نبوت و نشانِ خاتمیت ہونے کی حیثیت سے زندۂ جاوید معجزہ ہے۔ یہی وہ دستورِ حیات ہے جو انسان کو فردوسِ نجات اور ابدیت و بقاء عطا کرنے والا ہے۔ چنانچہ یہی حضرت مہدیِ منتظر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا دستورِ حکومت ہوگا۔ ایک مسلمان کی مقامِ دعا میں اس سے بڑی سعادت مندی نہیں ہوسکتی کہ وہ ربّ کریم سے قرآن کریم کی طرف دعوت دینے والے رہبرِ معصوم کے قیام وظہور کی دُعا کرے اور خود قرآنِ کریم پر مکمل ایمان اور اس کے احکام و آداب پر بہ کمالِ رغبت و شوق عمل پیرا ہونے کی استعداد پیدا کرے۔

• یہی قرآن شرفِ انسانی کا سب سے بڑا ضامن ہے۔ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں یہ سب سے بڑا معجزہ ہے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ یہ آپؐ کا ''قولی معجزہ'' ہے۔ لیکن یہ ناچیز عرض کرتا ہے کہ آپؐ کا یہی قولی معجزہ اپنی بقا کے لحاظ سے آپؐ کا عظیم ترین ''فعلی معجزہ'' بھی ہے۔

• یہی قرآن ہے جس سے تمسک کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور ائمہ دین علیہم السلام نے طرح طرح سے وصیتیں فرمائی ہیں۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور وصیت تو وہ ہے جو حدیثِ ثقلین کے نام سے جانی جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

''اِنّی تارکٌ فیکم الثقلین کتابَ اللہِ و عترتی اھل بیتی''

''میں تمہارے درمیان اللہ کی کتاب اور اپنی عترت اپنے اہلِ بیت کو چھوڑ رہا ہوں!''

یہ حدیث سند و متن سے متعلق تمام فنی مباحث اور اپنے دامنِ معنی میں سمٹی ہوئی تمام عرفانی حقیقتوں سے عُہدہ برا ہونے کے لیے مستقل توجہ کی طلب گار ہے۔ آخر خاتم الانبیاء کی ''وصیت'' ہے!!

• علامہ بہائی نے ناطق و صامت کے معانی بیان کرنے کے ضمن میں اپنی کشکول میں ایک اور حدیث نقل فرمائی ہے جو ان الفاظ میں ہے:

''اِنّی تَرَکْتُ فِیْکُمْ وَاعِظَیْنِ صَامِتاً وَ نَاطِقاً، فَالصَّامِتُ المَوْتُ وَالنَّاطِقُ القُرآن''

(کشکول بہائی نسخہ خراسان، طبع نجف ج ۳ ص ۴۲)

وَاَكْثَرَ مَاصَلَّيْتَ وَبارَكْتَ وَ تَرَحَّمْتَ وَ تَحَنَّنْتَ وَ سَلَّمْتَ

عَلىٰ اَحَدٍ مِنْ عِبادِكَ وَاَنْبِيائِكَ وَرُسُلِكَ

وَصَفْوَتِكَ

وَاَهْلِ الْكَرامَةِ عَلَيْكَ مِنْ خَلْقِكَ

اَللّٰهُمَّ وَصَلِّ عَلىٰ عَلِيٍ اَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ

وَوَصِيِّ رَسُوْلِ رَبِّ الْعالَمِينَ عَبْدِكَ وَوَلِيِّكَ

وَأَخِي رَسُوْلِكَ وَحُجَّتِكَ عَلىٰ خَلْقِكَ

وَآيَتِكَ الْكُبْرىٰ وَالنَّبَأِالعَظِيمِ

وَصَلِّ عَلىٰ الصِّدِّيقَةِ الطَّاهِرَةِفاطِمَةَ سَيِّدَةِ نِساءِ الْعالَمِينَ

وَصَلِّ عَلىٰ سِبْطَيِ الرَّحْمَةِ وَاِمامَيِ الْهُدىٰ

الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ سَيِّدَي شَبابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ

وَصَلِّ عَلىٰ اَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ

عَلِيِّ بْنِ الْحُسَينِ

وَمُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ

وَجَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ

وَمُوسَىٰ بْنِ جَعْفَرٍ

وَعَلِيِّ بْنِ مُوسَىٰ

وَمُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ

وَعَلِيِّ بْنِ مُحَمَّدٍ

''میں نے تمہارے درمیان موعظہ کرنے والی دو چیزیں چھوڑی ہیں ایک صامت ہے اور ایک ناطق، صامت موت ہے اور ناطق قرآن!''

اس مقام پر لفظِ صامِت اور ساکِت کا ایک دقیق فرق قابلِ ذکر ہے اربابِ لغت نے بیان کیا ہے کہ صامت اُسے کہتے ہیں جس سے کسی باطِل مُراد و معنیٰ کا استفادہ نہ کیا جا سکے اور ساکت محض خموش یا بے حرکت و بے آواز شے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور جو شے کسی شے کی رہنمائی کرے وہ اس پر ناطق کہلاتی ہے چاہے وہ اس پر سُنائی دینے والی آواز کے ذریعہ رہنمائی نہ کرے۔[1]

- یہی قرآن ہے جو اپنے مستحکم براہین، روشن معانی، محفوظ آیات اور حقائقِ حیات و کائنات پر بے شائبۂ خطا دلالت و رہنمائی اور ہر طرح کی تحریف و تشکیک سے مامون و مصون ہونے کی وجہ سے قیامِ قیامت تک انسانی مسائل کے حل و فصل کا سب سے بڑا سرچشمہ اور ہر لحاظ سے ''حُجّت'' ہے!

- بلاشبہ یہی قرآن تمام اصولِ قوانین کا سب سے بڑا مآخذ ہے۔ اور

ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَارَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِلْمُتَّقِیْنَ! (البقرہ/۲)

''یہ وہ مجموعۂ کلامِ الٰہی ہے جس میں کسی بھی تشکیک کا گزر نہیں ہے، ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے...''

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ... (بنی اسرائیل/۹)

''بے شک یہ قرآن اُس راستے کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے مُحکَم ہے، اور بشارت دیتا ہے اہلِ ایمان کو...''

﴿لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ (فصلت/۴۲)

---

[1] ''کل ما دل علیٰ شیئ فهو ناطق علیه و ان لم یکن بالصوت المسموع'' (کشکول ج ۱ ص ۴۱)

''اس میں کہیں باطل کی سمائی نہیں ہے، نہ اس کے سطور میں نہ بین السطور میں۔''

﴿تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ (سورۂ فصلت ۴۲/۴۱)

''یہ وحی ہے صاحبِ حکمت اور شایانِ مدحت پروردگار کی!!''

☆☆☆

● حقائق ناشناس افراد قرآن کریم میں تحریف کے شبہات کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ قرآن کریم ہر طرح کی تحریف سے محفوظ رہا۔ حوزۂ علمیہ قم کے عصرِ حاضر کے عظیم استاذ حکمت وعرفان اور فقیہ ذیشان علامہ ذوفنون آیۃ اللہ حسن حسن زادۂ آملی اس باب میں یہاں تک فرماتے ہیں کہ:

''درقرآنِ کریم بہ ہیچ وجہ و ہیچ نحو تحریفی نشدہ این قرآن بین دفتین کہ اول آن فاتحہ و آخر آن ناس است ہمانی است کہ بر خاتم (ص) اِنزالاً و تنزیلاً وحی شدہ است و ترتیبِ سور و آیات ہمہ بفرمان حق سبحانہ است واگر کسی خلاف این حکم رامدعی است علاوہ این کہ رسالہ ای در ردِ آن نوشتہ ام و براہین قاطعہ آوردم، باچنان کس بمباہلہ حاضرم!''

(حسن زادہ آملی، ہزار و یک نکتہ، نکتہ ۱۰۹ ص ۱۰۲ ط ۳ ۱۳۷۲ ھ ش)

خلاصۂ تقریر یہ ہے کہ یہ قرآن آج جس کمیت و کیفیت کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے، اِنزالاً و تنزیلاً یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی فرمایا گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ استاذ حسن زادہ آملی کے نزدیک اس پر براہینِ قاطعہ موجود ہیں بلکہ وہ اس حقیقت کے منکر سے مباہلہ بھی کرنے کے لیے تیار ہیں!

اِس مختصر سی تقریر سے بحث و تحقیق کے بہت سے دروازے کھلتے ہیں۔

سب سے پہلے قرآن کریم کی جمع آوری کے بارے میں نقل کی جانے والی وہ روایتیں زیرِ سوال آتی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد زید بن ثابت کے ذریعہ جمع وتالیفِ قرآن کی سرکاری کوششوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے تحقیق کرنے پر اس سلسلے کی تمام روایتیں بے سروپا افسانہ سے زیادہ وقعت کی حامل نظر نہیں آتیں! ہاں یہ ضرور ہے کہ وصیِ رسول حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اشاراتِ وحی کے تابع فرامینِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق قرآن مجید کے منتشر ٹکڑوں کو یکجا کر کے دو دفتیوں کے درمیان جمع فرمایا۔ اربابِ سیاست، دشمنانِ دین، منافقین، یہود ومشرکین اور نہ جانے کتنے عاقبت ناشناسوں، باطل پرستوں، خدا بیزاروں نے قرآن کریم میں تحریف کی کوششیں کی ہوں گی، بلکہ تاریخی کوائف اور بیانات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے تحریفِ کتاب کی کوششوں میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا لیکن اُن کی کوششیں وصی برحق حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ہوتے ہوئے کسی بھی صورت بارآور نہ ہو سکیں! انہوں نے قرآن پر آنے والی تمام آفتوں کو اپنی جان پر لے لیا مگر اسے ہر طرح محفوظ رکھا! ۲

☆☆☆

دُعائے افتتاح کے زیرِ غور فقرے میں دوسرا موضوع استخلاف ہے! یہ بھی توجہ طلب ہے کہ دعا کا یہ جملہ اور اس کے بعد کا جملہ سورۂ مبارکۂ نور کی ۵۵ ویں آیت سے ماخوذ ہے:

"وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ آمَنُوْا مِنْکُمْ وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ

اس صفحہ کے حواشی صفحہ ۳۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں۔

دِیۡنَهُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَهُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَایُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡـًٔا‘‘

آیتِ مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے ایمان لانے والوں اور عملِ صالح کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُنہیں روے زمین پر یقیناً اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح پہلے والوں کو بنایا، اور ان کے لیے اس دین کو جسے ان کے لیے پسندیدہ قرار دیا ہے، اقتدار ونفوذِ کامل عطا فرمائے گا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا وہ صرف معبودِ برحق ہی کی عبادت کریں گے اور کسی طرح کا شرک نہیں کریں گے۔‘‘

دعا کے جملوں میں اور اس آیت کے مضمون میں جو مطابقت پائی جاتی ہے وہ اظہر من الشّمس ہے۔ تاہم اصل مضمون کی وضاحت مزید چند آیات واحادیث پر نظر ڈالنے کی متقاضی ہے۔ جن میں آیتِ اکمالِ دین (سورۂ مائدہ آیت ۳) آیتِ خلافتِ آدمؑ (۲/۳۰)، آیتِ خلافتِ داوٗدؑ (۳۸/۲۶) آیتِ استخلافِ ہارون (سورۂ اعراف ۷/۱۴۲) خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور ان تمام آیات کا ربط موضوعِ خلافت سے واضح ہے لیکن ایک خصوصی تعلق خلافتِ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ہے جس کی وضاحت بعض روایتوں سے ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پروردگار کی خالص ترین عبادت جسے مطلقاً اور حقیقۃً عبادت ہی کہا جاسکے انبیاء اور ائمہ کے علاوہ کسی سے ممکن نہیں ہے اور اسی طرح پروردگار کی وحدانیتِ حقیقیہ اور وحدتِ مُطلقہ کا واقعی ادراک اور کامل علمی اور عملی اعتراف واقرار بھی کسی نبی، رسول یا امام معصوم ہی سے ممکن ہے۔ اُن کے علاوہ کوئی بھی اس شانِ عبادت واقرارِ توحید ونفی شرک کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ اور اسی لیے ہم گواہی دیتے ہیں کہ:

"یعبدک، ولا یشرک بِکَ شیئاً"

''وہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کسی شئی کو وہ تیرا شریک نہیں بناتے!''

یہ ان کے مقامِ عصمت کبریٰ کی گواہی کے مترادف بھی ہے!

۱۔ ان روایات کی تحقیق میں سب سے مستند اور غالباً سب سے بڑا کام حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم الخوئی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب البیان فی تفسیر القرآن ہے۔ جس کا اردو ترجمہ حبیبِ مکرم حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا شفا نجفی صاحب مدرس جامعہ اہلِ بیت اسلام آباد پاکستان نے فرمایا ہے۔

۲۔ چونکہ اس فصل میں قرآن شناسی کا عنوان قائم ہوگیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علوم القرآن کے متعلق بھی چند نکات یہاں پر ذکر کردیے جائیں۔

''علوم قرآن'' کے ضمن میں کتنے اور کون کون سے علوم شمار کیے جاسکتے ہیں یہ بحث بھی بہت پیچیدہ ہے۔ اس لیے کہ اولاً ''علوم القرآن'' کی تعریف ہی میں بحث کی گنجائش ہے کہ یہ عنوان آیا اُن علوم کے لیے مخصوص رکھا جائے جو تلاوت وفہمِ قرآن میں مددگار ہوتے ہیں یا اُن علوم کے لیے جن کا سرچشمہ ہی قرآن مجید ہے یعنی جن علوم کا سُراغ نزولِ قرآن سے پہلے نہیں ملتا اور وہ قرآن مجید ہی کے بطون سے پیدا ہوے ہیں! پھر اگر یہی معیار قرار دیا جائے، جواب تک بیشتر مصنفین نے اختیار کیا ہے کہ علوم القرآن میں وہ علوم آتے ہیں جو مسلمانوں نے تلاوت وفہم کے مشکلات حل کرنے کے لیے مدون کیے ہیں تو علم نحوِ عربی کو بھی اسی عنوان کے تحت شمار کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ اس کی ابتدا حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے حکم سے آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت میں غلطیوں سے بچنے ہی کے لیے ہوئی تھی۔

- یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بیشتر بلکہ تمامتر علوم قرآن کی تدوین کا آغاز حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اور دیگر ائمہ اہلبیت علیہم السلام نے فرمایا۔ اور انہیں ائمۂ اطہار سے وابستہ صحابہ وتابعین وتبع تابعین نے ان علوم کو فروغ بخشا۔ بالخصوص:

(۱) علمِ تجوید قرآن:

متفق علیہ اور مسلّمہ حقیقت ہے کہ قُرآن مجید کی تجوید اور تلاوت کے فن کی اَساس حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا یہ ارشادِ گرامی ہے:

"الترتیل ھو حفظ الوقوف و بیان الحروف"

''ترتیل کے معنٰی اوقاف کی پابندی اور حروف کی صحیح ادائیگی کے ہیں۔''

اس کے بعد توغل وتفنن بڑھتا رہا اور لوگ اس فن میں کتابیں لکھتے رہے۔

(۲) علمِ اعراب القرآن:

یہ بھی ایک متفق علیہ اور مسلم حقیقت ہے، جس کی طرف ابھی ذرا ہی قبل اشارہ کیا گیا کہ اعراب القرآن کی اساس حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہی نے رکھی اور ابوالاسود دُئیلی کو علم الاعراب یا علم النحو کی مستقل تدوین وتالیف پر مامور فرمایا جو کلمات آپ نے اساسِ فن کے طور پر ارشاد فرمائے وہ یہ تھے:

"الکلام کلہ ثلاثۃ اشیاء، اسم و فعل و حرف، فالاسم ما انبأ عن المسمیٰ والفعل ما انبئی عن حرکۃ المسمیٰ بہ والحرف ما اوجد معنیً فی غیرہ وان الاسماء ثلاثۃ، ظاھر و مضمر و اسم لا ظاھر ولا مضمر۔

والفاعل مرفوع و ماسواہ فرع علیہ والمفعول منصوب وماسواہ فرع علیہ والمضاف الیہ مجرور و ماسواہ فرع علیہ"

اسی طرح علم القراآت، علم غریب القرآن، معانی القرآن، مجاز القرآن، احکام القرآن، فضائل القرآن، اسباب النزول، تفسیر القرآن، تاویل الآیات غرض قرآن مجید سے متعلق مختلف علوم وفنون دست ائمہ و اصحابِ ائمہ سے مدون ہوئے جن میں حضرت اُبی بن کعب (فضائل القرآن) حضرت جابر بن عبداللہ انصاری، حضرت عبداللہ بن عباس، ابان بن تغلب، یحیٰ بن زیاد الفراء، محمد بن السائب وغیرہ کو تدوین وتالیف میں اولیت کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے بعد عہد بہ عہد مختلف علماء، عرفاء اور مشتغلین توسیع وتفریع وتدوین وتالیف میں اضافہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انتہائی ضخیم کتابیں تالیف ہوئیں جن میں "الاتقان فی علوم القرآن" (تالیف علامہ جلال الدین سیوطی) کو یقیناً ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔

ہمارے عہد میں علوم القرآن کے مباحث میں بعض نئے ابواب جدید تجرباتی علوم کے بعض ماہرین نے اضافہ کیے ہیں۔ ان میں بھی بطورِ خاص وہ ماہرین قابلِ ذکر ہیں جو قرآن مجید ہی کے فیضانِ ہدایت سے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے ہیں مثلاً فرانس کے مشہور سائنس داں موریس بوسیل (Mouries Bucille) یا بعض ترکی کے علماء مثلاً ڈاکٹر ہلوک نور باقی وغیرہ۔

● علامہ بہائی شیخ الاسلام ابوالفضائل بہاء الدین محمد بن الفقیہ الشیخ حسین العاملیؒ معروف بہ شیخ بہائی صاحبِ کشکول نے "بیان ماشتمل علیہ القرآن المجید" کے عنوان سے یہ تفصیل فراہم کی ہے کہ قرآن مجید میں کل کتنے الفاظ، کتنے حروف اور حروفِ ہجا میں سے کون کون سے حرف کتنی بار استعمال ہوئے ہیں۔ اس باب میں خاصا اختلاف ہے کہ "قرآن مجید میں حرف شماری" کا کام سب سے پہلے کس نے انجام دیا۔

بیان ما اشتمل علیہ القرآن المجید:

الکلمات	الحروف	الالفات	الباآت	التاآت
۷۶۴۴۰	۷۲۲۳۳۲	۴۰۷۹۲	۱۱۴۰	۱۲۹۹

الثاآت ۱۲۹۱	الجیمات ۳۲۹۳	الحاآت ۱۱۷۹	الخاآت ۲۴۱۹	الدالات ۴۳۹۸
الذالات ۴۸۴۰	الراآت ۱۰۹۰۳	الزاآت ۹۵۸۳	السینات ۴۵۹۱	الشینات ۲۵۱۳۳
الصادات ۱۲۸۴	الضادات ۱۲۰۰	الطاآت ۸۴۰	الظاآت ۹۳۲۰	العینات ۲۰۱۰
الغینات ۷۴۹۹	الفاآت ۲۵۰۰	القافات ۵۲۴۰	الکافات ۲۲۰۰۰	اللامات ۱۴۵۹۱
المیمات ۲۰۵۶۰	النونات ۲۰۳۶	الواوات ۱۳۷۰۰	الهاآت ۷۰۰	الیاآت ۵۰۲

(علامہ بہائی کشکول ج اص ۴۳۴)

علامہ بہائی نے اس مقام پر حرکات، سکونات، آیات اور اوقاف وغیرہ کی تفصیل نہیں دی ہے۔ یہ تفصیل پیش کرنا ہمارا بھی مطمح نظر نہیں ہے بلکہ صرف یہ مثال پیش کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں نے قرآن مجید کے ساتھ کس قدر اہتمام واعتنا کیا ہے۔

بلاشبہ حضرت امیر علیہ السلام اور آپ کے بعد ہونے والے ائمۂ اہلِ بیتِ طاہرین علیہم السلام کے علاوہ بہت سے اصحابِ اخیار اور سیاست مداروں کے علاوہ امتِ مسلمہ کے بیشتر افراد نے بھی اِس عظیم نعمتِ الٰہی کی حفاظت وقدردانی وقدرشناسی میں اپنی اپنی حیثیتوں کے مطابق کوئی کمی نہیں کی۔ قرآن مجید کے ساتھ مسلمانوں کے شغف کا حال تاریخ حفاظِ قرآن، تفاسیرِ قرآن اور تاریخ علومِ قرآن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے۔

قرآن سے عشق کے مظاہر مسلم معاشرے میں ہر سطح پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ حفظ وتلاوت وتجوید سے لے کر تحریر مصاحف میں اہتمام وتزیین تک اور حروف وحرکات ونقاطِ قرآن کو شمار کرنے سے لے کر اس کے رموز واسرار کی نقاب کشائی کی علمی اور عملی کوششوں تک ایک عالم نہیں بلکہ عالَم عالَم نور وظہور کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے!

اس مقام پر ہم بانیِ جمہوریِ اسلامی ایران آیۃ اللہ العظمٰی امام خمینیؒ کے اس جملے پر اس گفتگو کو تمام کرتے ہیں کہ قرآن وہ نعمتِ عظمٰی ہے کہ اگر انسان تمام عمر سجدۂ شکر ہی میں گزار دے تب بھی حقِ شکر ادا نہیں ہوسکتا!

(۲۷)

ظہورِ دین وفروغِ سنت

اَللّٰھُمَّ اَظْھِرْ بِہٖ دِیْنَکَ وَسُنَّۃَ نَبِیِّکَ حَتّٰی لَا یَسْتَخْفِيَ بِشَيْءٍ مِنَ الْحَقِّ مَخَافَۃَ اَحَدٍ مِنَ الْخَلْقِ۔

اے معبود! اپنے دین کو اور اپنے نبیؐ کی سُنّت کو اُن کے ذریعہ سے اس طرح ظاہر فرما کہ پھر خلق میں سے کسی کے خوف سے کوئی بھی شے چھپانی نہ پڑے!

☆☆☆

دعا کا یہ فقرہ قرآنِ مجید کی اُن آیتوں کی طرف ناظر ہے جن میں ''مکمل غلبہ دین'' کی بات کہی گئی ہے اور جن کی تفسیر و تاویل کے ذیل میں حضرت مہدیِ منتظر علیہ السلام کے ظہور و سلطنت کے بارے میں حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔

یہ سورۂ توبہ، سورۂ فتح اور سورۂ صف کی آیتیں ہیں۔

(۱) ﴿ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ﴾

(سورۂ توبہ آیت ۳۳)

''وہی ہے وہ (معبود برحق) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اُسے تمام ادیان پر غلبہ عطا کرے چاہے مشرکین اسے کتنا ہی ناپسند کریں۔''

بعینہ یہی آیت سورۂ صف میں بھی آئی ہے۔ (سورۂ صف آیت ۹) البتہ سورۂ فتح میں آیت کا آخری جملہ مختلف ہے۔

﴿ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا﴾ (سورۂ فتح آیت ۲۸)

''وہی ہے وہ (معبودِ برحق) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق

کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے تمام دینوں پر غلبہ عطا فرمائے اور بس معبودِ برحق ہی گواہی کے لیے کافی ہے!''

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان آیات سے متعلق فرمایا ہے:

''وَاللّٰہِ مَا یَجِیئُ تَأْوِیْلُھَا حَتّٰی یَخْرُجَ الْقَائِمُ الْمَھْدِیُّ''

''معبودِ برحق کی قسم ان آیتوں کی تاٗویل نہیں آئے گی جب تک کہ مہدیِ قائم ظہور نہ کریں گے۔''

اِس کے علاوہ زیرِ غور فقرے میں سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُس کی حُجیت یعنی سنتِ نبویؐ کی آئین ساز و قانون ساز حیثیت کی طرف دعوتِ فکر دی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنِ مجید کے بعد اساسِ دین اور ماٗخذِ شریعت سیرتِ نبویؐ ہے! اور یہ ایسی بدیہی بات ہے جس پر کوئی دلیل پیش کرنا یا کسی شخص کا اس پر دلیل طلب کرنا محض حماقت ہے، عقلِ انسانی جن دلائل سے نبی کی ضرورت کو تسلیم کرتی ہے، نبی کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کی سیرت و سنت کی حجیت کو تسلیم کرنے کے لیے اسے کسی بھی استدلال و برہان کی ضرورت باقی نہیں رہتی! بحمد اللہ نبیِ خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ مبارکہ کے ماٗخذِ شریعت ہونے پر فی الجملہ تمام مسلمانوں کا اتفاق بھی ہے۔ لیکن ''سنت'' کی تعریف، اس کی تقسیم اس کے استناد، اس کی تفسیر و تاویل یا اس کے اطلاق و نفاذ کے باب میں بہت سی بحثیں اور مشکلیں پیدا ہو گئی ہیں۔ بعض مسلم علماء اور دانشور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک پیغمبرانہ حیثیت تھی اور دوسری ذاتی و شخصی و بشری۔ آپؐ کی سیرت و سنتِ پیغمبرانہ تو اساسِ و ماٗخذِ دین و شریعت ہے لیکن آپؐ کی

اور اس سے بھی زیادہ! جو بھی رحمت، برکت، ہمدردی، محبت اور سلامتی

تو نے اپنے بندوں، نبیوں اور رسولوں،

اپنے چنے ہوئے لوگوں،

اور اپنی تمام خلقت میں اپنے نزدیک ذی مرتبہ، ذی شرف لوگوں پر کی ہے، اس سے بھی زیادہ!

اے معبود! رحمت فرما امیر المومنین،

وصی رسول، اپنے بندۂ خاص، اپنے ولی

اپنے رسول کے بھائی اور اپنی تمام خلقت پر اپنی ''حجت''،

اپنی بزرگ نشانی اور اپنے ''عظیم ترین پیغام'' علیؑ پر!

اور رحمت فرما ''صدیقۂ طاہرہ'' فاطمہؑ پر جو تمام جہانوں کی خواتین کی سردار ہیں!

اور ''سبطین رحمت'' اور رہنمایان ہدایت،

جوانان اہل جنت کے سرداروں، حسنؑ اور حسینؑ پر!

اور رحمت فرما تمام مسلمانوں کے پیشواؤں،

علی بن الحسین	(امام زین العابدین)	
محمد بن علی	(امام باقر)	(علیہ السلام)
جعفر بن محمد	(امام صادق)	(علیہ السلام)
موسیٰ بن جعفر	(امام کاظم)	(علیہ السلام)
علی بن موسیٰ	(امام رضا)	(علیہ السلام)
محمد بن علی	(امام تقی)	(علیہ السلام)
علی بن محمد	(امام نقی)	(علیہ السلام)

ذاتی و شخصی سیرت و سنت ''آئین و قانون ساز حیثیت نہیں رکھتی''۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ پیغمبرِ خدا کی ''عصمت'' کو تسلیم کرنے والوں کے لیے محض ایک اضحکہ ہے۔

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت و سنت کو بغیر کسی ''تبعیض'' یا تقسیم کے خود ربّ کریم نے قرآن مجید میں ''حجت'' اور ماٴخذِ شریعت قرار دیا ہے، قرآن کے ارشاد و بیان کے بعد خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ''سیرت و سنت'' کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپؐ کے اہلبیت سے ہونے والے ائمہٴ دین نے ''سیرتِ طیبہ'' اور ''سنتِ مطہرہ'' کو دین و شریعت اور علم و معرفت کا ناقابلِ تغیر ستون اور سرچشمہ قرار دیا ہے۔ آیت قرآنی ہے:

﴿وَمَا آتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾

(حشر ۵۹/۷)

''...اور جو کچھ رسول تمہیں دے اُسے لے لو اور جس بات سے منع کرے اُسے ترک کر دو!''

اس سلسلے میں دوسری آیتِ قرآنی یہ ہے:

﴿لقد کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

(سورہٴ احزاب ۳۳/۲۱)

''تمہارے لیے رسول اللہ کی شخصیت میں بہترین مثال موجود ہے''۔

اس باب میں تیسری آیت یہ ہے:

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی﴾

(سورہٴ نجم ۵۳/۳،۴)

''اور یہ (رسول) اپنی ہوائے نفس سے نہیں بولتے جو کچھ بولتے ہیں وہ اُن کو بھیجی گئی وحی ہوتی ہے''۔

اس باب میں چوتھی آیت یہ ہے:

﴿یَا اَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا اسْتَجِیبُوا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُولِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیکُمْ...﴾ (انفال/۲۴)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں دعوت دیں جس امر میں تمہاری زندگی ہے...''۔

اس باب میں پانچویں آیت یہ ہے:

﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُونِی ...﴾

(آل عمران آیت ۳۱)

''اے رسول کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو...!!''۔

اس وقت ہم انہیں پانچ آیتوں پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ ایسی اور بھی آیتیں ہیں جن سے حُجّیّتِ سنتِ نبوی کا اثبات و ثبوت حاصل ہوتا ہے۔

☆☆☆

یہاں پر دُعائے افتتاح کے اس پورے بند میں ایک اور بات بھی کہی گئی ہے، جو ایک انتہائی اہم، عقلی، دینی اور تاریخی حکمت، حُکم اور تدبیر پر گفتگو کی متقاضی ہے جس پر عقل اور دین تو متفق ہیں لیکن افسوس ہے کہ بعض مسلمان عُلَما، صرف نظری اعتبار سے بلکہ محض بر سبیلِ مُناظرہ، اس کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں۔ میری مُراد ''حُکمِ تقیّہ'' سے متعلق ہے۔

سب سے پہلے اس کی لفظی اور لغوی تحقیق کر لیجیے۔

''تقیّہ'' کا مادّہ یا Rootword وہی ہے جو ''تقویٰ'' کا ہے۔ یہ حیرت

انگیز بات ہے کہ تقویٰ کا پابند تقیہ کا مخالف کیوں کر ہو سکتا ہے؟!

اس کا مادّہ ہے: وق ی

التقویٰ- فَعلیٰ - جیسے نجویٰ، اصل میں وَقوی تھا۔ وَقیۃٌ سے بمعنیٰ منعۃ، عربی علمِ صرف کے قواعد کے مُطابق واو، ت سے منقلب ہو گیا، اسی طرح لفظ ’تقاۃ‘ اصل میں وُقاۃ تھا۔

مجمع البحرین طُریحی میں ہے ’التقیة والتقاة اِسمانِ موضوعانِ مَوضِعَ الاتّقاء‘ تقیہ اور تقاۃ، اتقاء کے قائم مقام اسماء بنائے گئے ہیں۔

تقیہ کے ایک معنی خوف کے ہیں۔ جس کے لازمی معنیٰ میں عقاب بھی شامل ہے۔ چنانچہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے ایک خطبہ میں یہ لفظ غالباً اسی معنی میں استعمال ہوا ہے فرماتے ہیں:

وَرُبَّمَا اِستَحلیٰ النّاسُ الثَّنآءَ بعْدَ البلآءِ فَلا تُثْنُوا عَلَیَّ بِجَمیلِ ثناءٍ لِاِخراجِي نَفْسِي اِلیٰ اللّٰہِ سُبحانَہٗ وَاِلَیکُمْ مِنَ التَّقِیَّةِ فِي حُقُوقٍ لَمْ اَفْرُغ مِنْ اَدائِها“ (نہج البلاغہ نسخہ صبحی صالح ۲۱۶ ص ۳۳۵)

”اکثر لوگ آزمائش کے بعد مدح وثنا کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن تم لوگ ستائش نہ کرو کہ اطاعتِ خدا اور تمہارے حقوق کی ادئیگی سے عہدہ برآ ہو گیا ہوں، کہیں تم مجھے اُن حقوق کے خوف سے نکالو جن کے ادا کرنے سے ابھی میں فارغ نہیں ہوا...“

☆☆☆

اصطلاحِ فقہ وکلام میں ’تقیہ‘ کے معنی یہ ہیں کہ ”دشمن کے خوف سے جبکہ

اُس سے مقاومت کی طاقت نہ ہو یا مقاومت موثر نہ ہو تو مومن جان مال اور عزت بچانے کی خاطر اپنے ایمان کو دل میں چھپالے اور اُس کا اظہار نہ کرے!"

اس کی اساس قرآن مجید کی یہ صریح آیت ہے:

"لَا یَتَّخِذِ الْمُؤمِنُونَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤمِنِیْنَ وَمَن یَفْعَلْ ذَالِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَیْءٍ اِلَّا اَنْ تَتَّقُوا مِنْهُم تُقٰیةً "

(سورۂ آل عمران آیت ۲۸)

"ایماندار، ایمادارو ں کو چھوڑ کر، اللہ کے منکروں کو اپنا دوست (یا مددگار وسرپرست) نہ بنائیں! اور جو ایسا کرے گا اُس کا اللہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

سوائے اس کے کہ جب تم اُن (کے ظلم وستم) سے بچنے کے لیے تقیہ اختیار کرو!"

علامۂ بزرگوار شیخ محسن نجفی مدظلہ العالی نے اپنے تفسیری حواشی میں اس آیت کے ذیل میں پیش کیے جانے والے مباحث کا بہت عمدہ خُلاصہ لکھ دیا ہے۔ اس لیے میں اُن کے الفاظ مستعار لے رہا ہوں:

"اِلَّا اَنْ تَتَّقُوا" استثنائے منقطع نہیں متصل ہے۔ یعنی کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ نہ ظاہراً نہ حقیقۃً، اِلَّا اَنْ تتقوا، ہاں اگر البتہ ان سے بچنا مقصود ہو تو ظاہراً دوست بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"اس آیت سے جوازِ تقیہ کے ثابت ہونے کے بارے میں اصحاب، تابعین، تبع تابعین، فقہاء اور مفسرین میں سے کسی کو اختلاف نہیں ہے۔"

علامہ محسن نجفی نے تفسیر ابن کثیر، ابی السعود، رازی، بیضاوی، قرطبی، روح المعانی، المنار، ظلال القرآن، بیان القرآن تھانوی اور تفہیم القرآن مودودی وغیرہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔

(القرآن الکریم، ترجمہ وحاشیہ از (علامہ) محسن علی نجفی، دار القرآن الکریم اسلام آباد، ص ۵۶)

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ صدر اسلام سے لے کر آج تک محققین علماء کے درمیان کبھی بھی اختلافی نہیں رہا۔ اس لیے کہ یہ ایک عقلی تقاضا، ایک عاقلانہ اور عُقلائی حکمت و تدبیر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حکمِ قرآنی بھی ہے۔ اِسے محض اُن "پیشہ وَر مناظرہ بازوں" نے ایک اختلافی مسئلہ ٹھہرالیا ہے جن کا کام اطاعتِ خدا و رسول نہیں ہے بلکہ وہ یا تو ہوائے نفسانی کے تحت یا "دین دشمن، شیاطینِ انس و جن" کی محض اندھی یا منفعت پرستانہ خدمت گزاری میں امتِ مسلمہ میں تفرقہ اندازی کے لیے مأمور رہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

(۲۸)

ولایتِ حق
یا
دولتِ احسان وکرم

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَرْغَبُ اِلَیْکَ فِي دَوْلَةٍ كَرِيْمَةٍ تُعِزُّ بِهَا الْاِسْلَامَ وَأَهْلَهُ وَتُذِلُّ بِهَا النِّفَاقَ وَ اَهْلَهُ وَتَجْعَلُنَا فِيْهَامِنَ الدُّعَاةِ اِلٰی طَاعَتِکَ وَالْقَادَةِ اِلٰی سَبِيْلِکَ وَتَرْزُقُنَا بِهَا كَرَامَةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ اللّٰهُمَّ مَاعَرَّفْتَنَا مِنَ الْحَقِّ فَحَمِّلْنَاهُ وَمَا قَصُرْنَا عَنْهُ فَبَلِّغْنَاهُ اللّٰهُمَّ الْمُمْ بِهِ شَعْثَنَا وَاشْعَبْ بِهِ صَدْعَنَا وَارْتُقْ بِهِ فَتْقَنَا وَكَثِّرْ بِهِ قِلَّتَنَا وَأَعْزِزْ بِهِ ذِلَّتَنَاوَأَغْنِ بِهِ عَائِلَنَاوَاقْضِ بِهِ عَنْ مُغْرَمِنَا وَاجْبُرْ بِهِ فَقْرَنَا وَسُدَّ بِهِ خَلَّتَنَا وَيَسِّرْ بِهِ عُسْرَنَا وَ بَيِّضْ بِهِ وَجُوهَنَا وَفُکَّ بِهِ أَسْرَنَاوَأَنْجِحْ بِهِ طَلِبَتَنَا وَأَنْجِزْبِهِ مَوَاعِيدَنَا وَاسْتَجِبْ بِهِ دَعْوَتَنَا وَأَعْطِنَابِهِ سُؤْلَنَاوَبَلِّغْنَا بِهِ مِنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ آمَالَنَا وَأَعْطِنَابِهِ فَوْقَ رَغْبَتِنَايَاخَيْرَالْمَسْؤُولِيْنَ وَأَوْسَعَ الْمُعْطِيْنَ اشْفِ بِهِ صُدُوْرَنَا وَأَذْهِبْ بِهِ غَيْظَ قُلُوْبِنَا وَاهْدِنَابِهِ لِمَااخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِکَ اِنَّکَ تَهْدِي مَنْ تَشَاءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ وَانْصُرْنَا بِهِ عَلٰی عَدُوِّکَ وَعَدُوِّنَا اِلٰهَ الْحَقِّ آمِينَ!

اے معبود! ہم تجھ سے وہ باشرف حکومت چاہتے ہیں جس کے ذریعہ تو اسلام اور اہل اسلام کو عزت عطا فرمائے اور جس کے ذریعہ تو نفاق اور اہل نفاق کو ذلیل کرے اور جس (حکومت) میں تو ہمیں اپنی اطاعت کی طرف بلانے والوں میں اور اپنے راستے کی طرف رہنمائی کرنے والوں میں قرار دے اور جس کے ذریعہ تو ہم کو دنیا و آخرت کی بزرگی عطا فرمائے!!

اے معبود! جتنا حق تو نے ہمیں پہچنوایا ہے، اتنی سکت دے اور جو ہم جاننے سے قاصر رہ گئے ہیں اس تک رسائی فرما! اے معبود! ان کے ذریعہ سے ہمیں ایک لڑی میں پرو دے! ہماری بکھری ٹکڑیوں کو جمع کر دے ہماری فرقت کو قربت

سے بدل دے، انہیں کے ذریعہ سے ہماری کمی کو کثرت میں بدل دے، انہیں کے ذریعہ سے ہماری ذلت کو عزت سے بدل دے، انہیں کے ذریعہ سے ہمارے مفلسوں کو تونگر بنا دے، انہیں کے ذریعہ سے ہمارے قرضداروں کی ادیگی فرما دے، انہیں کے ذریعہ سے ہماری ناداری کی تلافی کر دے انہیں کے ذریعہ سے ہماری حاجتوں کو پورا کر دے، انہیں کے ذریعہ سے ہماری دشواریوں کو سہل بنادے، انہیں کے ذریعہ سے ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب فرما، انہیں کے ذریعہ سے ہمارے وعدوں کی ایفا فرما، انہیں کے وسیلے سے ہماری دعاؤں کو قبول فرما انہیں کے وسیلے سے ہمارے سوال پورے کر دے، انہیں کے وسیلے سے ہماری تمام دنیا و آخرت کی آرزوئیں برلا، اور ان کی طفیل میں ہمیں ہماری امید سے سوا دے، اے بہترین سوال پورا کرنے والے، اے سب سے زیادہ عطا کرنے والے، ان کے ذریعہ ہمارے سینوں کو سکون عطا فرما، ہمارے دلوں کا دکھ دور کر دے، اپنے مشیت سے ہماری اس حق کی طرف رہنمائی فرما جس میں اختلاف ڈال دیا گیا، بیشک تو ہی جس کو چاہے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی فرماتا ہے، اور انہیں کے ذریعہ ہمیں اپنے اور ہمارے دشمن پر نصرت عطا فرما، اے حق کے معبود ہماری دعا قبول فرما!

☆☆☆☆☆☆

یہ فقرۂ دعا جسے اکثر مستقل طور پر بھی قنوت یا تعقیب نماز میں تلاوت کرتے ہیں نہایت صاف اور صریح لفظوں میں ''حکومت اسلامی'' کے قیام کی دُعا ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ نظامِ ولایتِ الٰہیہ اور لازمی یا ضمنی طور پر موضوعِ ولایتِ نقیہ سے بھی مربوط ہے۔ یہ مسئلہ بطور خاص اس عہد کے اہم ترین مسائل میں سے ہے، اس لیے اس پر گفتگو کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ گزشتہ فقرے میں خوف اور

تقیے کے حالات کو برطرف کرنے کی دعا تھی۔ ظاہر ہے کہ تقیہ اور خوف کے حالات ختم ہوں گے تبھی ایک بے خوف وخطر معاشرۂ امن وانسانیت یا ''حکومتِ اسلامی'' کی تشکیل ہوگی۔ اس لحاظ سے ان فقروں کے مضامین کا ربط اور تسلسل بھی قابل غور ہے۔

نظریۂ ولایتِ فقیہ کے تعلق سے میں نے امام خمینیؒ کے بارے میں اپنے ایک مقالے میں کچھ لکھا تھا جس میں آیۃ اللہ شہید باقر الصدرؒ کی تشریح کو اختیار کیا تھا۔ اس مقام پر صرف چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ ہم اپنے اسی مقالے کا اقتباس نقل کردینا مناسب سمجھتے ہیں۔

''اس میں کسی شک وشبہ کہ گنجائش نہیں کہ شریعت اسلامیہ کا ڈھانچہ، انسانی معاشرے کی تنظیم اور استحکام کے لیے مضبوط ترین قلعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی معاشرے کی تنظیم اور استحکام کی ظاہری عملی شکل ''بنائے حکومت'' ہے۔ چنانچہ شریعت اسلامیہ میں بنائے حکومت کے جملہ تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ البتہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اجتہاد کے ارتقائی سفر میں کئی مرحلوں سے گزر کر اس کے تمام خدوخال اپنے واضح ترین اور قطعی شکل وصورت میں نظریۂ ''ولایت فقیہ'' کے قالب میں سامنے آئے ہیں۔ جسے آیۃ اللہ العظمیٰ امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے حوزۂ علمیہ نجف (عراق) میں اپنے فقہی لکچرز کے ضمن میں پیش کیا تھا۔

آیت اللہ خمینیؒ کے بعد اس نظریہ کے فقہی، سیاسی، اقتصادی، اور اجتماعی پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کے لیے شہید اسلام آیۃ اللہ سید محمد باقر الصدر اور خود آیت اللہ خمینی کے شاگردوں میں آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری، علامہ شیخ حسین علی منتظری، آیۃ اللہ شیخ حسین مظاہری، جمہوری اسلامی ایران کے سابق صدر

ہاشمی رفسنجانی اور موجودہ رہبرِ انقلاب آیت اللہ خامنہ ای وغیرہ نے بے حد مفید بحثیں شائع فرمائیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب کا جائزہ لینا اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ضرورت اور گنجائش کے مطابق چند نکات کے ضمن میں اصل نظریۂ ولایتِ فقیہ کی وضاحت کچھ اس طرح کی جا سکتی ہے:

۱- تمام انسان بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کے مخلوق اور اسی کے بندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں آزاد اور فاعلِ مختار خلق فرمایا ہے۔ چنانچہ کسی بھی انسان پر کسی بھی دوسرے انسان یا ''چند انسانوں'' کے کسی مجموعے یا کسی بھی دوسری شے کو کوئی تسلط یا اقتدار حاصل نہیں۔ بلکہ ہر طرح کا تسلط اور اقتدار مخصوص ہے صرف ذات باری تعالیٰ عزّ اسمہ' وجل شانہ کے لیے اور وہی تمام ثانوی اختیارات کا مصدر ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تمام انبیائے کرام نے اسی نظریہ کو پیش کیا جو کلمۂ ''لا الٰہ الا اللہ'' کے موجز ترین ''متن'' میں پوشیدہ اور عیاں ہے!

۲- جس طرح تمام تسلط اور اقتدار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ اسی طرح کائنات کی تمام چیزوں کی ملکیت و مالکیت بھی حقیقۃً صرف اور صرف اسی ذات پاک کے لیے ہے اور بس!

''لا ولایة بالاصل الا لله تعالیٰ''

۳- بے شک ''انسان'' کو اللہ تعالیٰ کی خلافت سونپی گئی ہے اور اسے اس پوری کائنات پر تصرُّف اور اقتدار و تسلط عطا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا اولین انحصار اللہ تعالیٰ کا پیغام اور اس کے احکام کے حامل اس کے معصوم نمائندوں- انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ میں ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانی

وَالْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍ

وَالْخَلَفِ الْهَادِي الْمَهْدِيِّ

حُجَجِکَ عَلیٰ عِبادِکَ

وَاُمَنائِکَ فِي بِلادِکَ

صَلاةً "کَثِیرَةً" دائِمَةً

اَللّٰهُمَّ

وَصَلِّ عَلیٰ وَلِيِّ اَمْرِکَ الْقائِمِ الْمُؤَمَّلِ

وَالْعَدْلِ الْمُنْتَظَرِ

وَحُفَّهُ بِمَلائِکَتِکَ الْمُقَرَّبِینَ

وَأَیِّدْهُ بِرُوحِ الْقُدْسِ یا رَبَّ الْعالَمِینَ

اَللّٰهُمَّ

اجْعَلْهُ الدَّاعِيَ اِلیٰ کِتابِکَ

وَالْقائِمَ بِدِیْنِکَ

اِسْتَخْلِفْهُ فِي الْاَرْضِ

کَما اسْتَخْلَفْتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِ

مَکِّنْ لَهُ دِیْنَهُ

الَّذِي ارْتَضَیْتَهُ لَهُ

اَبْدِلْهُ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِ أَمْناً

یَعْبُدُکَ وَلایُشْرِکُ بِکَ شَیْئاً

معاشرے کے تمام نظم ونسق کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت کسی بھی طرح چھپائی نہیں جاسکتی کہ تمام انبیاء ومرسلین اللہ تعالیٰ کی حکومت یعنی صرف اور صرف احکام الٰہیہ کے نفوذ ونفاذ ہی کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ مکمل اور ظاہری اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جیسے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ وغیرہ۔ اور کچھ اپنی عمر کے بیشتر حصہ میں اس کے لیے جد وجہد کرتے رہے جیسے حضرت موسیٰؑ۔ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دَور وہ ہے کہ آپ نے ''مدینہ منورہ'' میں اس ''حکومت الٰہیہ'' کو اس امتیاز کے ساتھ قائم فرمایا جس کی مثال کسی بھی نبی کے یہاں نہیں مل سکتی۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے اَوصیاء برحق اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام اسی ''حکومت الٰہیہ'' کے نمائندے رہے اور جس کو جب جہاں جتنا بھی موقع ملا، قانون الٰہی کے نفاذ ہی میں کوشاں رہا۔ یہاں تک کہ ائمہ اہل بیت میں سے بارہویں امام حضرت محمد مہدی ابن امام حسن العسکری علیہما السلام نے دنیا سے روپوشی اختیار فرمائی۔ اور یہ ایک عام اصول مقرر فرمایا کہ اب تک تو شریعت اور قانونِ الٰہی کے متعلق تمام سوالات ہم براہِ راست بتانے کے ذمہ دار تھے ــ لیکن!

''اب جو بھی تازہ واقعات پیش آئیں اُن میں اُن کی طرف رجوع کیا جائے جو ہماری حدیثوں کو بیان کرنے والے ہیں، وہ ہماری طرف سے تم پر حجت ہیں اور ہم اللہ کی حجت ہیں!''

''اِسی ''نص'' یا ''توقیع'' (فرمان) کی بناء پر فقہائے اُمت کو امام یا وصی رسول اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ''نیابت عامہ'' [نہ کہ نیابت

خاصہ] حاصل ہوتی ہے۔ اور ''حدیث رسول'' کا حامل و عالم، فقیہِ اسلام، امت کے تمام امور کا مسئول اور مراقب (رہبر اور نگراں) ہوتا ہے۔''

۴- وہ ایک ''فرد'' یا متعدد افراد جو اس درجہ کے فقیہ ہوں کہ انہیں ''نیابت عامہ'' کے منصب کا اہل مان لیا گیا ہو۔ اور وہ اشخاص و افراد جنہیں دیگر تمام افراد ملّت نے اپنی نمائندگی دے کر اپنے امور کے نظم و نسق کا ''وکیل'' بنایا ہو۔ ''قاعدۂ شوریٰ'' کے تحت باہم مل کر اپنے زمانے کے سب سے بڑے ماہرِ قانونِ الٰہی کی نگرانی میں حکومت قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں ـــــ اس طرح معاشرے پر کسی ایک انسان کی بھی حکومت کا تصور نہیں ابھرتا، بلکہ اصلی حکومت اللہ تعالیٰ یعنی اس کے قوانین کی ہوتی ہے۔ جس کے زیرِ سایہ تمام افرادِ ملت یا افرادِ انسانی برابر کی آزادی کے حق دار اور مساویانہ حقوق سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ چونکہ اس میں ''ماہرِ قانونِ الٰہی''، یعنی ''فقیہ'' کی حیثیت اور اس کا رول سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس لیے اس نظریہ کو ''نظریۂ ولایت فقیہ'' یا (Theory of the final authority of the Jurist) کا عنوان ہی دیا جا سکتا ہے''۔

یہ ہے ''نظریۂ ولایت فقیہ'' کی عمومیت پسندانہ توضیح یا ایک عمومی تعبیر (عمومی اس معنی میں کہ غیر متخصصانہ اور فقہ و قانون کی مخصوص اصطلاحوں سے عاری ہے) جسے ایک عام اور معمولی یا سطحی علم اور اطلاع رکھنے والے بھی سمجھ سکتے ہیں۔

یہ نکات تو ''حکومتِ الٰہیہ'' یا سیاستِ دینی کی مَرکزیت یا مشہور اصطلاح کے مطابق نظریۂ ولایتِ فقیہ کی نظریاتی بنیاد کی وضاحت میں عرض کیے گئے۔ دعائے افتتاح کے محولہ بالا فقرے میں ربّ کریم سے جو التجا کی گئی ہے، جس

''دولتِ کریمہ'' کا تقاضا کیا گیا ہے اور اس کے جن خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے غور کیجیے تو وہ اِس نظریہ کی عَملی تطبیق کے بہترین ثمرات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اب اس مخصوص بحث یعنی بحثِ ولایتِ فقیہ سے قطعِ نظر کرتے ہوئے دعائے افتتاح کے زیرِ غور جملوں اور ان سے متصل فقروں کو پڑھیے اور ان کی معنویت کو سمجھنے کی مزید کوشش کیجیے۔ اِن میں سے ہر فقرہ لسانی اور معنوی دونوں طرح کی خصوصیات کے لحاظ سے خاصا اہم اور توجہ طلب ہے۔

''اللھم المم بہ شعثنا'' کے جملے سے وانصرنا بہ علیٰ عدوّک وعدونا اِلٰہ الحقِ آمین'' تک ایک ایک جملہ نظمِ معاشرۂ انسانی کے ایک ایک لازمی تقاضے کی نشاندہی کرتا ہے اور ایک مدینۂ فاضلہ، مَدنیۃ السلام، مَدنیۃ الاسلام ایک شہرِ امن وعافیت یا فردوسِ تمدن انسانی کی ضرورتوں کو پیش کرتا ہے اور رب کریم سے اِن ضرورتوں کو اُس کے وَلی، حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ذریعہ سے پورا کردینے کی درخواست پر مشتمل ہے۔ صرف انہیں جملوں کی مفصل شرح ایک مکمل دفتر چاہتی ہے لیکن اَب اِس دفتر میں اس کی سمائی نہیں ہے۔ توفیق رَفیق ہوئی تو یہ جملے اور اس کے علاوہ اور بہت سے تشنۂ وضاحت جملے اور نکتے جو شرحِ دعائے افتتاح کے اِس ''دورے'' میں رہ گئے ہیں کسی آئندہ دورۂ بحث میں شامل کیے جائیں گے۔ ٣٦٢

☆☆☆☆☆

(۲۹)

نالۂ ہجر ونوحۂ فرقت

یا

ماتمِ ہجرِ پیغمبرؐ!

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَشْکُوْا اِلَیْکَ فَقْدَ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ!

''اے معبود! ہمیں تجھ سے اپنے نبی صلی علیہ وآلہ وسلم کی جدائی کا گِلہ ہے۔''

اِس دعا کا یہ فقرہ اپنے انداز کا بالکل ہی انوکھا فقرہ ہے۔ دوسری متداول دعاؤں میں سے کسی میں اس طرح کا کوئی فقرہ نظر نہیں آتا۔ یہ ایک فقرہ پورا ایک مرثیہ ہے! یہ ہجرِ پیغمبرؐ کا نوحہ ہے!! جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے انتہا محبت ہی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اُن کی جُدائی کا غم ابھی تازہ ہے! اس لحاظ سے یہ فقرہ جذبۂ سوگواری اور فلسفۂ عزاداری پر بھی غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

ائمۂ اہل بیت علیہم السلام نے یادِ خدا میں اشک ریزی کے ساتھ ساتھ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیاء اللہ کے ہجر و فراق میں بھی اشک ریزی اور ماتم گساری کی تعلیم دی ہے، اور اسے بھی روحانی تربیت، تہذیبِ نفس اور سیر و سلوک الی اللہ کا ایک انتہائی مؤثر ذریعہ قرار دیا ہے۔

قرآنِ مجید میں عظمت وجلالِ کبریائی کے تصور سے اور خشوع وخشیت الٰہی سے معبود برحق کے سچے سجدہ گزاروں کی کیفیتوں میں اُن کے ''بہت رونے'' کو زبانِ قدرت نے بہت سراہا ہے۔

﴿...وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ وَیَزِیْدُھُمْ خُشُوْعاً...﴾

(سورۂ اسراء:۱۰۹)

''...اور وہ روتے ہوئے منہ کے بل گر جاتے ہیں اور یہ ان کے خشوع میں اضافہ کا سبب بنتا ہے!''

اسی طرح ''کلامِ الٰہی کو سن کر'' اس کے آگے خشوع وخشیت سے رونے والوں کی ستائش کی گئی ہے:

﴿اِذَا تُتلٰی عَلَیھِمْ آیَاتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوا سُجَّداً وبُکِیّا...﴾

(سورۂ مریم آیت: ۵۸)

''جب ان کے سامنے آیاتِ الٰہی۔''آیاتُ الرحمٰن'' کی تلاوت ہوتی تھی تو وہ سجدے میں گر پڑتے تھے اور روتے تھے!''

قرآنِ مجید میں ایک جگہ خدا کے بعض سرکش بندوں (فرعون اور آلِ فرعون) کی ہلاکت پر زمین وآسمان کے نہ رونے کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ عبرت کی خاطر ہے! جس کا ''مفہوم''[1] بہت واضح ہے کہ اللہ کے نیکوکار بندوں خصوصاً انبیاء، مرسلین، اوصیائے مرسلین اور اولیاء اللہ کی جدائی یا ان کی شہادتوں پر زمین وآسمان اور اہلِ زمین واہلِ آسمان روتے ہیں! اور انہیں رونا چاہیے!!

یہ سورۂ دخان کی ۲۹/ویں آیت ہے:

﴿فَمَا بَکَتْ عَلَیْھِمُ السَّمَاءُ وَالاَرْضُ وَمَا کَانُوا مُنْظَرِیْنَ﴾

''پھر نہ آسمان وزمین نے ان پر گریہ کیا اور نہ وہ مہلت پانے والوں میں سے تھے!''

اِس آیت کے ذیل میں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ارشاداتِ ائمۂ دین علیہم السلام میں یہ صراحت موجود ہے کہ نبیِّ خدا حضرتِ یحیٰؑ کی شہادت پر آسمان سُرخ ہوگیا اور خون کے قطرے گرے! اور سبطِ رسول امامِ حسین علیہ السلام کی شہادت پر بھی آسمان سُرخ ہوگیا۔ یہ تو علامۂ جلال الدین سیوطیؒ نے تفسیر درِّ

[1] یہاں پر ''مفہوم'' صرف لغوی معنیٰ میں استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسے ''اصولِ فقہ'' کی ایک اصطلاح کے طور پر بھی برتا گیا ہے۔

منثور میں درج فرمایا ہے۔ تفسیر مجمع البیان میں یہ ہے کہ حضرت یحیؑ اور حضرت امام حسین علیہما السلام کی شہادتوں پر آسمان نے چالیس روز تک گریہ کیا!

اس مقام پر یہ تذکرہ ضروری ہے کہ نبیِ خاتم، سید المرسلین اور محبوبِ رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اُمّت کو بطورِ خاص اپنے مصائب کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

آپؐ کی یہ حدیث مشہور ہے:

''مَا اُوذِیَ اَحَدٌ مَا اُذِیتُ فِي اللّٰه''

(کسی کو بھی اتنی اذیت نہیں دی گئی جتنی اذیت اللہ کی راہ میں مجھے دی گئی)۔

اِس حدیث کو حافظ ابو نُعیم نے حلیۃ الاولیا میں انس بن مالک سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور اصل حدیث بخاری میں ہے۔

یہ حدیث غور طلب ہے۔ گزشتہ انبیاء میں سے تو کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں آرے سے چیر ڈالا گیا، طرح طرح سے اذیتیں دیکر قتل کیا گیا، سولی پر لٹکایا گیا، اور اسی طرح نہ جانے کتنے واقعات ہیں جو بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں نظر نہیں آتے۔ لیکن آنحضرتؐ کا یہ ارشاد سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی زندگی تنہا نہیں تھی۔ آپؐ کے اہل بیت آپؐ ہی کی زندگی کے تسلسل کی حیثیت رکھتے تھے اور جو جو مصیبتیں ان پر پڑیں وہ سب خود آنحضرتؐ کے لیے انتہائی اذیت ناک مصیبتوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جناب شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی کتاب ''سرُ الشہادتین'' سے بھی اسی نکتہ کا استفادہ ہوتا ہے، اُن کے علاوہ بھی بے شمار علماء، فقہاء، محدثین، عرفاء اور اولیائے اُمت رضوان اللہ تعالیٰ

علیہم اجمعین نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر پیغمبرؐ و اہلبیتِ پیغمبرؑ خصوصاً فرزندِ رسولؐ حضرت امام حسین علیہ السلام کے دلدوز مصائب اور آپ کی شہادت کے تعلق سے مراسمِ عزاداری کو قائم فرمایا ہے۔

آنحضرتؐ کا یہ ارشاد بھی بے حد اہم ہے جسے ابوالعباس المبرّد نے ''الکامل''(ج ۳ ص ۹۱) میں نقل کیا ہے:

'تَعزَّوا عَنْ مَصَائِبِکُمْ بِیْ'

''تم اپنے مصائب کا پُرسہ مجھے دیا کرو''

اس ارشادِ پیغمبرؐ سے عام افرادِ امت کے لیے بھی یہ اندازہ کرلینا کچھ مشکل نہیں ہے کہ آنحضرتؐ کے دل میں اُن کے لیے کتنی شفقت پائی جاتی تھی، اور ساتھ ہی یہ فکر بھی پیدا ہوتی ہے کہ جب عام افرادِ امت کے مصائب پر آنحضرتؐ کو تسلیت پیش کی جاسکتی ہے تو پھر خود آنحضرتؐ کے جگر پاروں، آپ کے اہلبیت اور خصوصاً آپ کے فرزندوں حسن اور حسین علیہما السلام کے مصائب پر آپ کی خدمت اقدس میں تعزیت کا کس قدر اہتمام کیا جانا چاہیے!

مُبرد کی نقل کردہ حدیث کی تائید اور توضیح میں رئیسِ مذہبِ مالکیہ امام مالک کی مشہور کتاب ''موطا'' کی ایک حدیث بھی قابلِ ذکر ہے۔

کتاب الجنائز، باب جامع الحِسبۃ فی المصیبۃ میں وارد ہے:

عن عبدالرحمن بن القاسم اَنَّ رسُولَ اللہِ صلی اللہُ علیہِ وسلم قالَ:

''لِیُعَزِّیَ المُسلِمِیْنَ فِي مَصَابِیهِمُ المصیبةُ بِي''.

''عبدالرحمٰن بن قاسم سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ

(وآلہ) وسلم نے:

مسلمانوں کو اپنی مصیبتوں میں میرے مصائب کا تذکرہ کر کے تعزیت کرنی چاہیے۔''

☆☆☆

اس مقام پر خود آنحضرتؐ کی وفات پر آپؐ کی پارۂ جان وتن، خنکیِ چشمِ رحمت حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کے رنج ومحن، غم والم، تاثراتِ غم اور اُس یادگار مرثیہ کا ذکر نہ کرنا بجائے خود ایک ستم ہوگا جس کی تاریخ اور ادب کی دنیا میں ایک لازوال گونج ہے۔

اَحادیث اور مَرویّات کے مشہور قامُوسی مجموعے ''کنز العُمّال'' میں حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ علیہ السلام سے اور خادمِ رسولؐ انس سے روایتیں کی گئیں ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِس دنیائے دنی اور دارِ فانی کی طرف سے اپنی آنکھیں موڑ لیں تو آپؐ کی ''تنہا یادگار'' سیدۂ کونین حضرت فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا بے قرار ہو ہو کر یہ جملے فرماتی تھیں:

''وا ابتاہ مِنْ رَبہ مَا اُدْناہ

وا أبتاہ جنان الخلد مأواہ

وا ابتاہ ربُّہ یُکْرِمُہٗ اذا اُدْنَاہ

الرَّب والرسل تُسَلِّمُ عَلَیہِ حتّی تَلْقَاہ!''

میں ان فِقروں کا ترجمہ کر کے اِن کے اصلی تاثُّر کو ضایع یا کم نہیں کرنا چاہتا۔

ہاں! خادم ودربانِ رسولؐ انس نے حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کا ایک ایسا

جملہ بھی نقل کیا ہے جسے جتنی بار پڑھتا ہوں، کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے، دل کٹ کر رہ جاتا ہے اور آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دفن کر کے پلٹے تو جناب فاطمہؑ نے فرمایا:

''كَيْفَ طَابَتْ اَنْفُسُكُمْ أَنْ تَحْثُوا عَلىٰ رَسُولِ اللّٰهِ التُّرابَ!''

''کیسے تمہارے دلوں نے رسول اللہ پر مٹی ڈالنا گوارا کیا!''

(کنز العمال ج ۷ ص ۲۶۱)

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی زبانی مرثیہ پیغمبرؐ کے اشعار بھی تاریخ کی کتابوں میں جس قدر شہرت رکھتے ہیں کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

علامہ بہائی نے کشکول (ج ۳ ص ۲۴) میں ''المعتبر'' کے حوالے سے نقل کیا ہے: اِنَّ فَاطِمَةَ عَلَيْهَا السَّلام قَبَضَتْ مِنْ تُرَابِ قَبْرِ النَّبِيِّ فوضعتهاعَلىٰ عَيْنِهَا فَقالَتْ:

مَاذَا عَلىٰ مَنْ شَمَّ تُرْبَةَ اَحْمَدَ
اَنْ لَا يَشُمَّ مَدَى الزَّمَانِ غَوالِيَا
صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّهَا
صُبَّتْ عَلىٰ الاَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا!

فاطمہ زہرا علیہا السلام نے قبرِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاک کو اٹھا کر اپنی آنکھوں پر رکھا اور فرمایا:

جس نے تربتِ احمدؐ کی نکہت پالی ہو اگر وہ تمام عرصۂ دہر کوئی اور خوشبو نہ بھی سونگھے تو کیا ہے! (مراد یہ ہے کہ پیغمبرؐ کو سپردِ خاک کردینے کے بعد اب کوئی زیب وزینت کا محل باقی نہیں رہا! بلکہ اب تا قیامت سوگواری ہی زیبا ہے!)

حسن بن علی (امام عسکری) (علیہ السلام)

اور فرزند ہادیِ مہدی (امام زمانہ، امام مہدیِ منتظرؑ) پر

جو تیرے بندوں پر تیری ''حجتیں''

اور تیرے شہروں میں تیرے امانت دار ہیں!

بہت زیادہ اور مدام رحمت!

اے معبود!

رحمت فرما اپنے ''ذمہ دارِ نظام'' پر (جو اس وقت اپنے منصب پر) قائم (کارفرما،

حاجت روا) اور امید گاہِ خلائق ہیں!

وہی عادلِ زمانہ جن کا انتظار ہو رہا ہے!!

اور انہیں مقرب فرشتوں کی جھرمٹ میں رکھ

اور ''روح القدس'' کے ذریعہ ان کی تائید فرما! اے تمام جہانوں کے پروردگار!

اے معبود!

انہیں اپنی کتاب کی طرف بلانے والا،

اور اپنے دین کے ساتھ ''قیام'' کرنے والا قرار دے!

اور انہیں زمین پر اسی طرح خلافت عطا فرما!

جس طرح ان سے پہلے والوں کو عطا فرمائی،

اور ان کے لیے اسی دین کو مقتدر بنا دے

جس کو تو نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے!

تو ان کے خوف کو امن سے بدل دے

کہ وہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں! اور کسی شے کو وہ تیرا شریک نہیں بناتے!!

اور فرمایا:

میرے بابا، پیغمبرِ خدا کے گزر جانے سے مجھ پر وہ مصائب آپڑے ہیں کہ اگر دنوں پر پڑتے تو وہ راتوں میں بدل جاتے!

در این بلا بجائے من ار روزگار بود

روزِ سپید او شبِ تاریک می نمود

☆☆☆

کنز العمال اور اس کے علاوہ احادیث کے متعدد مجموعوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر حضرتِ خضر علیہ السلام کا ''اہلبیت'' کی تعزیت کے لیے آنا اور ان کے تعزیتی کلمات بھی نقل کیے گیے ہیں۔ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

''فلمّا قُبِضَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیهِ وآلِهِ وسَلَّمْ وَجائتِ التَعْزِيَةُ جاءَ آتٍ يَسْمَعُونَ حِسَهُ وَلا يَرَوْنَ شَخْصَهُ فَقال:

''السَّلامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، فِي اللّٰهِ عَزاء مِنْ كُلِّ مُصيبةٍ وخَلفٌ مِنْ كُلِّ هالِكٍ ودَرْكٌ مِنْ كُلِّ ما فاتَ، فَبِاللّٰهِ ثِقُوا، وَاِيّاهُ فارْجُوا فَاِنَّ الْمَحْرُومَ مَحْرُومُ الثَّوابِ وَاِنَّ الْمَصائِبَ مَنْ حرمَ الثَّواب والسَّلامُ عَلَيْكُمْ!''

قالَ عَلِيّ: هَلْ تَدْرُونَ مَنْ هٰذا؟ قالُوا: لا! قالَ: هٰذا الخَضِرُ.

العدوانی وابن سعد و البیھقی فی الدلائل (کنز العمال ج ۷ ح ۱۸۷۸)

آنخضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اہلبیتؑ نے کتنا اور کب تک غم منایا اس کا ایک اندازہ وصیِ رسول امیر المومنین علی مرتضی علیہ السلام کے اس

مکالمہ سے بھی ہوتا ہے جو علامہ شریف رضی نے نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے:

''قِيلَ لَهُ (عَلَيْهِ السَّلَامُ): لَوْ غَيَّرْتَ شَيْبَكَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ!

فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: الْخِضَابُ زِينَةٌ وَ نَحْنُ قَوْمٌ فِي مُصِيبَةٍ.

يُرِيدُ وَفَاةَ رَسُولِ اللّٰهِ صلى الله عليه وآله وسلم!

(نہج البلاغہ نسخہ صبحی صالح، ص ۵۵۳)

آپؑ سے کہا گیا: اے امیر المومنین! آپ خضاب لگاتے تو کیا اچھا ہوتا!

آپ نے فرمایا: خضاب زینت ہے اور ہم تو مصیبت میں ہیں!

مصیبت سے آپؑ کی مراد وفاتِ پیغمبرؐ تھی!

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے عمل اور آپؑ کے اِس ارشاد سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ بیتِ اطہارؑ نے کتنے دنوں تک آنحضرتؐ کے وفات پر سوگواری کے مراسم برپا رکھے (اس لیے کہ جس وقت آنحضرتؐ کی وفات ہوئی تھی حضرت علیؑ کی عمر مبارک صرف ۳۳ ربرس تھی اور آپ کے محاسنِ مبارک سفید نہیں ہوئے تھے!)۔

وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبیؐ یا امام کی وفات پر ترکِ زینت ولذّات مستحسن ہے!

ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام نے ذکرِ پیغمبرؐ کو جاری، یادِ پیغمبرؐ کو باقی، اور آپ کے ہجر وفراق کے غم کو زندہ اور آپؐ کی وفات سے فیضِ ربّانی اور سلسلۂ وحیِ الٰہی کے منقطع ہوجانے کے اَلَم کو پائندہ رکھنے کے لیے، تاکہ امتِ مسلمہ آپ کی محبت اور آپ کے قرب کے احساس سے بے گانہ نہ ہوجائے، آپؐ کے روزِ وفات کو ہمیشہ کے لیے روزِ غم قرار دیا ہے، اور اس روز آپؐ کی زیارت کرنے کی تاکید

فرمائی ہے۔ چاہے نزدیک سے ہو، چاہے دور سے، جس سے جس طرح بھی ممکن ہو۔ زیارت کے کلمات میں بھی ایسا درد وغم بھرا ہوا ہے کہ زیارت پڑھتے وقت کسی عاشقِ رسولؐ کی آنکھیں خشک نہیں رہ سکتیں!

☆☆☆☆☆

دعائے افتتاح کے اس کے بعد کے فقروں میں فرزندِ رسول، مہدیِ آلِ بتول، مہدیِ موعود و مہدیِ برحق، حضرت ولیِ عصر، امام آخر، وصیِ خاتم، تتمہ وخلاصۂ آلِ عصمت حضرت حجت - امام وخلیفہ وسلطان وولیِ قائم حضرتِ ابوالقاسم م ح م د بن الحسن.....ابن حسین.....ابن علی بن ابی طالب علیہم السلام کی غیبت کا گلہ ہے۔ دشمنوں کی کثرت، اپنی قلت، زمانے کی آزمائشوں کی شدّت اور زمانے بھر کی ہم پر زور آزمائیوں کا تذکرہ ہے اور حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آل پاک پر درود وسلام کے صدقہ میں خدا سے مدد، فتح ونصرت، کشائشِ حالات، دفعِ ضرر، اقتدارِ حق، ظہورِ حجت، سایۂ رحمت اور لباسِ عافیت کی دعا ہے۔ اِن کلمات کے ذیل میں بھی بہت سے مطالب اور نکات عرض کرنے کی گنجائش باقی ہے لیکن اِس کتاب کے معینہ سطور وصفحات ختم ہو گئے اس لیے گفتگو یہیں پر ناتمام چھوڑتے ہیں۔

کام کو بس ربُّ الارباب ہی اِتمام تک پہونچانے والا ہے!

سُبحانَ رَبِکَ رَبِّ العِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُونَ

وَسَلامٌ عَلَی المُرسَلِینَ

وَالحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِین.

وَصَلَّی اللّٰہ عَلیٰ حَبِیبِہِ المُصطَفیٰ

وَعَلیٰ عِترَتِہِ وَسَلَّم تَسلِیماً کَثِیراً

تشکر و اعتذار

دعائے افتتاح کی شرح سب سے پہلے بعض طلبہ کے سامنے بصورتِ درس پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد اسے مجلسی تقاضوں کے تحت کچھ اضافوں کے ساتھ بلیک برن (برطانیہ) میں شبہائے ماہِ مبارکِ رمضان کی مجلسوں میں پیش کیا گیا، اور جو کچھ بطورِ درس و بحث بیان کیا گیا یا مختلف مجالس میں عرض کیا گیا اسے وقتاً فوقتاً تحریر بھی کیا جاتا رہا، اسی لیے اس کتاب میں کہیں تقریرِ درس کا سا انداز پایا جاتا ہے اور کہیں اس سے ذرا مختلف اسلوبِ عرض وطرزِ نگارش ہے۔

جس وقت یہ شرح بیان کی گئی تھی اور لکھی گئی تھی اس وقت تک اس دعا کی کوئی دوسری شرح سامنے نہیں آئی تھی، لیکن چونکہ اس کی اشاعت کی نوبت اب آئی ہے، اِس عرصہ میں ایک شرح مولفہ جناب آیۃ اللہ محمد رضا مہدوی کنی منظرِ عام پر آچکی ہے اس لیے پہلے خیال ہوا کہ اسے شایع ہی نہ کیا جائے، لیکن قدرے تامل کے بعد اندازہ ہوا کہ اس میں جو مطالب پیش کیے گئے وہ اُس کتاب سے بالکل مختلف ہیں اس لیے اس کی اشاعت میں کوئی مضایقہ نہیں ہے۔ اب جو کچھ بھی ہے قارئین کے سامنے ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے لیے برادرِ مکرم (ڈاکٹر) سید رضوان کاظمی (ابن ڈاکٹر سید غلام حیدر کاظمی مرحوم ومغفور) اور محبّ مکرم سید امیر عباس زیدی (فرزندِ جناب ڈاکٹر سید ممتاز حیدر زیدی مرحوم ومغفور) کے گرانقدر عطیات کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے بس میں نہیں ہے۔ دست بدعا ہوں کہ ربّ کریم ان کے توفیقاتِ خیر میں بیش از بیش برکتیں عطا فرمائے۔

اس کتاب کی تحریر وتزئین اور اس کے مسودہ کی قرأت کے لیے عزیزی مولوی فیضان احمدندوی، عزیز مکرم ڈاکٹر عبد السلام صدیقی اور صدیقِ مکرم ڈاکٹر مکتوب الرحمان قاسمی (ایم۔آر۔قاسمی، مئی) صاحبان کا بھی صمیمِ قلب سے ممنون ہوں۔

اردو کے معتبر ادیب شفیقِ معظم جناب غلام حیدر صاحب نقوی کا میں کسی بھی طرح شکریہ ادا نہیں کرسکتا جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود پریس جانے سے پہلے اس کتاب کو از اول تا آخر پڑھ کر کتابت کی بعض اہم غلطیوں کی نشاندہی فرمائی۔

ربِّ کریم سے بتوسلِ حضراتِ محمد وآلِ محمد علیہم الصلاۃ والسلام اس ناچیز خدمت کی قبولیت کی عاجزانہ درخواست ہے اور بس!

وَمَا تَوفِیقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ وَ بِہٖ اِعْتَصَمْتُ وَبِہٖ اَثِقُ وَ عَلَیْہِ اَتَوَکَّلُ وَاِلَیْہِ اُنِیبُ وصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی حَبِیْبِہِ الْمُصْطَفٰی وَ عَلٰی عِتْرَتِہٖ وَ ذُرِّیَّتِہٖ وَسَلَّمَ کَثِیْراً کَثِیْراً

ناچیز

عقیل الرضوی الغروی عفی عنہ

۳رشعبان المعظم ۱۴۲۵ھ

قطعۂ تاریخِ تالیف

از

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی مسعود رودولوی

دہ ضیا پاشی ''چراغِ راہ'' نے کی ہے کہ بس
جلوہ گر ہے چشمِ ہر سالک میں ہر راہِ فلاح

سب منازل، سب مقامات و مشاہد منکشف
جگمگا اٹھے ہیں متنِ زیست کے گِردو نواح

یہ حقیقت میں ہے نورِ دیدۂ دانشوری
کلکِ علامہ نے روشن کی ہے یہ شمعِ فلاح

اے عقیلِ خاندانِ ہادی(۱) و فتحِ علی(۲)
تیری یہ تصنیف ہے منشورِ ہر خیرو صلاح

اے غَرِی(۳) سے منتسب، اے دین و دانش کے عقیل
آلِ فتح(۴) اللہ کی تاریخ کے نجمِ صَباح

مہدیِ دوراں امامِ عصرؑ کے الفاظ کی
شرح لکھنے کا شرف پایا زہے بختِ نجاح

سالِ شمسی میں لکھی مسعودؔ نے تاریخ طبع
گوہرِ اصلِ کرامت ہے دعائے افتتاح

2003

(۱)(۲)(۴) :یہ مؤلفِ ''چراغِ راہ'' علامہ غروی کے شرفِ نسبی کی طرف اشارہ ہے، علامہ سید عقیل الغروی بن حجۃ الاسلام مولانا سید سبط حسن رضوی بن میر ہادی حسین رضوی بن میر صاحب علی بن میر خوش وقت علی بن میر فتح علی فتح اللہ رضوی نیشاپوری صاحبِ حُسینیہ وبانیِ اوقافِ خیر یہ در اطرافِ بنارس و مرزاپور۔

(۳) :غَرِی نجفِ اشرف کا تاریخی نام ہے، جہاں مولائے کائنات، امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کا مزارِ مقدس ہے۔

فہرست مطالب وموضوعات

۸	توحید	۱۸،۶۵،۸۳،۸۴،//،//،//،//،//،//،//،۸۵،//،//،//،۸۶،۸۷،//،//،//،//،//،//،۸۸،//، ۹۰،۹۱،۹۲،۹۳،۹۷،۱۰۷،۱۰۸،//،//،//،//،//،۱۱۰،//،۱۱۶،۱۱۷،۱۱۸،//،//،//،//،//، ۱۱۹،۱۳۰،۱۵۲،۱۶۳،۱۷۶،۱۸۶،۱۸۸،//،۲۰۵،۲۰۸،۲۱۰،۲۱۳،۲۲۰،۲۶۷، ۲۶۹،۲۷۳،۲۷۵،۳۰۵،۳۱۰،//،//،۳۲۵۔
۹	توحیدِ ذات	۸۴،۸۷،۹۳،۱۹۰،۲۰۵۔
۱۰	توحیدصفات	۹۳،۹۷،۹۸،//،۱۹۰۔
۱۱	توحیدتنزیہی	۱۰۶،//،//،۱۱۰،۱۶۲۔
۱۲	توحیدِ عرفانی	۱۱۷،۱۱۸،
۱۳	توحیدصمدی	۱۸۳۔۲۶۱،۲۸۴،۲۹۰،۲۹۱،۳۰۹،۳۲۰،۳۶۰،۳۶۵۔
۱۴	توحیدِ افعال	۹۳،۹۷،۹۸،۱۹۰۔
۱۵	تقیہ	۳۵۲،//،//،//،۳۵۳،//،۳۵۸۔
۱۶	حقیقتِ توحید	۸۵،//،//،۸۷،۹۰،۹۳،۱۰۸،//،۱۶۳،۲۱۰،۲۲۵،۳۲۵،۳۴۳۔
۱۷	حقیقتِ لطف	۶۵۔
۱۸	خاتم الانبیاء	۵۷،//،۲۰۰،۲۲۹،۲۳۷،۲۳۸،۲۴۲،۲۶۸،۲۷۹،۳۱۹،۳۲۵،۳۳۸،//، ۳۳۹،۳۴۱،۳۴۹،۳۶۶۔
۱۹	خاتم الوصیین	۱۵۵،۳۷۲۔
۲۰	خلافت	۵۷،۷۷،۱۸۲،۲۷۰،۳۱۱،//،//،۳۲۵،۳۳۴،//،۳۳۷،۳۳۸،۳۴۳،//،//،//،//، ۳۵۹۔
۲۱	رسول	۷۵،۷۷،۸۶،۹۳،//،۱۱۸،۱۱۹،۱۵۵،۱۹۸،//،۲۰۰،//،۲۰۲،//،//،۲۰۴،۲۱۵، ۲۲۰،۲۲۲،۲۲۷،۲۲۹،//،۲۳۰،۲۳۲،//،۲۳۳،۲۳۸،۲۴۱،۲۴۲،//،۲۴۳،//، ۲۴۶،//،//،۲۴۷،//،//،۲۴۸،//،//،۲۴۹،۲۵۱،۲۵۲،//،//،//،//،۲۵۴،۲۵۵، ۲۵۶،//،//،//،//،//،۲۵۷،//،//،۲۶۰،//،۲۶۱،۲۶۵،۲۶۷،۲۶۸،۲۶۹،۲۷۱، ۲۷۲،//،۲۷۳،۲۷۴،۲۷۵،//،۲۸۰،۲۸۵،//،//،۲۸۶،//،۲۸۹،۲۹۰،//،//، ۲۹۱،۲۹۲،//،۲۹۵،۳۰۰،//،۳۰۱،//،۳۰۹،//،//،//،۳۱۲،۳۱۸،۳۲۰،//،//، ۳۲۵،۳۲۹،//،۳۳۱،۳۳۹،۳۴۲،۳۴۳،۳۴۸،//،۳۵۰،//،//،۳۵۱،//، ۳۵۴،۳۶۰،//،۳۶۱،۳۶۲،۳۶۵،۳۶۷،//،۳۶۸،//،۳۶۹،۳۷۰،//،//،//۔
۲۲	رسالت	۲۲۵،۲۲۶،۲۲۷،//،۲۲۹،//،//،۲۳۸،۲۵۶،۲۹۹،۳۰۷۔

فہرستِ مآخذ و مصادر

اَللّٰهُمَّ

أَعِزَّهُ وَأَعْزِزْ بِهِ

وَانْصُرْهُ وَانْتَصِرْ بِهِ

وَانْصُرْهُ نَصْراً عَزِيْزاً

وَافْتَحْ لَهُ فَتْحاً يَسِيراً

وَاجْعَلْ لَهُ مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَاناً نَصِيراً

اَللّٰهُمَّ

اَظْهِرْ بِهِ دِيْنَكَ وَسُنَّةَ نَبِيِّكَ حَتّٰى لاٰ يَسْتَخْفِي

بِشَيْئٍ مِنَ الْحَقِّ مَخَافَةَ اَحَدٍ مِنَ الْخَلْقِ

اَللّٰهُمَّ

اِنّٰا نَرْغَبُ اِلَيْكَ فِي دَوْلَةٍ كَرِيْمَةٍ

تُعِزُّ بِهٰا الْاِسْلاٰمَ وَأَهْلَهُ

وَتُذِلُّ بِهٰا النِّفٰاقَ وَ اَهْلَهُ

وَتَجْعَلُنٰا فِيْهٰامِنَ الدُّعٰاةِ اِلىٰ طٰاعَتِكَ وَالْقٰادَةِ اِلىٰ سَبِيْلِكَ

وَتَرْزُقُنٰابِهٰاكَرٰامَةَ الدُّنْيٰا وَالآخِرَةِ

اَللّٰهُمَّ

مٰاعَرَّفْتَنٰا مِنَ الْحَقِّ فَحَمِّلْنٰاهُ

وَمٰا قَصُرْنٰاعَنْهُ فَبَلِّغْنٰاهُ

۱۵	القول المختصر فی علامات المہدی المنتظر	۳۲۳۔
۱۶	القرآن الکریم (ترجمہ)	۳۵۴۔
۱۷	البیان فی اخبار صاحب الزمان	۳۲۳۔
۱۸	الرسالۃ الذہبیہ	۳۱۳۔
۱۹	اسد الغابۃ	۲۸۰
۲۰	اصابہ	۲۸۰۔
۲۱	التنقیح	۳۰۵۔
۲۲	الفقہ	۳۰۵۔
۲۳	الاتقان فی علوم القرآن	۳۴۵۔
۲۴	اسرارِ حکم	۳۳۴۔
۲۵	بحار الانوار	۴۹،//،۵۰،//،۵۱،۵۲،//۔
۲۶	توریت	۲۱۴،۲۸۹،//،۳۰۱۔
۲۷	تفسیر مجمع البیان	۳۶۶۔
۲۸	تجرید الاعتقاد	۶۶،//،۹۸،۱۵۸،//۔
۲۹	تمیز الطیب من الخبیث فیما یدور علی السنۃ الناس من الحدیث	۲۶۴۔
۳۰	تذکرہ	۲۹۹۔
۳۱	تفسیر ابو حمزہ ثمالی	۲۴۴۔
۳۲	تبصرۃ المتعلمین	۳۰۵۔
۳۳	تحریر الوسیلۃ	۳۰۵۔
۳۴	تاریخ ابو الفداء	۲۵۲۔
۳۵	جامع الرواۃ نجاشی	۴۸۔
۳۶	حلیۃ الاولیاء	۳۶۶۔
۳۷	دقائق العربیہ	۳۱۵۔

۳۸	رسالۂ حقوق	۲۹۶، //_
۳۹	رسالۂ صبّان	۲۶۱_
۴۰	ریاض	۳۰۵_
۴۱	زادالمعاد	۵۰، //، ۵۱، ۵۲_
۴۲	سنن ترمذی	۲۵۱، ۲۵۸، ۲۷۴_
۴۳	شرح لمعہ	۳۰۵_
۴۴	شرائع الاسلام	۳۰۵_
۴۵	شرح جوشنِ کبیر	۵۶، //_
	صحیفۂ سجادیہ	۲۹۶_
	صحیح بخاری	۲۵۸، ۲۶۸، ۲۸۸، ۳۳۱، ۳۶۶_
	صحیح مسلم	۲۸۸، //_
	صحیفۂ کاملہ	۲۹۶_
	طبقات ابن سعد	۲۸۰_
	عیون اخبار الرضا	۳۱۳_
	عروۃ الوثقیٰ	۳۰۵_
	فرائدالسمطین	۲۸۹، ۳۲۰، //، ۳۳۱_
	فضائل وسیر چہاردہ معصومین	۲۴۴_
	فرہنگِ آمرہ	۱۴۶
	فاطمہ من المہدالی اللحد	۲۵۴_
۵	کشوری	۱۴۶
۶	کشف الغمہ	۸۸_
	کشکول	۱۲۰، ۱۲۱، //، ۲۰۱، //، ۲۴۵، ۲۵۰، //، ۲۸۹، //، ۳۳۹، //، ۳۴۰، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۶۹_
	کفایۃ الطالب	۲۹۲، //_
	کلمۃ الامام المہدی	۴۸_

	کنز العمال	۲۸۰،۳۶۸،۳۶۹،۳۷۰،//،۔
	گلشن زار	۱۰۰۔
	لمعہ	۳۰۵۔
	معجم رجال الحدیث	۴۸۔
	مفاتیح الجنات	۵۱۔
۷	مہذب اللغات	۱۴۶۔
۹	مفاتیح الجنان	۵۲،//۔
۱۱	موسوعة الامام الصادق	۲۰۴۔
۱۴	مجمع کبیر	۲۷۵۔
۱۵	معانی الاخبار	۱۱۸۔
۱۷	مجمع البحرین طریحی	۱۸۷،۳۵۲
۲۰	موطا	۳۶۷۔
	منہاج الصالحین	۳۰۵۔
	مصباح الفقیہ	۳۰۵۔
	مستمسک	۳۰۵۔
	مکاسب	۳۰۵۔
	نہج البلاغہ	۵۸،۷۶،//،۱۱۶،//،۱۸۸،۲۴۴،۲۴۵،۳۵۲،۳۷۱۔
	نور الابصار	۲۶۱۔
۲۲	وسائل الشیعہ	۴۸۔
۲۵	وظائف الشیعہ	۴۸۔
۲۶	وسیلة الدارین فی انصار الحسین	۲۷۸،۲۷۹۔
۴۱	ینابیع المودة	۲۹۱۔

The actual price of the book is that you read this book carefully with affection and concern for your own self while the material price of it is Rs. 200/= only.

The sale proceeds will be untilised for the services offered by the *"Safina Charitable Hospital*

&

Research Centre ".

Rizwan Kazmi.

Ameer Abbass.

CHERAGH-E-RÃH

EXEGESIS OF DUÃ-E-IFTETÃH

VOL. 1.

By :

ALLAMA
SAYYID AQEEL ALGHARVI

Published by :

MAKTABA-E-KÃINÃT. DELHI

2004

Price : Rs. 200/00

CHERAGH-E-RÃH

EXEGESIS OF DUÃ-E-IFTETÃH

VOL-I

SAYYID
AQEEL
ALGHARVI



MAKTABA-E-KÃINÃT, DELHI

اے معبود!

ان کی عزت رکھ لے اور انہیں کے ذریعہ عزتیں عطا کر!

انہیں نصرت عطا فرما اور انہیں کے ذریعہ نصرتیں عطا کر!

اور انہیں ایسی نصرت عطا کر جو پرشکوہ ترین نصرت ہو!

اور انہیں ایسی فتح عطا کر جو سہل ترین فتح ہو!

اور ان کو اپنی جانب سے کامیاب ترین اقتدار عطا فرما!

اے معبود!

اپنے دین اور اپنے نبی کی سنت کو ان کے ذریعہ سے اس طرح ظاہر فرما کہ پھر خلق میں سے کسی کے خوف سے کوئی بھی شیٔ چھپائی نہ پڑے

اے معبود!

ہم تجھ سے وہ باشرف حکومت چاہتے ہیں

جس کے ذریعہ تو اسلام اور اہل اسلام کو عزت عطا فرمائے

اور جس کے ذریعہ تو نفاق اور اہل نفاق کو ذلیل کرے

اور جس (حکومت) میں تو ہمیں اپنی اطاعت کی طرف بلانے والوں میں اور اپنے راستے کی طرف رہنمائی کرنے والوں میں قرار دے

اور جس کے ذریعہ تو ہم کو دنیا و آخرت کی بزرگی عطا فرمائے!!

اے معبود!

جتنا حق تو نے ہمیں پہچنوایا ہے، اتنی سکت دے

اور جو ہم جاننے سے قاصر رہ گئے ہیں اس تک رسائی فرما!

اَللّٰهُمَّ

اَلْمُمْ بِهِ شَعَثَنَا

وَاشْعَبْ بِهِ صَدْعَنَا

وَارْتُقْ بِهِ فَتْقَنَا

وَكَثِّرْ بِهِ قِلَّتَنَا

وَأَعْزِزْ بِهِ ذِلَّتَنَا

وَأَغْنِ بِهِ عَائِلَنَا

وَاقْضِ بِهِ عَنْ مُغْرَمِنَا

وَاجْبُرْ بِهِ فَقْرَنَا

وَسُدَّ بِهِ خَلَّتَنَا

وَيَسِّرْ بِهِ عُسْرَنَا

وَأَنْجِحْ بِهِ طَلِبَتَنَا

وَأَنْجِزْ بِهِ مَوَاعِيدَنَا

وَاسْتَجِبْ بِهِ دَعْوَتَنَا

وَأَعْطِنَا بِهِ سُؤْلَنَا

وَبَلِّغْنَا بِهِ مِنَ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ آمَالَنَا

وَأَعْطِنَا بِهِ فَوْقَ رَغْبَتِنَا

يَاخَيْرَ الْمَسْؤُولِيْنَ

وَأَوْسَعَ الْمُعْطِينَ

اشْفِ بِهِ صُدُوْرَنَا

اے معبود!

ان کے ذریعہ سے ہمیں ایک لڑی میں پرو دے!

ہماری بکھری ٹکڑیوں کو جمع کر دے

ہماری فرقت کو قربت سے بدل دے

انہیں کے ذریعہ سے ہماری کمی کو کثرت میں بدل دے

انہیں کے ذریعہ سے ہماری ذلت کو عزت سے بدل دے

انہیں کے ذریعہ سے ہمارے مفلسوں کو تونگر بنا دے

انہیں کے ذریعہ سے ہمارے قرضداروں کی ادئیگی فرما دے

انہیں کے ذریعہ سے ہماری ناداری کی تلافی کر دے

انہیں کے ذریعہ سے ہماری حاجتوں کو پورا کر دے

انہیں کے ذریعہ سے ہماری دشواریوں کو سہل بنا دے

انہیں کے ذریعہ سے ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب فرما

انہیں کے ذریعہ سے ہمارے وعدوں کی ایفا فرما

انہیں کے وسیلے سے ہماری دعاؤں کو قبول فرما

انہیں کے وسیلے سے ہمارے سوال پورے کر دے

انہیں کے وسیلے سے ہماری تمام دنیا و آخرت کی آرزوئیں برلا

اور ان کے طفیل میں ہمیں ہماری امید سے سوا دے

اے بہترین سوال پورا کرنے والے

اے سب سے زیادہ عطا کرنے والے

ان کے ذریعہ ہمارے سینوں کو سکون عطا فرما

وَأَذْهِبْ بِهِ غَيْضَ قُلُوْبِنا

وَاهْدِنابِهِ لِمَااخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِکَ

اِنَّکَ تَهْدِي مَنْ تَشاءُ اِلیٰ صِراطٍ مُّسْتَقِيمٍ

وَانْصُرْنا بِهِ عَلیٰ عَدُوِّکَ وَعَدُوِّنا

اِلٰهَ الْحَقِّ آمِينَ!

اللّٰهُمَّ اِنّانَشْکُواِلَيْکَ فَقْدَنَبِيِّنا صَلَوٰتُکَ عَلَيْهِ وَ آلِهِ

وَغَيْبَةَ وَلِيِّنا

وَكَثْرَةَ عَدُوِّنا وَقِلَّةَ عَدَدِنا

وَشِدَّةَ الْفِتَنِ بِنا

وَتَظاهُرَ الزَّمانِ عَلَيْنا

فَصَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَ آلِهِ

وَاَعِنّاعَلیٰ ذٰلِکَ

بِفَتْحٍ مِنْکَ تُعَجِّلُهُ

وَبِضُرٍّ تَكْشِفُهُ

وَنَصْرٍ تُعِزُّهُ

وَسُلْطانِ حَقٍّ تُظْهِرُهُ

وَرَحْمَةٍ مِنْکَ تُجَلِّلُناها

وَعافِيَةٍ مِنْکَ تُلْبِسُناها

بِرَحْمَتِکَ يا أَرْحَمَ الرّاحِمِينَ!!

ہمارے دلوں کا دکھ دور کر دے

اور اپنے اذن سے انہیں کے ذریعہ سے ہماری اس حق کی طرف رہنمائی فرما جس

میں اختلاف ڈال دیا گیا

بیشک تو ہی جس کو چاہے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی فرماتا ہے

اور انہیں کے ذریعہ ہمیں اپنے اور ہمارے دشمن پر نصرت عطا فرما

اے حق کے معبود ہماری دعا قبول فرما

اے معبود! ہمیں تجھ سے اپنے نبیؐ کی جدائی کا گلہ ہے

اور اپنے ولی (اپنے سرپرست، اپنے امام) کی ''غیبت'' کا

اور اپنے دشمنوں کی زیادتی کا اور اپنے افراد کی کمی کا

اور اپنی آزمائشوں کی سختی کا

اور زمانے بھر کے ستم کا

بس رحمت فرما محمدؐ اور ان کی آل پر

اور ہماری مدد فرما

اپنی طرف سے جلد کامیابی دے کر،

نقصان سے بچا کر،

نصرت کا اعزاز دے کر،

حق کے اقتدار کو قائم کر کے

ہمیں اپنی رحمتوں کے سایہ میں لے کر،

ہمیں اپنی جانب سے لباس عافیت پہنا کر،

تجھے قسم ہے تری رحمت کی! اے تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے!!

شرح و بیان

حسنِ استناد یا صحتِ سند

دعائے افتتاح کی اہمیت-سند و متن اور مضمون و معنی ہر لحاظ سے ممتاز اور قابل غور ہے۔

اگر چہ اس کی وہی ایک سند اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ دین و اولیائے معصومین علیہم السلام سے ماثور و منقول ادعیہ واذکار کے سب سے بڑے محقق اور اس عظیم الشان روحانی اور معنوی ادب کے محبّ اور ماہر علامہ سید ابن طاؤسؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الاقبال'' میں درج فرمائی ہے۔ لیکن یہی ایک سند اتنی معتبر ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور سند کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

علامہ ابن طاؤسؒ نے اعمال وادعیۂ ماہِ مبارکِ رمضان کے باب میں ایک مستقل ''فصل'' قائم کرکے ''دعائے افتتاح'' کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

فَصْلٌ فِيمَا نَذْكُرُ مِنَ دُعَاءِ الِافْتِتَاحِ وَغَيْرِهِ مِنَ الدَّعْوَاتِ الَّتِي تَتَكَرَّرُ كل ليلة الىٰ آخر شهر الفلاح، فمن ذلك الدعاء الذى ذَكَرَهُ محمد بن ابى قره باسناده فقال حدثنى ابو الغنائم محمد بن محمدبن محمد بن عبدالله الحسنى قال اخبرنا ابو عمر محمد بن محمدبن نصر السكونى رضى الله عنه قال سألت ابا بكر احمد بن محمد بن عثمان البغدادى رحمه الله ان يخرج الىّ ادعية شهر رمضان التى كان عمه ابوجعفر محمد بن

عثمان بن السعید العمری رضی الله عنه و ارضاه یدعو بها، فاخرج الیّ دفتراً مجلداً باحمر فنسخت منه ادعیة کثیرة و کان من جملتها: تدعو بهذا الدعاء فی کل لیلة من شهرِ رمضان فان الدعاءَ فی هذاالشهر تسمعه الملائکة وتستغفر لصاحبه، وتقول...“

ترجمہ

”یہ فصل دعائے افتتاح اور ان دوسری دعاؤں کے بیان میں ہے جو اس ماہ نجات ورستگاری میں ہر شب مکرر پڑھی جاتی ہیں، انہیں میں ایک دعا یہ ہے جسے محمد ابن ابی قرۃ نے اپنے اسناد سے ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا کہ مجھ سے بیان کیا ابوالغنائم محمد بن محمد بن عبداللہ الحسنی نے، انہوں نے کہا کہ ہمیں اطلاع دی ابوعمرو محمد بن محمد بن نصر السکونی رضی اللہ عنہ نے، انہوں نے کہا کہ میں نے ابوبکر احمد بن محمد بن عثمانِ بغدادی رحمہ اللہ سے درخواست کی کہ وہ ماہِ رمضان کی وہ دعائیں میرے سامنے لائیں جو ان کے چچا (حضرت) ابوجعفر محمد بن عثمان بن السعید العمری (رضی اللہ عنہ و ارضاہ) پڑھا کرتے تھے، تو انہوں نے سرخ رنگ کی ایک جلد بندی کی ہوئی بیاض میرے سامنے پیش کی، میں نے اس میں سے بہت سی دعائیں نقل کیں ۱؎، اسی میں یہ بھی تھا کہ: اور

اس دعا (دعائے افتتاح) کے ذریعہ سے ماہ رمضان کی ہر
رات دعا کرو، کیونکہ اس مہینے میں دعا ملائکہ سنتے ہیں اور
صاحب دعا کے لیے استغفار کرتے ہیں،......''

اس سلسلۂ سند اور طریق اسناد میں بعض نزاکتیں ایسی ہیں، جن کی بنا پر ''اصل صاحب دعا'' یعنی اس متنِ متین کے خالق کے بارے میں قدرے ابہام پیدا ہوا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ غور کرنے کی بات ہے کہ سید ابن طاؤس صاحبِ اقبال کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسے ''بِالوِجَادَہ'' (ح) نقل کر رہے ہیں، یعنی وہ یہ دعا اور اس فصل کی دوسری دعائیں براہِ راست محمد بن ابی قرۃ کی دعاؤں کی ''کتاب'' سے نقل کر رہے ہیں، جیسے آج کل عموماً تعلیم یافتہ حضرات دستیاب کتابوں سے براہ راست مطالب نقل کرتے ہیں، سید ابن طاؤس کی ذات اور شخصیت ایسی ہی ہے کہ وہ جیسے بھی، جن سے بھی اور جہاں سے بھی نقل کریں، اگر وہ نقل کردہ روایت، مضمون یا مطلب کو بجائے خود اعتبار اور اہمیت دیتے ہیں تو پھر کوئی جائے سخن نہیں رہ جاتی۔

ع مستند ہے اُن کا فرمایا ہوا

---

۱ افسوس ہے کہ ایک معاصر بزرگ نے اس جملے کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ علامۂ سید ابنِ طاؤس نے اس دفتر سے بہت سی دعائیں نقل کیں (دیکھیے: ترجمہ و شرح دعائے افتتاح از آیۃ اللہ محمد رضا مہدوی کنی)۔

(ح) تحمل حدیث یا طلب و تحصیل روایت اور نقل روایت کے کئی طریقے ہیں۔ بعض علمائے درایت و رجال نے ان طریقوں کو سات اور بعض نے نو میں منحصر فرمایا ہے، جو حسبِ ذیل ہیں:
۱- السماع من لفظِ الشیخ ۲- القراءۃ علی الشیخ ۳- الِاجازۃ ۴- المناولۃ ۵- الکتابۃ ۶- الاعلام ۷- الوجادہ

ان کی علمی، رجالی، روحانی اور رہنمایانہ حیثیتوں پر گفتگو کی جائے تو پوری کتاب انہیں کے تذکرے سے پُر ہو جائے اور پھر بھی بات پوری نہ ہو!

''محمد بن اَبی قُرۃ'' کا نام اور کام بھی اہم ہے۔ ان کا تذکرہ ان کی ''توثیق'' کے ساتھ ہماری بیشتر حدیث و رجال کی کتابوں میں ملتا ہے۔ (وسائل الشیعہ ج۲۰ص ۳۳۷) میں ہے ''ابن ابی قرۃ القنانی الکاتب – کان ثقۃ، وسمع کثیراً و کتب کثیراً قالہ النجاشی و العلامہ''۔ (کلمۃ الامام المہدی ص ۳۵۷) اس کے علاوہ جامع الرواۃ نجاشی، خلاصۂ علامہ، وظائف الشیعہ وغیرہ میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے۔

محمد بن ابی قرۃ نے جن سے نقل کیا ہے اور جس طرح اُن کا تذکرہ کیا ہے، اُسی سے ان کی اہمیت، عظمت اور وقعت کا اندازہ ہو جاتا ہے، مثلاً یہ کہ صرف نام ذکر نہیں کیا ہے بلکہ نام سے پہلے ان کی کنیت ''ابوالغنائم'' بھی ذکر کی ہے، پھر اب و جد کے ناموں اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے ان کے شرفِ نَسَبی کے لَقَبی اظہار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اب اگر کتبِ رجال میں ان کا تذکرہ نہ بھی پایا جائے تو بھی انہیں (یعنی ابو الغنائم کو) مجاہیل میں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جبکہ ان سے نقل کرنے والے (ابن ابی قرہ) اور جن سے وہ نقل کر رہے ہیں (ابوعمرو محمد بن نصر السکونی) اعلامِ ثقات، بلکہ اپنے اپنے حلقے کے فقہاء میں سے ہیں۔

۴۸

ابوعمرو محمد بن نصر السکونی وہ بزرگ ہیں جن کے متعلق امامِ رجال آیۃ اللہ العظمیٰ خوئیؒ نے معجم رجالِ الحدیث (ج ۷ ص ۲۰۱ بشمارہ ۱۱۷۱۶) میں تحریر فرمایا ہے:

''قال النجاشی: محمد بن محمد بن منصور، اَبوعمرو

السکونی، المعروف به ''ابن خرقة'' رجل من اصحابنا من اهل البصره، شیخ الطائفة فی وقته ، فقیه ثقة له کتب......''

''نجاشی نے کہا: محمد بن محمد بن نصر...... السکونی...... اپنے وقت میں شیخ الطائفہ تھے گویا مرجع وقت، وہ فقیہ تھے، ثقہ تھے اور صاحب تالیفات تھے......''

ابوبکر احمد بن محمد بن عثمان بغدادی جیسا کہ سند ہی کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ (جناب ابوجعفر محمد بن عثمان بن سعید عَمری) حضرت امام عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے نائبِ خاص کے بھتیجے ہیں اور ان کی بیاضِ دعا کے امانت دار ہیں!

خود جناب ابوجعفر عَمری، امام علیہ السلام کے دوسرے نائب اور صاحب کرامات بزرگ ہیں، ان کا تفصیلی تذکرہ بھی ایک دفتر چاہتا ہے۔

سند کے اسی قدر کوائف پر نظر ڈال کر بہت ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ گمان گزرے کہ یہ دُعا خود جناب ابوجعفر عَمری کے مُنشآت سے ہوسکتی ہے اس لیے کہ اس میں آخری نام اُنہیں کا ہے اور ان کی زبان یا ان کے قلم سے صراحۃً امام علیہ السلام کی جانب دعا کا اسناد نہیں پایا جاتا۔ لیکن اسی سند کو علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے: بحارالانوار (ج ۲۴ باب ص ۱۶۶ حدیث ۱۴)

''الاقبال نقلاً من کتاب محمد بن ابی قره باسناده عن محمد بن عثمان العمری عن القائم علیه السلام من ادعیة لیالی شهر رمضان......''

علامہ مجلسیؒ نے ''عن القائم علیہ السلام'' کا اضافہ خود ہی فرمایا ہے یا ان کے پاس اقبال کا جو نسخہ تھا اس میں موجود تھا یہ بجائے خود ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ چونکہ اقبال کے دستیاب مخطوطہ اور مطبوعہ نسخوں میں عموماً ''عن القائم علیہ

السلام'' کے الفاظ نہیں پائے جاتے۔ اور اسی بنا پر بحار کے محشی نے اس مقام پر حاشیہ میں لکھا ہے: ''......اقول: فاسناده الیٰ القائم علیه السلام وَهم'' ''میں کہتا ہوں کہ ان کا حضرت قائم علیہ السلام کی طرف اِسناد وھم ہے'' —— لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا یہ قطعاً ممکن ہے کہ علامہ مجلسیؒ کے پاس جو نسخہ ہو اس میں اسناد میں یہ الفاظ موجود ہوں اور یہ علامہ کا محض وہم نہ ہو، بلکہ یہ وہم علامہ مجلسیؒ کے متعلق علامہ بہبودیؒ کو اقبال کے دستیاب نسخوں کی عبارت کی بنا پر ہوا ہو۔

اس کے علاوہ ایک نکتہ اور موجودہ اسناد کے الفاظ میں بھی قابل غور ہے کہ جناب ابو جعفر محمد عَمری کی بیاض دُعا کی عبارت ''وتدعو'' سے شروع ہوتی ہے، اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کوئی حکم دے رہا ہے، کسی کا ارشاد ہے، کسی کی فرمائش ہے کہ ''...... رمضان المبارک کی ہر رات... یہ دعا پڑھا کرو!..'' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناب ابو جعفر عَمری جو کہ نائبِ امام علیہ السلام ہیں ظاہراً امام کے حکم سے اس دعا کو لکھ رہے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسی بنا پر علامہ مجلسیؒ نے ''عن القائم علیہ السلام'' کی صراحت فرمادی ہو کہ وہ اخبار و روایات اور احادیث و اسانید کے نکتہ داں اور نکہت آشنا تھے، ان ارشادات و عبارات کے معانی ان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا یا آج سمجھ سکتا ہے! اور اسی بنا پر نہ صرف بحار الانوار میں انہوں نے اسناد کی عبارت میں حضرت قائم علیہ السلام کا ذکر فرمایا ہے بلکہ اپنی مشہور و معروف کتابِ دعا ''زاد المعاد'' میں بھی نہایت یقین کے ساتھ دعائے افتتاح کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

''بسند معتبر از حضرت صاحب الامر (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) منقولست کہ بشیعیان نوشتند کہ در ہر شبِ ماہِ مبارک این دعا را بخوانند کہ دعائے این ماہ را ملائکہ میشنوند و برای صاحبش استغفار میکنند''

(مجلسیؒ: زاد المعاد: ط۔ کتابفروشی اسلامیہ بوذرجمہری تہران، شوال ۱۳۹۴ھ ق ص ۱۱۰ و ۹۰۱۔)

ارباب نظر و اصحاب خبر پر پوشیدہ نہیں ہے کہ زادالمعاد علامہ مجلسی کی وفات (۱۱۱۱ ھ ق) سے تقریباً ۴ رسال قبل ۱۱۰۷ھ.ق. کی اور بحارالانوار کے بعد کی تالیف ہے۔

سَنَد کے ان کوائف کے ساتھ اور علامہ مجلسیؒ کی تصریح کے بعد کسی ''استظہار'' کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔[1] غالبًا اسی لیے علامہ محسنِ امینِ عاملی نے بھی مِفتَاحُ الجنّات میں اس دعا کا ذکر اس تمہید کے ساتھ فرمایا ہے:

''دعاء الافتتاح : كان يدعوبه ابو جعفر محمد بن عثمان بن سعيد العَمري احد ابواب الصاحب(ع) وهو مروى عن صاحب الامر (ع)'' (مفتاح الجنات ج۳ ص ۲۰۰)

اور اسے کون خارج از امکان قرار دے سکتا ہے کہ علامہ عاملیؒ کے پیش نظر کوئی اور مآخذ وسند بھی ہو! بہرحال دعائے افتتاح کے اس حسنِ استناد کو پیش نظر رکھیں تو اس دعا کا سب سے بڑا امتیاز تو یہی قرار پائے گا کہ اس کے کلمات حضرت صاحب الزمان علیہ الصلاۃ والسلام کے انفاسِ قدسیہ کی نکہت سے معمور ہیں!

اِس کے جمالِ متن، مضامین عالیہ اور مطالب سامیہ کی بحث اپنی جگہ پر جداگانہ ہے!

---

[1] یہ دفعِ وہم ہے، چونکہ جنابِ علامہ حسن زادہ نے اس دعا کی سند ونسبت کے بارے میں اسی طرح استظہار فرمایا ہے۔

متنِ دعا

ہمارے پیش نظر جناب محدث قمیؒ کی مفاتیح الجنان ہی کا متن ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مجموعوں میں مندرج اس دعا کے متن میں کوئی بڑا قابل لحاظ اختلاف نظر نہیں آتا۔

علامہ مجلسیؒ کی زاد المعاد کا جو مطبوعہ نسخہ اس وقت پیش نظر ہے وہ حسنِ کتابت اور معیارِ طباعت کے لحاظ سے ایران میں چھپنے والی کتابوں کے بلند معیار سے نسبۃً کمزور ہے۔ اِعراب کی غلطیوں سے بھی پاک نہیں ہے۔ چنانچہ دعائے افتتاح میں بھی دو ایک جگہوں پر صراحۃً غلطی موجود ہے۔ اس لیے دو ایک جگہوں پر جو اعراب مشہور و متداول متن کے اعراب سے مختلف ہونے کے باوجود بجائے خود غلط نہیں ہے، اُسے اختلافِ قرأت میں شمار کیا جائے یا کاتب کا اشتباہ، یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔ تاہم ان جگہوں کو چونکہ وہ بجائے خود صحیح اور معنی خیز ہیں ''اختلافِ قرأت'' کے ضمن میں لیا جا سکتا ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں پوری دعائے افتتاح نقل نہیں فرمائی ہے۔ صرف اس کے تین فقرے نقل کیے ہیں۔ جو متداول اور مشہور متن کے بالکل مطابق ہیں۔

بحار الانوار ہی میں بعض دوسری دعاؤں کے متن میں دعائے افتتاح کے بعض پورے پورے بند یا فقرے بغیر کسی اختلاف یا تغیر کے پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بھی مشہور بین الناس متن سے حرف بحرف مطابقت رکھتے ہیں۔

متونِ حدیث و روایات اور عباراتِ دعا و زیارات کے محققِ خبیر، محدث اخیر، علامہ شیخ عباس قمی صاحب مفاتیح الجنان نے خود دعا کے چوبیس کلمات میں

اختلافِ نسخ کی نشاندہی فرمائی ہے۔ ان میں وہ چند کلمات بھی شامل ہیں جو زاد المعاد کے نسخے میں آئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک اختلاف بھی ایسا نہیں ہے، جس سے مضمونِ دعا یا منطوق و مفہوم کلام میں ذرا سا بھی فرق پیدا ہو رہا ہو۔ پھر بھی ان تمام اختلافات کی ترجمہ و شرح کے ذیل میں حسب موقع وضاحت کردی گئی ہے۔ اس لیے یہاں پر علیحدہ سے ان کی فہرست پیش کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

قلم را باز دارم از اطالہ
من و معنی تو و مدّ و اِمالہ

☆☆☆☆☆

جمالِ متن ومتانتِ مضمون

سند ومتن کے تعلق سے طالب علمانہ تحقیق اور تفحّص کے بعد اب ذرا متن و مضمونِ دعا پر دوسرے جہات وجوانب سے غور کیجیے......

جیسا کہ تمہید میں عرض کیا گیا، یہ دعا صرف ایک ''فرد'' کی فریاد وفغاں نہیں بلکہ پورے معاشرے کی صدائے حال ہے۔ جس طرح نماز میں ''الحمد للہ رب العالمین'' کہنے والا مصلی جلد ہی ''ایاک نعبد و ایاک نستعین'' کی منزل پر پہنچ کر ''واحد متکلم'' نہیں رہ جاتا اور نتیجۂ چاہے وہ احکامِ ظاہریہ کے لحاظ سے مُفرد ہی کیوں نہ ہو، وہ روحانی اور معنوی اعتبار سے ''مُفرِد'' ، مُنفَرِد یا متفرد نہیں رہ جاتا، اسی طرح اس دعا کی تلاوت کرنے والا اپنے مطلعِ سخن میں ''اللھم انّی افتتح الثناء بحمدک'' کا زمزمہ خواں مقطعِ دعا تک پہنچتے پہنچتے ''اللھم انّا نرغب الیک'' کا ہمہمہ بلند کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ایک مرتبہ اس دُعا کی تلاوت کے بعد اس کے متن ومضامین پر غور کر رہا تھا تو ذہن میں یہ معانی مرتسم ہوئے کہ اکثر علمائے ظاہر پرست نے بھی اور عرفائے باطن شناس نے بھی، بلکہ تقریباً سبھی نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ ''صلاۃ'' یا نماز بلکہ جملہ عبادات کی حقیقت وماہیت دراصل ثنائے الٰہی ہے! اور یہ دعا بھی ایک عمدہ ثنائے الٰہی ہے۔ اس لحاظ سے یہ دعا گویا حقیقتِ صلاۃ کے عرفانی مصادیق میں شمار کی جاسکتی ہے! غالباً اسی لحاظ سے ایسی دعاؤں کی تلاوت بہت سی نافلہ نمازوں کے پڑھنے سے زیادہ اجر وثواب رکھتی ہے! اور ممکن ہے کہ اسی لیے اس مکمل دُعا کو صاحب متن دعا علیہ التحیۃ والثناء نے ''الثناء'' سے تعبیر کیا ہے۔ ''اللھم اِنی افتتح الثنآء بحمدک''! اس کے متن ومضامین کے عمق میں غور کیجیے تو اس میں ''تکبیر الٰہی'' بھی ہے اور ''حق تکبیر'' کے ساتھ! حمد الٰہی بھی ہے ''حق تحمید'' اور حسنِ تمجید کے ساتھ!!

پوری دعا میں کربلا میں شہدائے بنی ہاشم کے ہم عدد ۱۸ مرتبہ کلمہ ''الحمد للہ'' کی تکرار ہے۔ اور یہ لفظ تکرار تو میں نے حسب ظاہر استعمال کر دیا، ورنہ یہ اٹھارہ تجلیاتِ مدحت ہیں اور تجلّی میں تکرار کہاں؟

(۱)

مطلعِ دُعا

یا

براعتِ طلب

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَفۡتَتِحُ الثَّنَآءَ بِحَمۡدِکَ!

یعنی: اے معبود! میں آغاز کر رہا ہوں اس عرضِ حال کا تیری حمد سے!

یا دل چاہے تو یوں کہہ لیجیے کہ:

''اے معبود! میں اپنی عرضِ حال تیری حمد سے شروع کر رہا ہوں۔''

اس مطلعِ دعا کا ہر لفظ قابلِ غور ہے۔

''اللھم''، یعنی اے اللہ اے معبودِ برحق! اے معبود! یا چاہیے تو اپنے پورے وجود اور پورے جذبہ سے صرف ایک ہی لفظ کہہ لیجیے: ''معبود!''

حضرت میر تقی میرؔ علیہ الرحمہ نے کیا اچھی بات کہی ہے

دیتی ہے طول بلبل کیوں شورشِ فغاں کو
یک نالہ حوصلے سے بس ہے وداعِ جاں کو!

عربی قواعد کے لحاظ سے یہ ندا و منادیٰ ہے۔ اصل میں یا اللہ تھا۔ شروع میں حرف ندا ''یا'' حذف کر کے اس کے عوض میں آخیر میں تشدید کے ساتھ حرف میم کا اضافہ کر دیا گیا۔ اکثر اربابِ نحو عام طور پر یہی کہتے ہیں۔

یقیناً اِس کے ذیل میں کچھ اور نحوی بحثیں بھی آتی ہیں جن کے دہرانے کا یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ لیکن یہ ضرور قابلِ ذکر ہے کہ حرفِ 'یا' کی حرفِ 'م' سے تعویض عربی زبان میں صرف ایک اسی لفظ یعنی اسمِ مبارکِ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی اور اسم کے ساتھ یہ طریقہ اختیار نہیں کر سکتے کہ مثلاً ''یا محمدؐ'' کہنے کے بجائے ''مُحَمَّدُمَّ'' کہہ کر پکارا جائے!

چونکہ یہ شرح دعا ہے اس لیے 'یا' کو 'م' سے بدلنے کی ایک عرفانی توجیہ کا ذکر بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جسے مشہور فلسفی، فقیہ اور عارف مولانا ھادی سبزواریؒ نے شرح دعائے جوشنِ کبیر میں بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"والسر فی التعویض الاشارة الیٰ الاستخلافِ ، فان "المیم "مفتاح اسم الخاتم وخاتم اسمِ آدم . فخلافة میم عن یاء ... حاکیة عن خلافة الانسانِ الکامل عن الله تعالیٰ ... والسر فی التشدید ان فی اسم محمد (ص) میمین : احدهما میم الملک ولآخر میم الملکوت، او دعهما الله تعالیٰ فی اسمِ حبیبہٖ ایماء الیٰ ان عنده سر الملک و الملکوت..."

(شرح جوشن کبیر ص ۴۷)

اس تعویض ،یعنی یا کو میم سے بدلنے میں راز یہ ہے کہ یہ اشارہ ہے استخلاف کی طرف ،....اس لیے کہ ''میم'' نام نامی حضرت خاتم ،خاتم النبیین محمد مصطفےٰؐ کا حرف اول ہے اور اسم گرامی حضرت آدم کا حرف آخر....

....تو میم کا یا کی جگہ لینا ،....ترجمانی ہے انسانِ کامل کی خلافت الٰہیہ کی ؛ اور میم کی تشدید میں راز یہ ہے کہ نامِ محمدؐ میں دو میم ہیں ۔ایک میمِ مُلک ہے اور دوسری میمِ ملکوت :معبود برحق نے یہ دونوں میم اپنے حبیب کے نام میں 'ودیعت' فرمائے ہیں، اس اشارے کے طور پر کہ ملک اور ملکوت دونوں عالموں کا راز انہیں (ص) کے پاس ہے:،،

حقیقۃً ایسے اَسرارِ کلام پر اطلاع پانا اُسی معبود برحق کے لطف بے پایاں اور حسنِ توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے جو مولانا ہادی سبزواری ہی جیسے عُبّا دوزُہّاد کے حصے میں آسکتا ہے۔

(اِنّــي) یہ حرف اِثبات رثات ہے مقام ابتہال میں! یہ بندے کا حضور

معبود میں عاجزانہ قیام ہے، یہ اِنّـــی، انانیت کا متکبرانہ اظہار نہیں ہے، بلکہ معبود برحق کے حضور میں اپنی فقیرانہ حیثیت کا اعتراف ہے جس میں حسنِ التفات اور حسنِ عنایت کی طلب بھی مضمر ہے۔

☆☆☆

''اَفْتَتِـحُ'': یہ فتح کے مادے سے باب افتعال سے مضارع واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ میں آغاز کرتا ہوں، کھولتا ہوں، شروع کرتا ہوں - یا - ''فتح کرتا ہوں''۔ ظاہر ہے کہ مقامِ دعا میں پہلے ہی معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اگر ''ثنا'' سے ستائش و سپاس و شکر ہی مراد ہو، محض عرض حال مراد نہ ہو، تو پھر کسی سرمستِ بادۂ عشق و عرفان کے ذہن میں یہ معنی بھی خطور کر سکتے ہیں کہ ''اے معبود! میں تری ستائش کی مہم، تیرے شکر کی منزل، تیری مخصوص حمد کے ذریعہ سر کر رہا ہوں!'' اگرچہ اس معنی کو مقامِ دعا سے کچھ بھی مناسبت نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات سرمست اور مجذوب قسم کے عُرفا کے 'شطحیات' سے زیادہ قریب ہے۔

☆☆☆

حمد باری تعالیٰ سے آغاز سخن یا افتتاحِ کلام میں بے انتہا اسرار ہیں۔ جناب امیر المؤمنین علیہ السلام کے ایک خطبہ کے ابتدائی فقرے ہیں:

''الحمد لله الذی جعل الحمد مفتاحاً لذکره وسببا للمزید من فضله ودلیلاً علیٰ آلائه و عظمته''

(نہج البلاغہ، نسخہ صبحی صالح، خ ۵۷)

''تمام حمد اسی اللہ کے لیے ہے جس نے حمد کو اپنے ذکر کی کلید، افزونیِ لطف و کرم کا سبب اور اپنی نعمتوں، نشانیوں اور عظمتوں کی دلیل قرار دیا''

☆☆☆

''الثنآء'' : اس فقرے کے سیاق وسباق میں یہ لفظ ذرا زیادہ بحث طلب ہے۔ ''ثناء'' عربی میں الف ممدودہ اور ہمزہ کے ساتھ ہے۔ اردو میں آکر یہی لفظ ''ثنا'' بن گیا اور لفظ ''حمد'' کا ردیفِ مستقل یا تابعِ موزوں، تابعِ احسن واجمل۔ اکثر ''حمد وثنا'' یا ''مدح وثنا'' کے الفاظ ساتھ ساتھ ہی آتے ہیں۔

انیسؔ کی مشہور بیت ہے:

آخر ہے رات حمد وثنائے خدا کرو
اٹھو! فریضۂ سحری کو ادا کرو

اردو میں ثنا کے معنی صرف ''مدح'' تعریف یا توصیف کے ہیں۔ لیکن عربی میں اس کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ اگرچہ وہاں بھی زیادہ تر اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اس فقرے میں اگر ثنا سے مدح وستائش ہی مراد لی جائے تو پھر ترجمہ یہ ہوگا، جیسا کہ اکثر مترجمین نے کیا ہے کہ ''اے معبود! میں اس مدح وثنا کا آغاز تیری حمد سے کر رہا ہوں''۔ اَب غور کیجیے کہ منطوق اور مفہوم کیا ہوئے؟ کیا یہ قصیدہ کسی اور کا ہے جس کا آغاز ''حمد الٰہی'' سے ہو رہا ہے؟ یا یہ مدح اسی کی ہے لیکن صرف اسی کے بتائے ہوئے مخصوص کلمات حمد کے ذریعہ سے اس کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ دونوں ہی باتیں درست نہیں ہیں۔ نہ یہ کسی اور کا قصیدہ ہے اور نہ اس میں صرف قرآن مجید میں وارد کلماتِ حمد پر انحصار واقتصار ہے۔ اسی لیے یہاں پر لفظ ثنا کے معنی، اس کے محلِ استعمال اور ''نحوۂ استعمال'' پر غور کرنا ضروری ہے۔

ابھی عرض کیا گیا کہ اگرچہ لفظِ ثنا کا زیادہ تر استعمال مدح وستائش کے معنی میں ہوتا ہے۔ لیکن لغوی حقیقت کے لحاظ سے یہ صرف ''بیان'' کے معنی رکھتا ہے۔ چاہے وہ بیانِ حسن ہو بیانِ ذم، ثنائے جمیل ہو یا ''سوء ثنا'' ـــــ یہاں پر چونکہ رب

کریم کے حضور میں دعا گزار اپنے اور اپنے معاشرے کے احوال و کوائف بیان کر رہا ہے اس لیے اسے بیان حسن یا بیان ذم سے نہیں بلکہ بیانِ احوال یا ''عرضِ حال'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ہاں! چونکہ رب کریم کے حضور میں ''عرضِ حال'' کے ضروری آداب میں سے یہ ہے کہ آغاز ''حمد'' سے ہو جیسا کہ احادیثِ نبویہؐ اور ارشاداتِ ائمہ علیہم السلام میں تعلیم کیا گیا ہے، اس لیے داعی، دعا گزار یہ کہہ رہا ہے کہ ''اے معبود میں اپنی عرضِ حال تری حمد سے شروع کر رہا ہوں!'' یہ کہنا حسن التفات کا عاجزانہ مطالبہ ہے کہ معبود! میں اپنی بساط بھر تیرے محضر اقدس کے اداب بجالانے کی پوری کوشش کر رہا ہوں، میری دعا رد نہ فرمانا!!

"بحمدک"

میں جو ''ب'' ہے یہ وہی ہے جو بسم اللہ کے شروع میں ہے، جس سے کتاب اللہ قرآنِ مجید و فُرقانِ حمید کا آغاز ہوا ہے۔ جسے عربی زبان کی گرامر میں ''حرف جر'' کہتے ہیں۔ معلوم ہے کہ عربی میں جَر کے معنی کھینچنے کے ہیں۔ حرفِ جر کسی نہ کسی فعل یا شبہِ فعل کے معنی کو کھینچ کر اپنے بعد آنے والے اسم سے متعلق کر دیتے ہیں۔ یہ ساری تفصیل علمِ نحو کی ابتدائی کتابوں میں زیرِ بحث آجاتی ہے۔ یہاں پر صرف اتنی یاد دہانی اور مناسب معلوم ہوتی ہے کہ حروفِ جارّہ میں حرفِ باء چودہ معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بائے بسم اللہ کی قسم! مجھے اِس حسنِ اتفاق پر ایمان افروز حیرت و مسرت ہے کہ ایک ہی حرف باء سے چودہ ابوابِ معنی کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں!

ان چودہ معانیِ حرفی و ظاہری میں سے بسم اللہ میں زیادہ تر استعانت کے معنی مُراد لیے گئے ہیں۔ بعض نے مُصاحبتؐ کے معنی بھی مُراد لیے ہیں، لیکن کیا

مُضائقہ ہے اگر بہ یک ارادہ و بہ یک استعمال استعانت و مصاحبت و اِلصاق تینوں معانی شاملِ مُراد سمجھے جائیں! اور یہی صورت و ترکیبِ معنیٰ یہاں ''بحمدک'' میں مُراد و مقصود ٹھہرے!

حضرتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ سلم سے دو حدیثیں ایک ہی انداز پر وارد ہوئی ہیں۔ یہاں ''بحمدک'' میں اُن ارشادات کی تعمیل بھی ہو رہی ہے۔ یہ ارشاداتِ گرامی بہت مشہور ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

''كُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبْدَأْ بِبِسْمِ اللهِ الرحمٰنِ الرَّحِیْمِ فَهُوَ اَبْتَرُ''

ہر قابلِ لحاظ اَمر جو بسم اللہ سے شروع نہ ہوگا وہ بے ثمر رہ جائے گا!

اور اسی طرح یہ فرمایا کہ:

''كُلُّ اَمْرٍ لَمْ یُبْدَأْ بِحَمْدِ اللهِ فَهُوَ اَبْتَر''

ہر امر جو معبودِ برحق کی حمد سے شروع نہ ہوگا وہ بے نتیجہ رہے گا۔

کلامِ ائمہ سے اقتباس کرنے والے مصنفین میں سے کسی کا جملہ ہے کہ:

''یَجِبُ عَلٰی كُلِّ ذِي مَقَالَةٍ أنْ یَبْدأَ بِحَمْدِ اللهِ قَبْلَ اسْتِفْتَاحِهَا، كَمَابُدِئَ بِالنِّعْمَةِ قَبْلَ اسْتِحْقَاقِهَا''.

[المبرد، الکامل، ج ۳ ص ۱۵۶]

''حمدِکَ''

''تیری حمد'' یا ''تیری مخصوص حمد'' ''تیری حمد'' کے معنی واضح ہیں۔ لیکن اگر اضافت کا خیال کر کے مزید دقیقہ سنجی سے کام لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ میں جو مضامینِ حمد تیرے لیے مخصوص ہیں، جو تو نے قرآن مجید میں یا اپنے نبی کریمؐ کی زبان مبارک سے اور اپنے اولیائے معصومینؑ کے توسط سے ہمیں بتائے ہیں اُنہیں

مخصوص مضامین حمد کے ذریعہ سے تیری ستایش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ورنہ میں اپنے طور پر تیری حمد کہاں کر سکتا ہوں۔

ماثور دعاؤں کے ذخیرے کا تتبع کیجیے تو اس فقرے سے مماثل فقرے بعض دوسری دعاؤں میں بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً بحارالانوار (ج ۹۱ ص ۲۰۰ باب ۲ روایت ۴) میں نمازِ حضرت جعفر طیارؑ کے بعد کی ایک دعا مفضل ابن عمر نے امام صادقؑ سے نقل کی ہے جو ان فقروں سے شروع ہوتی ہے:

"اللھم انی افتتح القول بحمدک وانطق بالثناء علیک...." یا بحارالانوار ہی میں (ج ۹۵ ص ۲۹۵ پر) ایک دعا اِس طرح شروع ہوتی ہے:

"اللھم انا نستفتح الثنآء بحمدک ونستدعی الثواب بمنک فاسمع یا سمیع مدحتی... الخ"

یہ فقرے یاد آ گئے تو صرف بطور مثال عرض کر دیے ورنہ اور بھی مثالیں مل جائیں گی۔ لیکن جیسا کہ تمہید میں عرض کیا گیا اس دعا کے متن کا نظم و نسق اور اس کے الفاظ و معانی کا انجسام اور مضامین کا ارتکاز دوسری تمام مثالوں سے بہتر اور ممتاز ہے۔ جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دوسری دعاوں کے کلمات راویوں کی زبانی روایت، زبانِ روایت اور حافظہ کی کمزوریوں سے کچھ کے کچھ ہو گئے۔ لیکن یہ دعا شروع سے بصورت تحریر نقل ہوتی آئی ہے اس لیے اس میں "سماع و نقل" کی کمزوریوں کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔

وَاَنْتَ مُسَدِّدٌ لِلصَّوَابِ بِمَنِّکَ!

اور تو ہی اپنے کرم سے صحیح راستہ دکھانے والا ہے!

تو ہی اپنے کرم سے کامیابی بخشنے والا ہے!

واو، (وَ)- یہاں پر عطف و تسلسل کلام کے لیے ہے۔ بیانِ حال کے لیے بھی ممکن ہے۔ ''صواب'' کا لفظ تو اردو اور فارسی میں بھی تقریباً انہیں معنوں میں مستعمل ہے، بلکہ جزوِ زبان بن چکا ہے، جن معانی میں یہ عربی زبان میں مستعمل ہے۔ بلکہ جوابِ باصواب، راہِ صواب، صواب اندیش، صوابدید وغیرہ تراکیب بھی ہماری زبان میں رائج ہیں۔ صواب یعنی درست، صحیح، سزاوار، حق، برحق، لائق۔ صواب ـــــ خطا کی ضد ہے، اس لیے اس کے معنیِ موضوع لہ کو ایک لفظ ''صحیح'' یا درست میں منحصر سمجھا جاسکتا ہے۔

مُسَدِّدْ - اس کا مادّہ س دد ہے۔ اس مادّے سے بھی اردو فارسی زبانوں میں ایک لفظ تو موجود ہی ہے۔ ''سدّ'' بمعنیٰ مانع، روکنے والا، رکاوٹ، سدّ باب، سدّ راہ ہونا، سدِّ رمق اور سدِّ سکندری وغیرہ ترکیبیں اور محاورے بھی مستعمل ہیں، لیکن اس مادّے کے سَدَّ دَ، مُسَدِّد اور سدِید جیسے پرمعنیٰ الفاظ عربی ہی تک محدود ہیں۔

دعائے جوشن کبیر میں ۷۸ویں بند میں ''یا ذُوالْقَوْلِ السَّدِیْدِ'' آیا ہے۔ بعض فقرائے مجذوبین کی مناجاتوں میں ''یاسَدِید'' کا اطلاق بھی ہوا ہے مثلاً:

''یا وَحِیدُ یاحَمِیدُ یارَشِیدُ یا سَدِیدُ یاشَدِیدُ یا شَہِیدُ یا مَجِیدُ یا مُعِیدُ یا ذَاالْوَعْدِ وَالوَعِیدِ یا مَنْ رُؤیَتُہُ لِلْعَاشِقِیْنَ عِیدُ!''

خلاصہ یہ کہ مُسَدِّدٌ اسم فاعل ہے سَدَّ دَ (باب فَعَّلَ) سے بمعنیٰ راہِ راست کی طرف ہدایت کرنے والا! صحیح یا سیدھا، سچا راستادِکھانے والا!!

''مَنّ'' یعنی اِحسان، کرم، لطف، عربی کا یہی مَنّ: اَلْمَنُّ والمِنَّۃُ اردو میں مِنَّت بن گیا، جو تنہا تو کم استعمال ہوتا ہے اور ہوتا ہے تو اس کے معنیٰ احسان یا لطف و کرم ہی کے ہوتے ہیں۔ جیسے آپ کی مِنّت سے یا ان کی مِنّت وغیرہ... لیکن مِنّت

گزاری کے معنیٰ شکر گزاری کے ہوتے ہیں جس میں احسان کے معنی چھپے ہوئے ہیں۔احسان نہ ہوگا تو شکر گزاری کس بات کی ہوگی؟ اور مِنَّت وسماجت میں عاجزی اور خوشامد کے معنیٰ ہیں، اس کی تہہ میں بھی احسان طلبی، مِنَّت کشی کے معنی موجود ہیں۔اردو کے شاعر رِنؔد کا عجیب سا شعر ہے۔

نازِ کافر نہ اٹھا مِنتِ دیدار نہ کھینچ
صدمۂ کش مکشِ سُبحہ و زُنار نہ کھینچ

کوئی احسان کرے تو اس کی مِنّت ہے! اور کسی بزرگ کی خدمت میں اس کے احسان کے شکرانہ میں یا اس کے لطف وکرم کو شامل حال کرنے کے لیے کچھ اس کی خدمت میں پیش کیا جائے تو اردو میں ''مَنَّت'' ہے! خدا کرے ہم سب پر معبودِ منّان کی مِنّت برقرار رہے، مَنّت کا چراغ جلتا رہے!

''ب'' حرفِ جر، اور چودہ مَعانی کے لیے استعمال ہوتا ہے! (یہ حقیقت اپنی جگہ پر مُسَلَّم ہے کہ ایک ہی ''ب'' میں چودہ اَبوابِ معانی پوشیدہ ہیں!!)

یہاں پر بِــمَّـنِـکَ میں، ممکن ہے کہ بِ اُسی معنی میں ہو جس معنیٰ میں بَحمدِکَ میں ہے، لیکن زیادہ قوی امکان یہ ہے کہ اس سے مختلف معنی میں ہے۔وہاں مصاحبتِ معنوی اور ابتدائے غایتِ ماورائی کے معانی مضمر ہیں اور یہاں پر سَبَبِیّت یا علیّت کے!

مَنِکَ: تیرا کرم یا تیرا مخصوص کرم!

☆☆☆

پہلے جملے (اللھم انی افتَتِحُ الثنآ ءَ بحمدک) کے سیاق وسباق میں اس جملے کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں یہ عرضِ حال یا تیرا یہ سپاس نامہ تیری ہی حمد سے شروع کر رہا ہوں اور بیانِ حمد میں بھی ''صحیح راہ'' تک رہنمائی کرنے والا اور

کامیابی بخشنے والا تو ہی ہے!

ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ:

''اور تو ہی تو اس راہِ راست تک رہنمائی کرنے والا ہے کہ میں تیری حمد کر رہا ہوں!'' یہ جو میں اپنی درخواست کو تیری درگاہ میں پیش کر رہا ہوں، اور اِس ادبِ دعا کے ساتھ کہ اپنی درخواست کو تیری حمد سے شروع کر رہا ہوں یہ سب تیری ہی رہنمائی کا ثمرہ ہے!''

ایک مفہوم ان مفاہیم سے زیادہ عمومیت کا حامل یہ ہو سکتا ہے کہ ''اور تو ہی زندگی کے تمام معاملات میں صحیح راستا دکھانے والا اور کامیابی بخشنے والا ہے!''

حقیقتِ نفس الامری کے لحاظ سے یہ سبھی مفاہیم درست ہیں۔لیکن اس میں سب سے دقیق، لطیف اور نازک بات ''بِـمَـنِّـکَ'' سے وابستہ ہے۔اس کا ترجمہ سادہ طور پر احسان یا کرم یا لطف کر کے آگے بڑھ جانا مناسب نہیں ہے۔

حقیقتِ لُطف

ربّ کریم کے لطف و کرم کے مُعتَرِف تو اپنی اپنی جگہ پر حسبِ ظرف و حسبِ توفیق سبھی ہیں۔کوئی سعادتمندانہ طور پر اس کے لطف و کرم پر ایمان رکھتا ہے تو کوئی قہری طور پر اس کے اقرار پر مجبور نظر آتا ہے۔ لیکن نظریاتی (Ideological) طور پر یا نظریاتی بنیاد اور اصول سازی کے لحاظ سے، ایک فلسفیانہ اساس کے طور پر ''لطفِ الٰہی'' کی حقیقت کو ہمارے علماء نے جس طرح پیش کیا ہے وہ بلا شبہ ایک بے نظیر علمی، عرفانی اور توحیدی صواب اندیشی کی منفرد مثال ہے!

اگرچہ ہمارے علماء نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اُس کی تشریح و توضیح کا

حق بھی ابھی تک ادا نہیں ہو پایا ہے۔ اس لیے یہاں پر اس کی ذرا سی تفصیل پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے علمائے مفکرین اور متکلمین نے اِرسالِ رُسل اور نصب و تعیینِ ائمہ کے باب میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ بندوں کی حیرانی وسرگردانی دور کرنا، انہیں راہِ راست کی رہنمائی کرنا، اچھے بُرے کی باطنی طور پر تمیز اور ظاہری طور پر ہدایت عطا کرنا، سرچشمۂ خیر وامورِ خیر سے نزدیک کرنا ربِّ کریم کی ذاتِ اقدس پر واجب ہے۔ اور یہ "وجوب" "ازراہِ لطف" ہے! اس نظریہ کو محقق طوسی خواجہ نصیر الدین علیہ الرحمۃ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "تجرید الاعتقاد" میں ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

"وَاللُّطفُ وَاجِبٌ لِتَحصِیلِ الغَرَضِ بِهِ"

"اورلطف واجب ہے کیونکہ اِسی سے گوہرِ مراد حاصل ہوتا ہے!"

تجرید کے عدل ونبوت اور اِمامت کے مباحث میں نظریۂ لُطف کو محقق طوسیؒ نے اپنے مخصوص اسلوب، اپنی موجز فلسفیانہ نثر میں چند جملوں میں پیش کیا ہے۔ اِس ناچیز نے اس نظریۂ لُطف کو گسترش دے کر تمام مسائلِ مبدأ ومعاد کو اسی ایک اساس پر حل کرنے کی سعی کی ہے اور مولائے حقیقی ہی کے لطف وکرم سے غالباً یہ پہلی ایسی کوشش ہے جِسے میں نے اپنی ایک مستقل تالیف "المَسلکُ الحَنِیفِ فِي بَیَانِ اللُّطفِ مِنَ اللَّطِیف" میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اکثر وبیشتر اس طرح کے سوالات زبانوں پر آتے رہتے ہیں کہ خالقِ کائنات، واجب الوجود علی الاطلاق، مبدأ المبادی، مُسبِّب الاسباب، علّتُ العلل، حضرتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کے جو صِفات دینی اور عرفانی نقطۂ نظر سے پیش کیے جاتے ہیں کہ: وہ فاعل مختار ہے، مجبور نہیں ہے، حیّ وقیوم ہے، رؤوف ورحیم ہے، سمیع وبصیر ہے، عادل وعلیم ہے، صادق وکریم ہے، اور بطور خاص

یہ کہ:

وہ صَمَد وغنی ہے، وہ بے نیازِ مطلق ہے، اس کی ذات میں کسی بھی طرح کے اِنفعال کا گزر نہیں، اور اسی قبیل کے دوسرے اوصاف، تو اگر یہ سب درست ہے تو پھر اِس کائنات کی تخلیق کا سبب کیا ہے؟

ع پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

اور اب جبکہ تخلیق فرما دیا تو پھر انسانوں کے لیے یہ نظامِ شریعت اور عبادات ومعاملات میں یہ احکام و ''تکالیف'' کس وجہ سے ہے؟

اور حشر ونشر ومیزان وجزا کیوں ہے؟

یہ دوزخ وبہشت کیوں بنائے گئے؟

ع یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی!

اس سب کا آخر سبب کیا ہے؟

نظریۂ لطف کی بناء پر اِن سب کا تشفی بخش جواب صرف اور صرف ایک ہی لفظ سے دیا جا سکتا ہے اور وہ ہے ''لطف''!

The Almighty Allah created the universe merely out of His grace!

اُس نے ہمیں وجود بخشا اور بن مانگے عطا کیا یہ اس کا محض لطف ہے نہ کہ اس کی کوئی احتیاج ہے جو ہم سے یا ہماری تخلیق سے وابستہ ہو، پھر اس نے ہماری ضرورت کی تمام چیزیں ہماری تخلیق سے پہلے مُہیا کر دیں جیسے کوئی میزبان مہمان کو دعوت دینے سے پہلے ہی میزبانی کے تمام لوازمات مہیا کرتا ہے، یہ بھی اس کا مزید لطف ہے اور محض لطف! جبکہ ہم اس کی مہیا کردہ اور مُسَخَّر کردہ چیزوں کی اک ذرا سی قدردانی نہیں کر پاتے! اور مہمان خانہ کو ویرانہ بنا ڈالتے ہیں، پھر لطف بالائے لطف

یہ ہے کہ اُس نے ہم میں سے جس نے اپنا جیسا بھی ذوق وشوق بنالیا اُسی لحاظ سے اس کا ابدی ٹھکانہ بھی بنادیا، خوش مذاقوں، خوش معاشوں کے لیے بہشت بریں تخلیق کردی اور بد مذاقوں، بد معاشوں کے لیے دوزخ تیار کردی، یہ سب اس کا محض لطف ہے، اُس کا کرم بے کراں ہے کہ کوئی کتنا ہی اس کا نافرمان بن جائے، نافرجام بن جائے وہ اپنا عطا کردہ فیضِ وجود اس سے واپس لے کر اُسے ''نابود'' نہیں کرتا، بلکہ دوزخ ہی میں سہی اس کی بقا کا انتظام فرمادیتا ہے!

یہاں پر مجھے میر انیسؒ کا ایک شعر یاد آتا ہے میں اسے الہامی شعر مانتا ہوں ؎

سیاقِ رحمتِ معبود ہے قیامت و حشر
ہم اس کو بھی کرمِ بے حساب سمجھے ہیں!

پھر اُس نے اِس دنیا میں ہمیں جو علم و حکمت، عقل و نبوت، منطق و امامت، تدبیر و فراست، تہذیب و سیاست، شعور اور ہنر، غرض زندگی کی جو کچھ بھی لطافتیں اور معنویتیں عطا فرمائیں، یہ سب اُس ربِّ کریم، رؤوف و رحیم، خالقِ حکیم اور معبودِ رقیب و لطیف ہی کا لطف ہے!

وہ غنی ہے اور مُغنی! ہم ہیں محتاج اور فقیرِ محض بلکہ عینِ فقر!

مسئلۂ جبر واختیار کو بھی کوئی سمجھنا چاہے تو اسی نظریۂ لطف کی روشنی میں بہ لطافتِ شعور، بہ احسنِ وجہ، درک کرسکتا ہے کہ انسان اس کائنات میں مجبورِ محض نہیں ہے بلکہ 'محتاجِ محض' ہے! اور یہ محتاجی ''مخلوق'' ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ اُس قادر و قیوم نے اِسے محتاج کیا ہے! یہ انسان ذلیل ہے کہ اپنی حقیقت و حیثیتِ ذاتی میں محتاج ہے اور وہ ربِّ کریم ہے کہ اپنے لطف سے اِسے ''مختار'' بننے کی راہیں دکھاتا جاتا ہے!!!

وَ ایقَنتُ أَنَّکَ أَنتَ أَرحَمُ الرّاحِمِینَ فِي مَوضِعِ العَفوِ وَ الرَّحمَةِ

وَأَشَدُّ الْمُعاقِبِينَ فِي مَوضِعِ النَّكالِ وَالنَّقِمَةِ

وَأَعْظَمُ الْمُتَجَبِّرِينَ فِي مَوضِعِ الْكِبْرِيَاءِ وَالْعَظَمَةِ

اور مجھے یقین ہے کہ بخشش اور مہربانی کے موقع پر تو ہی تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

اور سزا اور سرزنش کے موقع پر تو ہی تمام سزا دینے والوں سے زیادہ سخت ہے!

اور بڑائی اور بزرگی کے محل میں تو ہی تمام بزرگواروں سے بزرگ تر ہے!!

☆☆☆

سرِ آغاز دعا اور تمہیدِ التجا میں حمد و ثنا کے بعد یہ دوسرا مقدمہ عرض وطلب ہے۔ چونکہ آدابِ دعا میں یہ بھی تعلیم فرمایا گیا ہے کہ درخواست حمد سے شروع کی جائے اور یہ بھی کہ ربّ کریم کی ذات، اس کے صفات خصوصاً اس کے جود و کرم، اجابتِ دعا، قدرتِ عطا اور اُس کی جانب سے حاجت برآری پر مکمل یقین بھی رکھا جائے۔ اُس سے فی الواقع حسنِ ظن بھی ہو اور اس کا حسنِ اقرار بھی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

''انا عِندَ ظَنِّ عبدِي بي فلا يَظُنُّ عَبدِي بِي الا خَيراً'' [۱]

''میں تو اپنے بندے کا 'قرینِ خیال' ہوں! بس میرا بندہ میرے بارے میں اچھا ہی خیال رکھے!''

پیغمبرِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اُدْعُوا اللّٰهَ وَ أَنْتُمْ مُوقِنُونَ بالاجابَةِ''

''تم اللہ سے دعا کرو اس حال میں کہ تم کو قبولیتِ دعا کا یقین ہو''

اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''اِذادَعوتَ فظُنَّ حاجتکَ بِالْبابِ''

''تم نے اگر دعا کی ہے تو یہ سمجھو کہ تمہاری حاجت، تمہاری طلب، تمہارے دروازے پر ہے۔''

☆☆☆

قرآن مجید میں دُعا کے آداب و شرائط کی تعلیم یہ دی گئی ہے کہ:

﴿اُدْعُوهُ خَوْفاً وَطَمَعاً﴾ (سورۂ اعراف آیت ۵٦)

''اور اللہ کو پکارو، اُس سے دُعا کرو اُس سے ڈرتے ہوئے (بھی) اور اس سے پُر امید رہتے ہوئے (بھی)!'' یعنی قلب پر بیک وقت امید و بیم کی کیفیت طاری ہو۔

دعائے افتتاح کے زیرِ غور فقرے اِسی تعلیم قرآنی کا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ اُس کی رحمتِ واسعہ پر یقین، اُس کے اشدُّ المعاقبین ہونے کا تذکرہ اور اس کی عظمت و کبریائی، اس کے جلال و جبروت کی ثنا سے دعا گزار کی معرفت اور اُس کے حسنِ ظن اور حسنِ ادب کی ترجمانی بھی ہو رہی ہے اور حرفِ دُعا کی حریمِ قدس تک رسائی بھی ہو رہی ہے۔

اِس مقام کی مزید وضاحت کے لیے وصیِ مصطفیٰ امام علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا کا یہ فرمان گرامی چشمِ معرفت کا نور بڑھانے کے لیے نقشِ اکسیر ہے:

''اِنْ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ يَحْسُنَ ظَنُّكُمْ بِاللّٰه وَيَشْتَدَّ خوفُكُمْ مِنه فَاجْمَعُوا بَيْنَهُما فَاِنَّما يَكُونُ حُسنُ ظَنِّ الْعَبْدِ بِرَبِّهٖ علىٰ قَدْرِ خوفِهٖ مِنه وَاِنَّ اَحْسَنَ النّاسِ بِاللّٰهِ ظَنّاً لَاَشَدُّهُمْ خوفاً مِنْهُ''

''اگر تم میں سکت ہو تو ان دونوں اوصاف (حسن ظن باللہ اور خوف و خشیّت) کو جمع کرو کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ بندے کا اپنے رب سے حسنِ ظن اس کے درجۂ خوف کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ اور یقیناً اللہ سے بہترین حسنِ ظن رکھنے والا وہی ہوتا ہے جو اُس سے سب سے زیادہ خوف رکھتا ہے!''

حضرت امام صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی بھی اس باب میں بڑا عقدہ کشا ہے:

''لا یَکُونُ العَبْدُ مؤمِناً حتیٰ یکونَ رَاجِیاً خَائفاً حتیٰ یکونَ عِامِلاً لمَا یَخاف و یرجُو''

''بندہ مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ پُر امید اور خائف نہ ہو اور پُر امید و خائف نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ جس سے خائف اور پُر امید ہے اسی کے لیے عمل نہ کرے''

مجھے جو کچھ کہنا تھا ائمۂ اطہار علیہم السلام کے ارشادات سُنا کر اپنی بات کہہ چکا، اب اِن فقروں کے مفردات پر غور کر لیجیے۔

واو - (وَ) یہاں پر عطف و تَسَلسُل بیان کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور بیانِ حال و اظہارِ کیفیتِ یقین کے لیے بھی، کہ اے معبود! مَیں صرف زبانی حمد و ستائش ہی نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں اس حال میں تیری بارگاہ میں عرضِ حال کر رہا ہوں کہ مجھے ''یقین'' ہے تیری شانِ رحمت پر بھی، تیری قدرت پاداش پر بھی اور تیری عظمت و کبریائی کا بھی!

اَیْقَنْتُ: یہ عربی مادّے (ی ق ن) یَقِنَ یَیْقَنُ سے، جو کہ معتلُّ الفاء یا مثال یائی ہے، ثلاثی مزید کے باب اَفْعَلَ (اَیْقَنَ) سے ماضی واحد متکلم کا صیغہ ہے، اِس کا مصدر ''ایقان'' اردو میں ایمان کے قافیہ اور تابعِ موزوں اور ردیفِ مستقل

کے طور پر خوب استعمال ہوتا ہے۔

اسی مادّے کے فعل ثلاثی مجرد کا مصدر اور اسمِ مصدر ''یقین'' فارسی اردو، ہندی، پنجابی، پشتو اور نہ جانے کتنی زبانوں میں جوں کا توں استعمال ہوتا ہے۔
علامہ اقبالؒ کا اردو کا مشہور شعر ہے۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں!

عربی میں ''اَیقَنتُ'' جب عَلِمتُ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے تو اسے بھی ''افعالِ قلوب'' میں شمار کرتے ہیں ویسے یہ فعلِ قلب ہی نہیں یہی کل کا کل سرمایۂ قلب ہے! اور اسی لحاظ سے علمِ اخلاق، عرفانیات اور علمیات میں علم الیقین، عین الیقین، اور حق الیقین کی اصطلاحوں سے پیمانۂ ادراک و وجدان، مراتبِ علم و ایمان اور درجاتِ قلبِ انسان کا تعیُّن کیا گیا ہے۔

دوسرے افعالِ قلوب (علمتُ، ظَنَنتُ، حَسِبتُ، خِلتُ، رَاَیتُ، زَعمتُ اور وَجدتُ) کی طرح یہ بھی دو مفعولوں پر عمل کرتا ہے۔ جیسے یہاں اَیقنتُ کا پہلا مفعول اَنَّکَ اور دوسرا ارحم الراحمین ہے۔ أنَّکَ کے بعد انتَ، ضمیرِ فصل ہے جو بیک وقت حسنِ خطاب، بیان، تاکید، اور حصر کے معانی بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے!

ان فقروں میں دوسرے کلمات عفو و رحمت، اشد، مُعاقبین، نکال ونقمت، اعظم، متجبرین، کبریاء، عظمت اردو کے عِلمی متون میں اور تصوف کے ادب میں خوب استعمال ہوئے ہیں اور بالکل اجنبی کلمات نہیں ہیں۔

☆☆☆☆☆

(۲)

اذنِ دعا
یا
بابِ قبول

اللّٰهُم اَذِنْتَ لِي فِي دُعَائِکَ وَمَسْئَلتِکَ

فَا سْمَعْ يَاسَمِيعُ مِدْحَتِي وَأَجِبْ يَا رَحِيمُ دَعْوَتِي وَأَقِلْ يَا

غَفُورُ عَثْرَتِي!

اَے مَعبود! تُو نے مجھے دُعا اور طَلَب کی اِجازت دی ہے

تو اَے سُننے والے میری حمد سَماعَت فرما، اے ہمیشہ رحم کرنے والے

میری طلب پوری کر اور اے درگزر کرنے والے میری خطا سے درگزر فرما!

☆☆☆

''اذنِ دعا''

ربِّ کریم کی بے کراں مہربانیوں میں سے ایک بڑی مہربانی ''اذنِ دعا'' ہے! اذنِ دعا کے بجائے خود کئی پہلو ہیں۔

ایک تو یہ کہ اُس نے سب کچھ عطا کر دینے کے بعد بھی مزید طلب کرنے کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ یہ ''حکمتِ ربّانی'' ہے، ایک خاص ''حصۂ وجود'' عنایت فرما کر اُس میں ہر طرح کی وسعت پیدا کرنے کی! اور وہ بھی خود بندوں میں آتشِ شوق کو بھڑکا کر!!

ایک ظاہری پہلو یہ ہے جسے بطورِ مثال وتقریبِ ذہنی، غالبؔ کے اس شعر کے حوالے سے سمجھا جاسکتا ہے۔

اسد شکوہ کفر و دُعا نا سپاسی!

ہجومِ تمنا سے ناچار ہیں ہم!!

تخلیقی یا تکوینی سطح پر تو فطرتِ انسانی میں یا خاکسترِ طبیعت میں پروردگار نے ذوق وشوق کی چنگاریاں دبا کر رکھ دیں تھیں، پھر اگر انسان کو اذنِ طلب نہ ملتا تو

کیا ہوتا؟ اسی لیے اذنِ دعا بھی عطا فرمایا گیا بلکہ اسے عینِ بندگی (عبادت) قرار دیا گیا اور دعا وطلب سے، احتراز، خودداری، روگردانی یا سرگردانی کرنے والے کو ''مُستکبر'' بھی قرار دیا گیا، ارشاد ہوا:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ﴾

(سورۂ غافر۴۰/آیت۶۰)

''اور تمہارے پروردگار نے کہا، مجھ سے دُعا کرو، میں تمہاری دُعا قبول کروں گا، بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے متکبرانہ روگردانی کرتے ہیں وہ بہت جلد ذلت کے ساتھ جہنم میں جائیں گے!''

یہ ﴿ادعونی استجب لکم﴾ دُعا کا اذنِ قرآنی ہے!

اور اب خطیبِ قرآن ترجمانِ رحمان پیغمبرِ آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک بھی ملاحظہ فرمایئے:-

''افضلُ العِبادَاتِ الدُّعاءُ ؛ وَاِذا اَذِنَ اللّٰهُ لِعَبْدِ في الدُّعاءِ فَتحَ لَهُ بابَ الرَّحْمَةِ اِنَّهُ لَن يَهلِکَ مَعَ الدُّعاءِ اَحد''۔

''بہترینِ عبادات دعا ہے! اور جب اللہ اپنے بندے کو اذنِ دعا عطا فرماتا ہے تو اس کے لیے رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہے، یقیناً دعا کے ساتھ (اذنِ دُعا کے ہوتے ہوئے یا ربّ کریم سے رشتۂ دعا کے برقرار رہتے ہوئے) کوئی بھی ہلاک نہیں ہوسکتا!''

اِسی کے ذیل میں وصیِ رسول حضرت امیر المومنین مولیٰ علیِ مرتضیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی نظر میں رکھیے:

"مَا کَانَ اللّٰہُ لیفتح بَابَ الدُّعاءِ و یُغلقَ بابَ الاِجَابۃِ"

"معبودِ برحق ایسا نہیں کرسکتا کہ بابِ دُعا تو کھولے اور بابِ اجابت، بابِ قبولیت بند رکھے"۔

اور آپؑ کا یہ ارشاد:

"مَنْ اُعطِیَ الدُّعاء لَمْ یَحرُمِ الاِجابۃ"

"جسے دعا عطا کی گئی وہ قبولیت سے محروم نہیں ہوا"

آپؑ ہی کا ایک اور ارشاد بھی ہے، جس میں آپ نے بطورِ خاص اذنِ دُعا کی حکمت وشانِ رحمت پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے فرزند امامِ حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے نام وصیت نامے میں تحریر فرماتے ہیں:

"وَاعْلَمْ اَنَّ الَّذِي بِيَدِهٖ خزائنُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ قَدْ اَذِنَ لَکَ فِي الدُّعاءِ وتکَفَّلَ لَکَ بالاِجَابَۃِ واَمَرَکَ اَنْ تَسْئَلَہٗ لِيُعْطِيَکَ

(نہج البلاغہ، نسخہ صبحی صالح، ص ۳۹۸)

"اور یہ جان لو کہ جس کے ہاتھوں میں آسمانوں اور زمین کے خزانے ہیں۔ اُس نے تمہیں اذنِ دُعا عطا فرمایا ہے اور تمہارے لیے قبولیت کا ذمہ لیا ہے اور تمہیں حکم دیا ہے کہ اس سے مانگو تا کہ وہ تمہیں عطا کرے!"۔

وصیت نامے کے اِس کے بعد کے جملے بھی بے حد اہم ہیں اور اَسرار کشا ہیں، رَمزِ دُعا کے جویا نہج البلاغہ کا مطالعہ کر کے ان جملوں سے مزید استفادہ کر سکتے ہیں۔

ان تمام ارشادات کا خلاصہ یہی ہے کہ ربِّ کریم نے ہمیں اذنِ دُعا مرحمت فرمایا ہے اور نہ صرف یہ اذن مرحمت فرمایا ہے بلکہ اسی اذن میں وعدۂ قبولیت

بھی مضمر ہے! اَب یہ حسنِ دُعا یا انتہائی حسن طلب ہے کہ دعا گزار کچھ عرض کرنے، کچھ طلب کرنے سے پہلے انتہائی احسان مندی کا اظہار کرتے ہوئے پہلے اُس مولا جلّ وعلیٰ کے اذنِ طلب ہی کا تذکرہ کرتا ہے کہ یہ حصولِ اذن کا شکرانہ بھی ہے۔

☆☆☆

اس فقرے میں کوئی لفظ یا ترکیب ایسی دشوار نہیں ہے جس کی لغوی یا نحوی تشریح کی ضرورت ہو۔ پھر بھی لفظِ اذن کی رعایت سے یہ تذکرہ مجلسِ درس کی زینت ضرور ہوگا کہ اذن، اجازت دینے کو کہتے ہیں اور اسی مادّے سے لفظِ اَذان ہے جس کے معنی اِعلانِ عام یا دوسرے الفاظ میں ''اذنِ عام'' کے ہیں۔ ''اذانِ نماز'' ربِّ کریم کے دربارِ عام میں حضوری کے بہترین وقت کا اعلانِ عام اور اس کو چاہنے والے اُس کے بندوں کے لیے انعامِ خاص ہے!

قرآن مجید میں لفظ ''اَذَان'' حضرت امیر المومنین کی ذاتِ گرامی کا استعارہ ہے کیونکہ آپؑ ہی نے خدا اور رسولِ خداؐ کی جانب سے سورۂ برأت کی تبلیغ کا خصوصی امتیاز اور کفار و مشرکین سے بیزاری کے اعلانِ عام کا شرف حاصل کیا تھا۔ جسے آپؑ کے عظیم ترین خصائص اور آپ کی خلافتِ الٰہیہ کے دلائل میں شمار کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

فَاسْمَعْ يَا سَمِيعُ مِدْحَتِي وَاَجِبْ يَا رَحِيمُ دَعْوَتِي...

تو اَے سُننے والے میری حمد سماعت فرما اور اے ہمیشہ رحم کرنے والے میری طلب پوری کر!

یہ الحاح ہے یعنی حسنِ التجا ہے۔ الحاح کے لفظی معنی ہیں: گریہ وزاری،

عاجزانہ اصرار، گڑگڑانا وغیرہ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ السَّائِلَ اللَّحُوح''

''اللہ الحاح یا عاجزانہ اصرار کے ساتھ مانگنے والے کو پسند فرماتا ہے''۔

اللہ کے معصوم بندوں نے آدابِ دُعا میں تعلیم فرمایا ہے کہ:

''رَحِمَ اللّٰهُ عَبْداً طَلَبَ مِنَ اللّٰهِ شیأً فَاَلَحَّ عَلَیهِ''

اللہ رحمتِ خاص فرمائے اس بندے پر جو اللہ سے طلب کرے تو الحاح و زاری، (عاجزانہ اصرار) بھی اختیار کرے''

بلکہ مشیتِ الٰہیہ کے اداشناسوں نے یہاں تک ارشاد فرمایا کہ:

''اِنَّ الْعَبْدَ لَیَدعُوا اللّٰهَ وَهُوَ یُحِبُّهٗ فَیَقُولُ لِجبرئیلَ اِقْضِ لِعَبْدِي هٰذا حَاجَتَهٗ وَاَخِّرْهَا فَاِنِّي اُحِبُّ اَنْ لَا اَزالَ اَسْمَعُ صُوتَهٗ''

یہ بھی ہوتا ہے کہ بندہ معبود سے دعا کرتا ہے اور معبود اسے پسند کرتا ہے تو جبرئیل سے فرماتا ہے کہ میرے اس بندے کی حاجت پوری کردو لیکن اسے تاخیر سے دو اس لیے کہ میں چاہتا ہوں کہ ''اس کی آواز سنتا رہوں''

''وَاِنَّ الْعَبْدَ لَیَدعُوا اللّٰهَ عَزَّ وَ جَلَّ وَهُوَ یُبْغِضُهٗ فَیَقُول: یَا جِبْرئیل اِقْضِ لِعَبْدِي هٰذا وَعَجِّلْهَا فَاِنِّي اُکْرِهُ اَنْ اَسْمَعَ صَوتَه''

''اور یہ بھی ہوتا ہے کہ بندہ معبود سے دعا کرتا ہے اور معبود اسے ناپسند کرتا ہے تو فرماتا ہے اے جبرئیل اس بندے کی دعا پوری کردو اور جلدی کردو اور اس لیے کہ میں اس کی آواز سننا نہیں چاہتا''۔

یہ حدیث نبویؐ ہے۔ اِس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بندہ اپنی ذات میں

بھی ، اپنی دعا میں بھی اور اندازِ دُعا، سلیقۂ عرضِ تمنا، طریقِ بیانِ آرزو، اپنی زبان، آواز، اور اَدا میں بھی ربِّ کریم کی پسندیدگیوں کا پورا پورا لحاظ رکھے! اور دعا جلد مستجاب ہوتی ہوئی نظر نہ آتی ہو تو نا امید نہ ہو، بلکہ الحاح وزاری میں اس لیے بھی، اس امید پر بھی، اضافہ کردے کہ ممکن ہے ربِّ کریم اُس کی فریاد و فغاں کو سننا پسند کر رہا ہو!

اِس وقت مجھے سید احمد حسین امجدؔ حیدرآبادی کی یہ رباعی یاد آرہی ہے:

ہردم اس کی عنایت تازہ ہے
اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہو کھٹکھٹائے جاؤ
یہ دستِ دعا خدا کا دروازہ ہے!

☆☆☆

اس فقرے میں الفاظ مشکل تو نہیں ہیں۔ تاہم کچھ غور کرلینے میں حرج بھی نہیں ہے۔ فَاسْمَعْ میں ف، حروفِ عاطفہ میں سے ہے۔ تفریعِ بیان کا فائدہ بھی دیتا ہے۔

اِسْمَعْ ، اَجِبْ اور اس کے بعد والے فقرے میں اَقِلْ ، یہ سب حسبِ ظاہر صیغۂ امر ہیں لیکن حسبِ مقام اِسے صیغۂ دُعا کہنا چاہیے!

مِدْحَت کے معنی یہاں پر نِری مدّاحی نہیں ہے بلکہ حقیقی حمد و ثنا ہے۔ مدْحَت کا لفظ ہماری زبان میں خوب مستعمل ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کے ایک نعتیہ قصیدے کا مطلع ہے۔

بنے ہیں مدحت سلطانِ دوجہاں کے لیے
سخن زباں کے لیے اور زبان دہاں کے لیے

یا مثنوی گلزارِ نسیم کے تمہیدی اشعار میں ہے:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر حمدِ حق و مِدحتِ پیمبرؑ

☆☆☆

وَاَقِلْ یَا غَفُورُ عَثْرَتِي!!

اور اے درگزر کرنے والے میری خطا سے درگزر فرما!

اس فقرے میں ''اقل'' اور ''عثرتی'' دو کلمات ایسے ہیں جو اردو زبانوں کے لیے بالکل اجنبی ہیں؛ (اگرچہ اِقالَہ۔بعض علمی مقالات یا کتب میں استعمال ضرور ہوا ہے بمعنیٰ معافی چاہنا یا بیع کو مسترد کرنا)۔

اَقِلْ – اَقَالَ، یُقِیلُ، اِقَالَۃً (ثلاثی مزید، معتل العین یا اجوف یائی) سے صیغۂ امر ہے۔ یہاں حسب مقام اِسے صیغۂ التجا یا صیغۂ دعا کہنا زیادہ مناسب ہے۔

ترجمہ ہوگا: ''مجھے بخش دے''۔ فقہِ اسلامی یا مجموعۂ قوانین الٰہی و انسانی کے حصۂ معاملات میں ''اِقالہ'' طے شدہ معاملہ کو توڑ دینے کی نیازمندانہ درخواست کو کہتے ہیں۔

امامِ صادق علیہ السلام کی حدیث ہے:

''اَیُّمَا عَبْدٍ مُسْلِمٍ اَقَالَ مُسلِماً فِي بَیعٍ اَقَالَهُ اللّٰهُ عِثْرتَه یَومَ القِیَامَةِ''

''جو بندۂ مسلم کسی مسلم کو کسی معاملۂ بیع میں بخشے گا پروردگار روزِ قیامت اُس کے گناہ کو بخشے گا!''

عَثرہ، غلطی، گناہ یا لغزش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ ''ع ث ر'' عَثَر کے مادّے میں معنویت کچھ اور ہے اور اس کے دوسرے مشتقات میں بڑا حسن بھی ہے۔

جملے کا مفہوم بہت واضح ہے۔ اس مفہوم کا تعلق ''توبہ'' کے موضوع سے ہے جس کا بیان دعا کے دوسرے کلمات کے ضمن میں آئے گا۔ گزشتہ فقروں کے ساتھ یہاں پر یہ جزوِ الحاح وزاری ہے! اور اس کے بعد کے فقرے بھی حسنِ التجا اور حسنِ ثنا کے مصداق ہیں۔

☆☆☆

فَکَمْ یَا اِلٰهِي مِنْ کُرْبَةٍ قَدْ فَرَّجْتَهَا وَهُمُومٍ قَدْ کَشَفْتَهَا وَعَثْرَةٍ قَدْ اَقَلْتَهَا وَ رَحْمَةٍ قَدْ نَشَرْتَهَا وَحَلْقَةِ بَلَاءٍ قَدْ فَکَکْتَهَا۔

نہ جانے کتنے دکھوں کو اے معبود تجھی نے دور کیا اور نہ جانے کتنے رنج تجھی نے مٹائے ہیں اور نہ جانے کتنی خطائیں تجھی نے درگزر فرمائی ہیں اور نہ جانے کتنی رحمتیں تجھی نے سایہ فگن کی ہیں اور نہ جانے کتنی بلاؤں کے پھندے تجھی نے کھولے ہیں۔

ان فقروں کے مضامین ترجموں ہی سے واضح ہو جاتے ہیں۔ مفردات الفاظ سے بحث مقصود بالذات نہیں ہے۔ اِن فقروں کے اکثر بلکہ تمام تر الفاظ ہماری زبان میں مستعمل ہیں۔ بعض تو جوں کے توں استعمال میں آئے ہیں، بعض تلفظ یا معنی میں تھوڑے سے تصرف کے ساتھ۔ جنہیں تحقیقِ الفاظ کا شغف ہو اُن کے لیے لغات اور قوامیس کے دفتر کھلے ہوئے ہیں۔

میں بطورِ مثال اتنا عرض کر دیتا ہوں کہ ''کم'' ''یا الٰہی'' کُربَت (جس

سے کرب ہے کربِ زندگی، کربِ آگہی، کرب و بلا) فَرَّجْتَهَا (جس کے ثلاثی مجرد سے فَرَج بمعنیٰ کشایش ہے اردو کے عام ادب میں نہ سہی مذہبی ادب میں فَرَجِ حسین، فَرَجِ عاجل وغیرہ ترکیبیں مستعمل اور اہلِ علم طبقہ کے زبانوں پر جاری ہیں۔

اسی طرح هُمُوم، هَم (هَم وغَم) جمع، کشف، رحمت، نشر، حلقہ، بلاء (بلا) یہ سب الفاظ کسی نہ کسی طرح اردو میں مستعمل ہیں اور اہلِ اردو ان سے مانوس ہیں۔ آخری لفظ ''فَکَکْتَهَا''۔ میں لفظ ''فک'' اردو ادب اور قواعد کی زبان میں جاری و ساری ہے۔ فَکْ یعنی ایک سابقہ چھوٹنا، ''فَکُّ الرہن'' رہن کی ہوئی چیز کو چھڑانا، فک اضافت یعنی اضافت کی علامت کو نہ پڑھنا جیسے صاحبِ دل کے بجائے صاحب دل پڑھنا یا کہنا۔

ہم کہ ہماری اضافت گناہ کے ساتھ ناقابلِ تفکیک ہے، ہم نفوس کو نافرمانیوں اور نافرجامیوں کا ''رہین'' بنا چکے ہیں، ہم کہ سراپا، سراسر معاصی ہیں، بس وہی معبودِ برحق ہے جو اپنی رأفت و رحمت سے ہمارے لیے فک 'رہن' فکِ اضافت اور فکِ حلقۂ بلا کرنے والا ہے!

(۳)

نمودِ توحید

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ صَاحِبَةً وَلاَ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيراً.

''تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے جس نے نہ کوئی بیوی اختیار کی نہ کوئی بیٹا اور نہ کوئی اس کی پادشاہی میں شریک ہے اور نہ کوئی فرومائگی میں اس کا سرپرست (اے بڑائی کرنے والو!) بڑائی کرو اسی کی جیسی اس کی بڑائی کرنی چاہیے۔''

شروع میں اجمالاً آدابِ دعا بجالائے گئے۔ ایک ایک دو دو کلمات میں حمد و ثنا ہوئی اور مغفرت کی درخواست کی گئی۔ اب اس فقرے سے آئندہ مسلسل ۱۸ فقروں تک، مختلف الفاظ و عبارات، مختلف انداز و اسالیب میں، حمد و ثنا، سپاس و ستائش اور شکر و مدحت کے مراتب ادا کیے گئے ہیں۔ جن میں ''توحید شناسی'' کے اسباق بھی مضمر ہیں۔ اور جن سے دعا کی شان میں، متن کے شکوہ میں اور اس عرضِ حال کے حسن و جمال میں بھی بے انتہا اضافہ ہوتا ہے۔

یہ فقرہ بطورِ خاص ''توحیدِ ذات'' یا ''توحیدِ صمدی'' کے اقرار و بیان پر مشتمل ہے۔

''علمِ توحید'' قرآنِ مجید سے حاصل ہونے والے علوم میں سب سے اہم، سب سے مُہم، سب سے خاص، سب سے اشرف اور ساتھ ہی سب سے اَدَق اور مشکل علم ہے بلکہ ''توحید'' ہی قرآنِ مجید کا اساسی اور بنیادی موضوع ہے۔ اس لیے اس موضوع سے سرسری طور پر نہیں گزرا جا سکتا۔

ظاہر ہے کہ توحید کے حقیقی مراتب تو اپنی جگہ پر ہیں، اقرارِ توحید کے مراتب بھی گوناگوں ہیں! ایک مرتبہ وہ ہے جو ہمارے 'عوام کالانعام' کا مرتبۂ اقرار

ہے، اور ایک مرتبہ وہ ہے جو متوسط درجے کے بافہم مومنین کا ہے جبکہ ایک مرتبہ اقرار وہ ہے جو خاصانِ خدا کا ہے کہ خود اس مرتبۂ اقرار کا سمجھنا عوام الناس وعامّۃ الناس بلکہ اکثر علمائے ظاہر پرست تک کے لیے سخت دشوار ہے!

''حقیقت توحید''

''حقیقتِ توحید'' ایک شے ہے، اس کا فہم وادراک، اس کی معرفت، اس کا یقین، اس کا شہود اور کشف دوسری شے ہے اور پھر اس کا اقرار و بیان تیسری شے ہے۔ اور ان تمام حقائق و مراتب کے بے شمار مراتب ہیں۔ بلکہ مشہور قول ہے کہ ''الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق''[1] ''اللہ تک پہنچنے کے راستے اس کے مخلوقات کی تعداد کے برابر ہیں''۔ یہ حدیث نہیں ہے، کسی خدا پرست فلسفی کا قول ہے، لیکن ہے بہت معنی خیز۔ میں نے یہاں پر اس کا بہت سطحی سا ترجمہ کر دیا ہے۔ اس قول کے پیش کرنے کا مقصد یہ عرض کرنا ہے کہ حقیقت توحید کے باب میں اتنی مختلف تعبیریں ہیں جن کا احاطہ اس وقت ممکن نہیں ہے۔ پھر میرے پیش نظر حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ایک ارشاد ہے، فرماتے ہیں:

''اِنَّ کَلامَ الحُکَمَاءِ اِذَا کَانَ صَوَاباً کَانَ دَوَاءً وَ اِذَا کَانَ خَطْأً کَانَ دَآءً'' حکماء یا فلاسفہ کی بات اگر فی الواقع وفی نفس الامر درست ہوتی ہے تو دوا ہے۔ اور اگر غلط ہوتی ہے وہ مرض بن جاتی ہے!

---

[1] ملک الشعراخاقانی ہند استاذ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے اس جملے سے استفادہ کرتے ہوئے کیا اچھا مضمون پیدا کیا ہے۔ ان کا شعر ہے۔

نفس کی آمد و شد ہے نمازِ اہلِ حیات
جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو دیوانِ ذوقؔ ۲۹۲

اس ارشادِ علوی کا مفہوم ظاہر ہے کہ فلسفی کو انتہائی تحقیق اور حصولِ یقین کے بعد لب کشائی کرنی چاہیے اور فلاسفہ کے اقوال پڑھنے اور سننے والوں کو بھی بیحد غور و تامل کے بعد اسے قبول کرنا چاہیے۔ بہر حال میرا مبنیٰ، میری بنیادِ فکر یہ ہے کہ اس باب میں قرآن مجید، احادیث نبویؐ اور ارشاداتِ ائمہ دینؑ ہی پر دار و مدارِ بحث رکھنا چاہیے۔ کہ ''قرآن'' اور یہ ترجمانانِ وحی و فرقان بطورِ خاص ''بیانِ توحید'' کے ذمہ دار، عہدیدار اور متکفّل ہیں۔ یہی علمِ توحید کے حقیقی سر چشمے ہیں۔ اِن کے علاوہ کسی اور چشمے سے جُرعہ کشی، کسی دوسرے ماخذ سے کچھ حاصل کرنا، کسی بھی طرح خطا سے مامون اور خطرے سے خالی نہیں ہے۔

قرآنِ مجید کے اکثر آیات سے معارفِ توحید مستفاد ہوتے ہیں۔ لیکن بعض مقامات زیادہ اہم اور ''کلیدی'' حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً

(ا) سورۂ مبارکہ کہف کی آخری آیت، جس کے متعلق تفسیر درِ منثور میں طبرانی اور ابنِ مردویہ کی تخریج کردہ یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ ابو حکیم نے کہا: حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لَو لَم ینزِل علیٰ اُمّتی اِلّا خاتِمَةَ سورةِ الکهفِ لکَفَتهُم.**

''اگر میری اُمت پر کچھ بھی نازل نہ ہوتا سوائے خاتمۂ سورۂ کہف کے تو یہی آیت اُن کے لیے کافی ہوتی!''

اَب آیت کی تلاوت فرمائیں:

''**قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ**

اَحَداً۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت ''توحیدِ ذاتی وصمدی'' اور ''توحیدِ عبادی'' کے مضامین کے علاوہ بھی اپنے ایک ایک حَرف میں ایک ایک جہانِ معنی چھپائے ہوئے ہے۔

(۲-۳) توحید کے باب میں قرآن مجید کے دواور مقامات ایسے ہیں کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا ارشاد ہے: ''چونکہ خداوند عالم کو علم تھا کہ آخری زمانہ کے لوگ دقیق اور عمیق فکر ونظر کے حامل ہوں گے اسی لیے پروردگار نے سورۂ'' قل ھو اللہ احد ''اور سورۂ حدید کی ابتدائی آیتیں ''وھو علیم بذات الصدور '' تک نازل فرمائیں۔اور جو بھی اِس کے آگے فکر کرے گا وہ ہلاک ہوگا''۔

اس روایت سے چند نکات کا استفادہ ہوتا ہے۔اولاً یہ کہ وہ حقیقت توحید جو فطرتِ انسانی میں خمیر کی گئی ہے اس کا ادراک، اس کا اکتشاف یا انکشاف اور اس کے اقرار و بیان کی جو سطح نزول قرآن تک تھی، نزول قرآن (سورۂ توحید اور بعد کے دوسرے آیات مثلاً مطلعِ سورۂ حدید وغیرہ کے نزول) کے بعد وہ سطح بقدِ آسمان بلند ہوگئی ہے۔(اسی لیے میں نے علم ''توحید'' کو ان علوم میں شمار کیا ہے جو عالم بشریت کو بہ فیضِ قرآن نصیب ہوئے ہیں۔ورنہ سبھی انبیاء اقرارِ توحید ہی کا پیام لے کر آئے تھے!)

ثانیاً: اس روایت سے حقیقت توحید کے باب میں فکر و تعمق کی فی الجملہ

اجازت بھی مستفاد ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ حکمائے اسلام نے قرآن مجید کے آیات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیز ائمہ دین علیہم السلام کے ارشادات کی روشنی میں حکیمانہ تفکر کا حق ادا کرنے کی کوششیں بھی کی ہیں۔ اور یقیناً ایسے ہی حکماء کے اقوال مریضانہ ذہن و فکر رکھنے والوں کے لیے دوا کی حیثیت اور شفا کی تاثیر رکھتے ہیں۔

اور ایسے ہی حکماء کے بارے میں امام زین العابدین علیہ السلام کا ارشاد ہے: ''ھلک مں لیس لہ حکیم یرشدہ'' (جسے کوئی مستحکم دانائی رکھنے والا (حکیم) راہنما میسر نہ ہوگا وہ ہلاک ہوگا!)۔

(کشف الغمہ ط ۱۲۹۴ص ۲۰۹)

یہ ظاہر ہے کہ ہر کس و ناکس اس موضوع کی تاب نہیں لاسکتا، حکیم سنائی غزنوی کی بیت ہے۔

بارِ توحید ہر کسی نکشد
طَعُمِ توحید ہر خسی نہ چشد

یا مشہور صوفی شاعر عطار کا شعر ہے۔

اُو بہ سر ناید زخود آنجا کہ اوست
کَے رسد عقلِ وجود آنجا کہ اوست

اسی طرح حکیمِ مشرق شیخ الرئیس ابن سینا نے ''الاشارات والتنبیہات'' میں اشارہ کیا ہے اور کیا خوب افادہ کیا ہے:

[اشارۃ: جَلَّ جناب الحق عن أنْ یَکونَ شریعۃً لِکُلِّ

وارِدٍ أو يطّلِعَ عليه اِلاَّ وَاحِدٌ بَعْدَ وَاحِدٍ]

حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ ہر راہ رو کے لیے چشمہ سرِ رہ گزار یا تماشا گہِ راز بن جائے، مگر یہ کہ ہمیشہ ''ایک'' کے بعد ''ایک'' بلند سے بلند تر چشمِ اخلاص رکھنے والے اس کی جناب میں ضرور بار پاتے رہے ہیں...''

معصومین کی تو بات ہی اور ہے۔ وہ تو ہر حال میں ''اسی کے ہیں'' اور اپنی ہر ہر سانس اس کے لیے وقف کر چکے ہیں۔

اُن کا پیکر ہے پیکر قرآن
اُن کی ہر سانس ایک آیت ہے!

ان کے ارشادات سے فائدہ اٹھا کر اٹھنے والوں میں بھی ایسے مل جاتے ہیں کہ صدیوں تک کے انسانوں کی ذہنی اور فکری، عملی اور نفسی تربیت اور ہدایت کا سامان کر جاتے ہیں، اَیسے ہی افراد میں ایک جناب خواجہ نصیرالدین محمد بن حسنِ طوسی بھی گزرے ہیں، جنہیں دنیا ''محقق طوسی'' کے نام سے جانتی ہے۔ اور ایک جناب صدرالدین محمد بن ابراہیم شیرازی جنہیں لوگ ملا صدرا کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

جناب محققِ طوسی نے علمِ کلام میں اور جناب ملا صدرا نے حکمت وعرفان میں وہ آثار ونظریات اور کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جو کسی بھی سنجیدہ طالب علم کو قرآن وحدیث کے سرمائے کے بعد تمام دنیا کے فلسفے اور علوم سے بے نیاز کر دینے کے لیے کافی ہیں۔

جن کے لیے توحید ایک ''مسئلہ'' ہو ان کے لیے علم کلام کا سہارا لینا ضروری ہو جاتا ہے، اور جن کے لیے حقیقتِ توحید ایک طلب، ایک چاہت، ایک عشق اور ایک وجدانی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے ان کے لیے حکیمانہ اور عرفانی مطالب خنکیِ چشم و دل بن جاتے ہیں۔

علم کلام میں اثباتِ باری تعالیٰ کے لیے ''وجود'' کی تقسیمِ سہ گانہ (وجودِ واجب، وجودِ ممکن اور وجودِ ممتنع) بطلانِ دَور و تسلسل اور اثباتِ حدوثِ عالم وغیرہ کے مقدمات طے کیے جاتے ہیں، جناب خواجہ کی مؤجز اور متین فلسفیانہ نثر نے اپنے مثالی اسلوب میں ان تمام دلائل و مقدمات کو اس طرح پیش کیا ہے:

''الوجود ان کان واجباً فھو المطلوب و اِلا اِستلزمهُ لاستحالة الدور والتسلسل''

''وجود اگر واجب ہے تو وہی مطلوب ہے ورنہ (کوئی بھی وجودِ ممکن و موجودِ ممکن) وجودِ واجب کو مستلزم ہے کیونکہ دور و تسلسل تو محال ہی ہیں!''

ہم صرف حوالے کے طور پر یہ جملے یہاں ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں ورنہ اِن کی تفصیل حدِّ کتاب سے مُتجاوز ہو جائے گی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ رب الارباب، خالق کائنات، معبود برحق عزّ اسمہ و جل شانہ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر دلائل کی کمی نہیں فطرتِ پاک اور ذہن چالاک یا طبع سلیم کے لیے:

هر گیاهی که از زمین روید
وحده لاشریک له گوید

تقریباً اسی مفہوم میں عربی کا یہ شعر بھی بہت مشہور ہے۔

وفی کل شیٔ لہ آیۃ   تدل علی انہ الواحد

حیف ہے کہ اس شعر کو تو نقل کیا جائے لیکن عربی کا وہ مصرع نہ دہرایا جائے جسے نبی کریمؐ نے یہ کہہ کر داد دی تھی کہ ''اصدق کلمۃ قالھا شاعر قول لبید'' ''سب سے سچا قول جو کسی شاعر نے کہا ہے وہ لبید کا قول ہے''(۱)

''آلا کُلُّ شیءٍ ما خلا اللہ باطل''

''آگاہ ہو ہر شی ہے بجز حق، باطل''

جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر اپنی ایک رباعی بھی سُنا تا چلوں:

ہے خیر سے معمورۂ ہستی آباد
معدوم ہے امکان میں شر کی بنیاد
لبریز ہے توحید کے مضمون سے علم
ہے جہل فقط دلیلِ شرک و الحاد!

☆☆☆

(۱) لبید بن ربیعہ عربی کے ان سات بڑے شاعروں میں سے ہیں جنھیں اصحاب معلقات کہتے ہیں۔ یعنی جن کے قصیدے مشہور ہے کہ خانۂ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کیے گئے تھے۔ (امرؤالقیس، طرفہ بن عبید بکری، زہیر بن ابی سلمیٰ، لبید، عمرو بن کلثوم، عنترہ بن شداد، حارث بن حلزہ)۔ ان میں سے سب سے زیادہ عمر لبید ہی نے پائی اور زمانۂ اسلام کو بھی درک کیا، مشرف بہ اسلام ہوئے، اور بہترین مسلمانوں میں ثابت ہوئے، کہتے ہیں کہ زمانۂ اسلام میں انہوں نے قرآن مجید کی شانِ فصاحت و بلاغت کے پیش نظر شعر گوئی ترک کردی تھی اور اس

الحمد للہ اذ لم یاتنی اجلی   حتیٰ کسانی من الاسلام سربالا

''اس معبود کا شکر جس نے مجھے اُس وقت تک موت نہیں دی جب تک کہ مجھے لباس اسلام عطا نہیں فرمایا''۔

...جو مصرع اوپر درج کیا گیا وہ غالباً اسلام قبول کرنے سے قبل ہی اپنی فطرت سلیمہ کی ترجمانی میں کہا، اس کا پہلا مصرع یہ ہے

ع   وکل نعیم لامحالۃ زائلُ

اور اس کے بعد کا شعر یہ ہے۔

سویٰ جنۃ الفردو، اِن نعیمھا ☆ یدوم و ان الموت لا بد نازل

اردو کے مَردِ قاموس، عظیم دانشور ادیب، نقاد، مبصر، مستبصر، اور کلاسیکی طرز کے شاعر مولانا امداد امام اثر کا بھی ایک شعر یاد آ گیا ہے سنتے جایئے:

محتاجِ دلائل نہیں اثباتِ الٰہی
اے فلسفی رکھ چھوڑ براہینِ حِکَم کو!

علم کلام کے بعض مقدمات اور دلائل کی طرف اشارہ ہو چکا، دلائلِ حکمت اور براہینِ عرفان میں سب سے اہم ''بُرہانِ صدّیقین'' ہے جسے جناب ''ملا صدرا'' (صدر الدین شیرازی) نے اپنے متعدد مصنفات میں بار بار پیش کیا ہے، منجملہ ان مقامات کے ان کی ایک عبارت یہ ہے:

''لولم تکُن حقیقةُ الوجودِ موجودة لم یکن شیٌٔ من الاشیاء موجوداً، لکِنَّ اللازم باطلٌ بدیهةً فکذا الملزوم''

''اگر حقیقت وجود موجود نہ ہوتی تو کوئی بھی شیٔ موجود نہ ہوتی، لیکن یہ لازم بدیہی طور پر باطل ہے (کہ عالم اشیاء ہمارے سامنے موجود و معمور ہے) ناچار ملزوم بھی باطل ہے''۔

یہ بھی میں نے صرف حوالے کے طور پر ذکر کر دیا اس کی بھی شرح کا موقع نہیں ہے۔ اب باب ''توحیدِ صمدی'' کے باب میں ایک روایت حضرت امام حسینؑ سے نقل کر کے اس بحث کو ذرا اور آگے بڑھاتے ہیں۔ حقیقتِ توحید کے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے سورۂ اخلاص (سورۂ قل ھو اللہ احد) کی اہمیت کی طرف زبان معصوم سے اشارہ گزر چکا۔ اس سورۂ مبارکہ میں لفظ ''صمد'' کے معنی پر علماء نے بہت بحثیں کی ہیں۔ علامہ صدوقؒ نے اپنی کتاب ''التوحید'' میں وہب ابن وہب

قرشی سے بہ روایت حضرت امام صادق علیہ السلام یہ واقعہ اور یہ خط نقل فرمایا ہے کہ اہل بصرہ نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں لفظِ ''صمد'' کے معنی دریافت کرنے کے لیے لکھا تو آپ نے اُن کے جواب میں لکھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَمّا بعد! فلا تخوضو فی القرآن و لا تجادلوا فیہ، ولا تتکلموا فیہ بغیر علم! فقد سمعت جدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ یقول: من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوّأ مقعدہ من النار. واَن اللہ سبحانہ فسر الصمد فقال: اللہ احد. اللہ الصمد، ثم فسر لم یلد ولم یولد و لم یکن لہ کفواً احد.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امّا بعد! تم لوگ قرآن میں غوطہ زنی نہ کرو اور نہ اس میں جھگڑو، اور ''علم'' کے بغیر کلام نہ کرو، کہ میں نے اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا: جو قرآن کے بارے میں بغیر علم کے کلام کرے وہ دوزخ میں اپنی جگہ بنا لے۔ اللہ سبحانہ نے لفظِ صمد کی (خود ہی) تفسیر کردی ہے، اُس نے فرمایا: اللہ احد (یگانہ) ہے، اللہ صمد (بے نیاز مطلق) ہے۔ پھر اس کی تفسیر کی کہ نہ وہ جنم دیتا ہے نہ اس نے جنم پایا، اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

توحید کے مراتب میں توحیدِ ذات، توحیدِ صفات، توحیدِ افعال اور توحیدِ عبادت کے عناوین پر بار بار اشارے آتے رہیں گے لیکن تبرکاً اس مقام پر توحید عبادی کے باب میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشاد مبارک نقل کرنا

چاہتے ہیں۔

''درِ منثور میں بہ سندِ متصل شداد بن اوس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مَنْ صَلّی یُرآئِي فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ صَامَ یُرآئِي فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَآئِي فَقَدْ اَشْرَکَ ثُمَّ قَرَأَ : فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلاً صٰلِحاً وَلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَداً''

جس نے دِکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے روزے میں ریا کو دخل دیا اس نے شرک کیا اور جس نے زکاۃ دینے میں ریا سے کام لیا اس نے شرک کیا، یہ فرمانے کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ''جو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ نیک اعمال انجام دے اور اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔''

☆☆☆☆☆

(۴)

جمالِ توحید

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بِجَمِیْعِ مَحَامِدِهٖ کُلِّهَا عَلٰی جَمِیْعِ نِعَمِهٖ کُلِّهَا

یعنی ''تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے اس کے تمام اوصاف حمیدہ کے ساتھ، اس کی تمام نعمتوں پر'' یا چاہیے تو یوں کہہ لیجیے:

''تمام شکر اسی معبود کا اس کی تمام اچھائیوں کے ساتھ اس کی تمام نوازشوں پر!''

☆☆☆

اس جملے میں کوئی مشکل، غریب یا نامانوس لفظ نہیں ہے۔ بلکہ صرف اردو زبان جاننے والوں کے لیے بھی کوئی اجنبی لفظ نہیں ہے۔ ترکیب اور اضافتوں کا سحرِ حلال ہے جو کسی بھی عربی یا عجمی کو مسحور کر سکتا ہے۔

''الحمد'' تمام تعریفیں، ساری ستائش، سارا شکر!

''لله'' معبود برحق کے لیے یا معبود کی!

''جمیع'' سب، تمام، کل،

''بجمیع'' سب کے ساتھ یا سب کے ذریعہ،

''محامِد'' یہ ''محمدة'' کی جمع ہے، یہ واحد (محمدة) تو اردو میں مستعمل نہیں ہے لیکن اس کی جمع محامد ہماری ادبی اور شعری زبان کا حصہ ہے۔ محامد یعنی خوبیاں، نیک خصلتیں، اوصاف حمیدہ، اور فیلسوف نامی، عارف گرامی مولانا ھادی سبزواری کا یہ شعر بھی حرز جان رہے تو بہت اچھا ہے:

یَا وَاهِبَ الْعَقْلِ لَکَ الْمَحَامِدُ
اِلٰی جَنَابِکَ انْتَهَی الْمَقَاصِدُ

''محامدہٖ'' میں ''ہ'' ضمیرِ متصل، مضاف الیہ ہے۔ اُس کی خوبیاں، اُس کے صفات۔

''نِعَمِہٖ'' میں بھی یہی ''ہ'' ہے، اور لفظِ نِعَم نعمت کی جمع ہے۔ یہ واحد اور جمع دونوں اردو میں خوب مستعمل ہیں، 'ناز ونعم' کی ترکیب ہمارے محاورات اور روزمرہ کا جُز ہے۔

☆☆☆

اس فقرے میں توحیدِ صفات اور توحید افعال کا اعتراف اور بیان ہے۔ بابِ توحید میں صفات ہی کی بحث ''جانِ سخن'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ ایک عِلَّۃ العلل اور واجبُ الوجود کا مان لینا دہریِّین یا ملحدین کے لیے کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ ساری بحث ان صفات کے ساتھ متصف ذاتِ واجب کو تسلیم کرنے میں ہے، جن صفات کو صفاتِ ثبوتیہ اور صفاتِ سلبیہ کے عناوین کے ذیل میں بیان کیا جاتا ہے — برسبیلِ تذکرہ — اسی مقام پر یہ بھی عرض کردوں کہ یہی صورتِ حال عقیدۂ آخرت و معاد کی ہے۔ محض اختتام دنیا کا قائل ہونا الگ بات ہے۔ بہت سے اہلِ دانش، سائنس داں اس بات کے قائل ہیں، بلکہ داعی ہیں کہ ایک وہ انتہا بھی ہونے والی ہے جب یہ سلسلۂ زمان ختم ہوجائے گا اور یہ بساط مکان الٹ جائے گی، یہ خاک زار غبار ہوکر نابود ہوجائے گا۔ لیکن دین ''نابودیِ محض'' کے تصور کے برخلاف مخصوص حکمتوں، مصلحتوں اور مختلف اوصاف و خصوصیّات کے حامل سروسامان بقا و دوام کے ساتھ آخرت و معاد کا جو عقیدہ پیش کرتا ہے لوگوں کو

اس کے ماننے میں تامل ہے۔ بہر حال یہ بحث دعا کے آئندہ فقروں میں آئے گی۔

صفات باری تعالیٰ کے بیان میں کلامی اور عرفانی تعبیرات مختلف ہیں۔

اور دونوں ہی نقاطِ نظر سے توحیدِ صفات اور توحیدِ افعال دونوں ہی بحثیں بہت وسیع الذیل ہیں۔

توحیدِ صفات یا صفاتِ حضرت اَحدِیّت کے بارے میں بیشتر کلامی مباحث کا بہترین اور مختصر ترین بیان خواجہ نصر الدین محقق طوسیؒ کی تجرید کی عبارتیں ہیں۔

''وجود العالم بعد عدمه ينفی الايجاب''

''عدم کے بعد عالم کا وجود پروردگار کے قادر ومختار ہونے کی دلیل ہے''

''وعمومية العلة تسلزم عمومية الصفة''

''علت کا عام اور تمام ممکنات کو شامل ومحیط ہونا اس کی صفتِ قدرت کی عمومیت وشمولیت کی دلیل ہے۔''

''والاحكام والتجرد واستناد كل شئ اليه دلائل العلم''

''اور اِس کائنات کا استحکام اور ذات باری تعالیٰ کا زمان وزمانیات، مکان ومکانیات سے منزہ ہونا اور ہر شئے کی علت ہونا اس کے علم کی دلیلیں ہیں۔''

''وكل قادر وعالم حيٌ بالضرورة''

''اور ہر قادر وعالم کا ذی حیات ہونا بدیہی ہے۔''

ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں نہایت محکم اور مفصل استدلال چھپے

ہوئے ہیں۔ جن کو مشروحاً بیان کرنے کی نہ یہاں ضرورت ہے نہ گنجائش۔ صرف حوالے کے لیے چند جملے نقل کیے گئے۔ تفاصیل کے طلب گار متعلقہ کتابوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ بہت سادہ طور پر معلوم ہے کہ "صفاتِ ثبوتیہ" یعنی وہ صفتیں جو ذات باری میں پائی جاتی ہیں اور عین ذات ہیں اور زائد بر ذات نہیں ہیں وہ عبارت ہیں قدرت، علم، حیات، ارادہ، تکلم، صِدق اور اس کے قدیم و سرمدی ہونے کے صفات سے!

اور اسی طرح صفات سلبیہ یعنی وہ صفتیں جو ذات باری میں نہیں پائی جاتیں، وہ یہ ہیں کہ پروردگار زمان و مکان کا محتاج نہیں ہے کہ وہ خود زمان و مکان کا خالق ہے۔ وہ مرکب نہیں ہے، وہ جسم نہیں رکھتا، وہ شریک نہیں رکھتا، وہ مثل ونظیر نہیں رکھتا، وہ حلول اور اتحاد سے بری، بلند اور منزہ ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں، اس کی ذات پاک محلِّ حوادث و قابلِ تغیرات نہیں ہے۔ دعا کے آئندہ فقروں میں بعض صفاتِ ثبوتیہ اور بعض صفاتِ سلبیہ پر بطور خاص روشنی ڈالی گئی ہے، اُن فقروں کے ذیل میں بھی کچھ تشریح آئے گی۔

انسانی ادراکات اور معلومات کی اپنی محدودیتیں ہیں۔ انسان کتنی ہی آفاقی، ہمہ گیر و ہمہ جہت نگاہ کیوں نہ پیدا کر لے اُس کے بنائے ہوئے مرقعے ناقص اور ناتمام ہی رہیں گے اور اس کی تعبیریں نارسا ہی رہیں گی۔ وہ بھی خصوصاً جب بات ذات وصفات خداوندی سے متعلق ہو۔ یہی سبب ہے کہ صفات باری تعالیٰ کے بیان میں علمِ کلام کی روش سے علم عرفان کی راہ مختلف اور ممتاز ہے۔ عرفاء